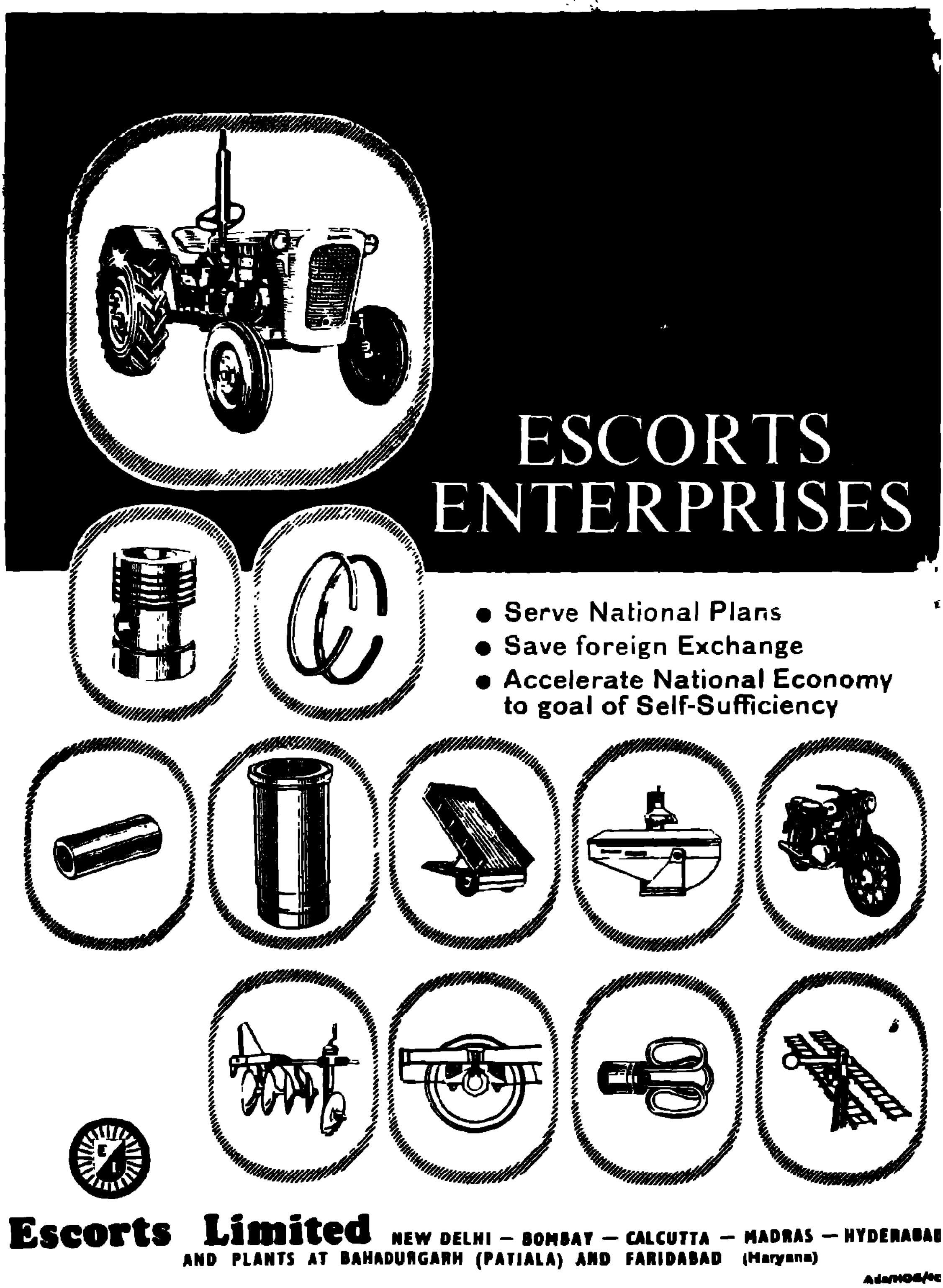


27 JAN 1970


ESCORTS
ENTERPRISES
• Serve National Plans
• Save foreign Exchange
• Accelerate National Economy to goal of Self-Sufficiency
Escorts Limited NEW DELHI — BOMBAY — CALCUTTA — MADRAS — HYDERABAD
AND PLANTS AT BAHADURGARH (PATIALA) AND FARIDABAD (Haryana)

# ہم ایک ہیں



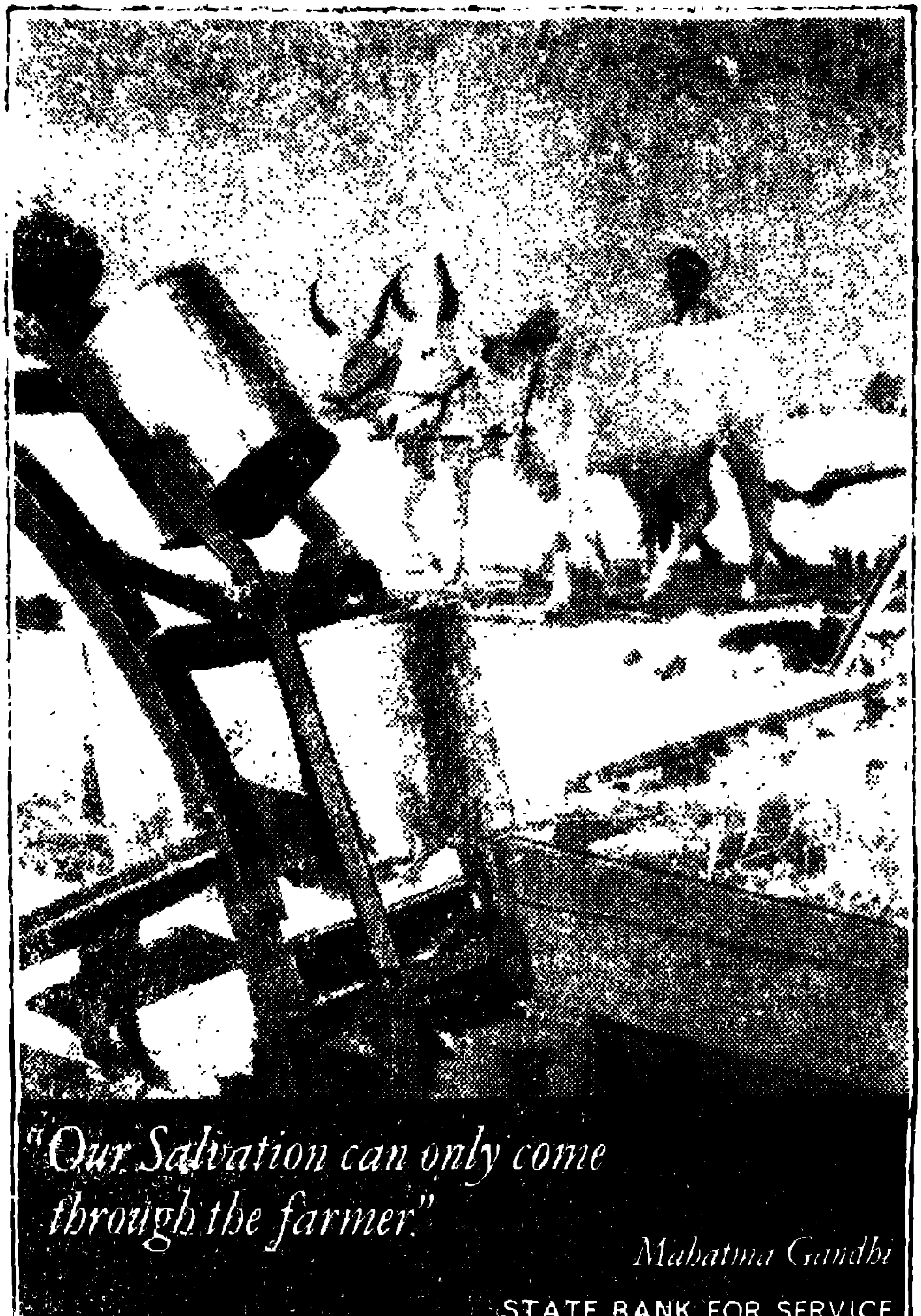


## فرقہ وارانہ اتحاد کا پنچ شیل

(۱) تمام فرقوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہو کر ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کی جائے (۲) کسی شخص پہ اس کی مرضی کے خلاف گلال نہ پھینکا جائے (۳) مسجد کے سامنے باجا بجاتے وقت اشتعال انگیز حرکات سے پرہیز کیا جائے (۴) مورتی یا تعزیہ کو نقصان پہنچانے کے فعل کو بدترین جرم قرار دیا جائے (۵) مقدس سمجھے جانے والے جانوروں کو ایذا نہ پہنچائی جائے۔

ڈائرکٹر آف پبلسٹی گورنمنٹ آف مہاراشٹر بمبئی ۳۲


THE BOMBAY MERCANTILE CO-OPERATIVE BANK LTD.
ENCOURAGES YOU IN RAISING YOUR STANDARD OF LIVING AND HELPS IN ACQUIRING ON CONVENIENT TERMS THE FOLLOWING
DOMESTIC ARTICLES
ACQUIRE ON EASY TERMS
WASHING MACHINES
STEEL CUPBOARDS
REFRIGERATORS
CEILING FANS
RADIOS
SEWING MACHINES
WINDOW TYPE AIR CONDITIONERS
TABLE FANS
ALL KINDS OF BANKING BUSINESS TRANSACTED
K. B. MOHAMEDALLY ALLABUX
CHAIRMAN
ZAIN G. RANGOONWALA
MANAGING DIRECTOR


"Our Salvation can only come
through the farmer."
Mahatma Gandhi
STATE BANK FOR SERVICE

# گاندھی جی

نے ریل کے ڈبوں میں صفائی کے اصولوں کو برتا۔
خصوصاً ڈبوں میں تھوکنے اور گندگی پھیلانے
کی طرف اشارہ کیا۔

•

انھوں نے ریلوے کے قوانین کی خلاف ورزی کو
ناپسندیدہ قرار دیا۔ جیسے خطرے کی گھنٹی کو بغیر
کسی اہم وجہ کے کھینچنا۔

عبادتی تقریر
دہلی ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء

جاری کردہ:

## ویسٹرن ریلوے

جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بانی
علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۹ء
جلد ۴۰ ـــــ شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲

اردو کا چالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی
ماہنامہ

# شاعر

بمبئی

مدیر اعلیٰ:
اعجاز صدیقی

ادارۂ تحریر:
مہندر ناتھ ☆ ڈاکٹر محمد حسن
شہاب جعفری ☆ ندا فاضلی

# گاندھی نمبر ۱۹۶۹ء

سلام

سالانہ چندہ ۹ روپے — فون: ۳۵۹۹۰۴ — قیمت گاندھی نمبر چار روپے

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ شاعر قصر الادب - بمبئی ۳ بی سی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ "شاعر" - مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ - بمبئی ۳ بی سی

# غالب نمبر

**غالب صدی کا بیش بہا تحفہ**

غالب کی شخصیت، فن اور زندگی پر ہندو پاک کے ممتاز قلم کاروں کے تازہ و فکر انگیز تنقیدی و تحقیقی مضامین:

**شاعر کا عظیم، حسین اور یادگار و پُر وقار**

غالب نمبروں کی بِھیڑ میں ایک نہایت سنجیدہ، معیاری، متنوع اور منفرد خصوصی اشاعت جسے اربابِ نظر نے سب سے بہتر قرار دیا ہے۔

۳۶۸۸۹

**چند خصوصیات:**

'نقد و نگاہ' —— کے دو سو صفحات میں غالب پر ۲۶ تحقیقی، تنقیدی اور علمی و فنّی مضامین۔

'بانداز نو' —— میں نئی نسل کے گیارہ ذہین قلمکاروں کے جدید طرزِ فکر کے مقالات۔

'خراجِ طبعِ رواں' —— میں غالب پر اردو کے مشاہیر شعرا کی ۲۷ تازہ و منتخب نظمیں۔

'کفِ گل فروش' —— میں سات ممتاز خواتین قلمکاروں کے پُرمغز و بہار آفریں مضامین۔

'شوخیٔ تحریر' —— میں غالب پر مشہور طنز و مزاح نگاروں کے سات قہقہہ بار طنز و مزاح پارے۔

'پردۂ ساز' —— میں غالب پر پانچ طویل نئے اور بہترین ڈرامے۔

'ذکر اک سخنور کا' —— میں دہلی اور اندور کے دو بھرپور مذاکرے، جن میں سات ممتاز ادیبوں نے حصہ لیا ہے۔

'نقش ہائے رنگ رنگ' —— کے ۴۸ صفحات میں غالب کے اردو دیوان اور کلیاتِ فارسی کا انتخاب، اعلیٰ سفید کاغذ پر خوبصورت رنگین باڈر کے ساتھ، اور ان آٹھوں ابواب کے سرورق دو رنگ میں، آرٹ کا بہترین نمونہ، تعفیاتِ غالب، غالب بزبانِ دیگراں) اور انتظاریہ کے سادہ ابواب میں کئی بے حد اہم مضامین۔ ان کے علاوہ ۱۹ صفحات میں "غالب کی کہانی" ۶ صفحات پر مشتمل غالب نما اور غالب نمبر کے قلمکاروں کا تعارف۔

☆ چار رنگ کی غالب کی سنہری تصویر، مغل آرٹ کا شہکار، ۱۶ صفحات میں غالب کی مختلف ادوار کی تصویریں، تحریریں، غالب کے شاگردوں کی تصاویر، غالب کی پرانی کتابوں کے سرورقوں کے عکس، ہر صفحہ پر غالب کا اسکیچ۔

☆ آرٹ کارڈ پر ۳ رنگ کا نظر فریب سرورق، بہترین آفسیٹ اور لیتھو کی کتابت و طباعت۔

**۶۳۰ —— صفحات**

**قیمت: صرف آٹھ روپے**

(مع محصول ڈاک و رجسٹری خرچ ایک روپیہ پانچ پیسے)

**—— مینجر ——**

# شاعر

پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۵ بی سی

# ترتیب



## گاندھی درپن

(مضامین)



## پشپانجلی

(نظمیں)

سرورق: غیاث قریشی (اورنگ آباد)

مطبوعہ: یونیورسل فائن آرٹ لیتھو ورکس بمبئی ۲

کتابت: محمد عبدالرحمٰن سلام خوشنویس

## جُرعات

# گاندھی نمبر

میں نے "جُرعات" میں قارئینِ "شاعر" سے کبھی براہِ راست تخاطب نہیں کیا۔ اِدھر چھ ماہ سے وہ سلسلہ بالکل ٹوٹ کر رہ گیا ہے جو "شاعر" اور ذاتی مُراسلت کے ذریعے قارئینِ "شاعر"، دوستوں اور ادبی حلقوں سے قائم رہتا تھا۔ میری انتہائی تکلیف دہ علالت کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک تڑپ تڑپ کر زندگی گذار رہا ہوں۔ لکھنا پڑھنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ میرے مُعالجین کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ نہیں کہہ سکتا کہ انجام کیا ہوگا۔ بہرحال گذشتہ چھ ماہ میں احباب و اعزا، قارئینِ شاعر اور ہندو پاک کے ادبی حلقوں سے پُرخلوص دُعاؤں اور پُرسشوں کا جو گراں قدر تحفہ ملتا رہا ہے اُس کے لئے بصمیمِ قلب سپاس گذار ہوں۔

میری شدید علالت اور طویل مدت تک اسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے باوجود "شاعر" کی اشاعتوں میں کوئی جھول پیدا نہیں ہوا لیکن "گاندھی نمبر" کے عاجلانہ اعلان کے بعد نہایت ناموافق حالات میں اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کارکنانِ "شاعر" کو جن دُشواریوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا، اُنکی تفصیلات اگر بیان کی جائیں تو وہ بیحد تکلیف دہ اور عبرتناک ہوں گی۔ سب سے زیادہ افسوس اِس بات کا ہے کہ نمبر کی اشاعت میں تین ماہ لگ گئے اور قارئینِ شاعر کو انتظار کی زحمت ہوئی۔

"گاندھی نمبر" کی اشاعت کا اعلان ایک قومی فریضہ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ یہ اندازہ نہ تھا کہ قوم گاندھی جی کو اِس حد تک بھول چکی ہے کہ "گاندھی صدی" کی بھی اُس کی نظر میں کوئی اہمیت نہ ہوگی۔ یہ صدی ملک میں برائے نام اور برائے بیت منائی گئی۔ اِس سلسلے میں ہونے کی طرح کتنی تقریبات ہوئیں؟ ملکی زبانوں کے کتنے رسائل و اخبارات نے اپنے نمبر نکالے؟ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے کتنا تعاون کیا؟ حکومت کہتی تو یہ رہتی ہے کہ چھوٹے اخبارات و رسائل کی مدد کرنا اُسکے فرائض میں ہے لیکن عمل اِسکے بالکل برعکس ہے۔ اِس کا تازہ ثبوت یہ ہے کہ "گاندھی نمبر" میں حکومت کے محکمۂ "ایڈورٹائزنگ اینڈ ویجوئیل پبلسٹی" کا کوئی اشتہار نہیں ہے۔ تین ماہ مسلسل اِس محکمے کو ہر طرح توجہ دلائی گئی۔ ریاستی حکومتوں نے بھی کسی گذارش پر دھیان نہیں دیا۔ صنعتی اداروں کو تو جیسے گاندھی صدی سے کوئی تعلق ہی نہیں ا۔ اُنہوں نے "دیوالی نمبروں" میں دل کھول کر اشتہارات دیئے۔

میری اور میرے خاندان کی کم و بیش سو سالہ علمی، ادبی اور قومی خدمات اور "شاعر" کی مسلسل چالیس سالہ اشاعت کا جو صِلہ ملا اور مل رہا، اُسکے متعلق کہنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں مگر سوچتا ہوں کہ فائدہ بھی کیا؟ انصاف اور حقیقت پسندی ہے کہاں؟ ملک میں اِبتک جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ حسّاس دلوں کیلئے بیحد رنج و ملال و ندامت کا باعث ہے۔ گاندھی جی کی تعلیمات کو جسطرح پامال کیا گیا، اُس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ گاندھی جی کے بعض زرّیں اُصولوں کو بروئے کار لائے بغیر ملک و قوم کی نجات ممکن نہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اقلیتی فرقوں، اقلیتی زبانوں اور وطن پرستوں کیلئے گاندھی جی کے اُصولوں پر عمل پیرا ہونا بیحد ضروری ہے۔ فرقہ پرستی کے جو ننگے ناچ آئے دن ہوتے رہتے ہیں، کم از کم اُنہیں روکنے اور ملک کو تباہی سے بچانے کیلئے گاندھی جی کی تعلیمات کو اپنانے ہی میں قوم کی نجات ہے۔ "شاعر" کا گاندھی نمبر اِس سلسلے میں معاون ہوگا۔ اِس کے مطالعے سے خود اصلاحی کے بہت سے راستے سامنے آئیں گے۔

---

زبردست عدمِ تعاون کے باوجود گاندھی نمبر آپ کے سامنے ہے۔ اُردو زبان کیلئے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ گاندھی صدی کے سلسلے میں بھی وہ پیچھے نہیں رہی۔ اِس زبان کے کئی رسائل نے اپنے گاندھی نمبر پیش کئے ہیں۔ "شاعر" کا یہ نمبر جن خصوصیات کا

حامل ہے اُسکا اندازہ بیک نظر لگایا جاسکتا ہے۔ اِس نمبر کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب اپنی جگہ بھرپور ہے۔ اِس نمبر کیلئے تازہ اور اچھے مضامین حاصل کرنے میں بڑی دُشواریاں پیش آئیں۔ بہت سے مشہور و ممتاز قلم کاروں کے دل و دماغ پر ملکی حالات کا اتنا گہرا اور ناگوار اثر ہے کہ اُنہوں نے کچھ لکھنے سے معذوری ظاہر کی۔ ایسے بھی خطوط موصول ہوئے کہ "گاندھی نمبر" نکالنے کے بجائے کوئی "خونیں انقلاب نمبر" نکالیے۔ بہرحال گاندھی نمبر میں کئی بہت اہم مضامین شامل ہیں۔ گاندھی جی کے تعلق سے وہ تمام موضوعات اس نمبر میں سمٹ آئے ہیں جو اُنکی شخصیت، اُنکے کارناموں، اصولوں اور فلسفے وغیرہ کو ملک کے بدلے ہوئے حالات اور دنیا کے مادّی و سائنسی ارتقا کی روشنی میں زیرِ بحث لائے جاسکتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، سینئر ریسرچ آفیسر "گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی" بطورِ خاص شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس نمبر کے سلسلے میں بڑی دلچسپی لی۔ انہوں نے اِس نمبر کے لئے خود بھی لکھا اور اپنے حلقے کے باشعور قلم کاروں سے لکھوایا بھی۔ ادارہ شاعر اُن تمام قلمکاروں کا شکریہ ادا کرتا ہے جو اِس نمبر میں شریک ہیں۔ اُنکے تعاون ہی نے اِس نمبر کو اتنا معیاری اور قابلِ قدر بنایا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ "گاندھی نمبر" میں مقامی قلم کار بڑی تعداد میں شریک ہیں۔ اِس نمبر کو بلا شک و شبہہ صوبۂ مہاراشٹر کی تحریری پیش کش کہا جاسکتا ہے۔

"گاندھی نمبر" کا معنی آفریں سرورق جناب غیاث قریشی (جی۔ ڈی۔ آرٹ) نے اورنگ آباد سے بناکر بھیجا ہے۔ اسکا سفید اور نیلا رنگ جو یو۔ این۔ او" کا بھی رنگ ہے امن اور شانتی کی علامت ہے۔ زیتون کی ڈالی اور دیہات کی عمودی و اُفقی قطاریں اسکے حسن و مقصدیت کو بڑھادیا ہے۔ گاندھی جی کی وہ مختلف تصاویر نہ مل سکیں جنہیں اس نمبر میں دینے کا خیال تھا اس لئے گاندھی جی کی صرف ایک بہت قیمتی رنگین تصویر پیش کی جارہی ہے۔ اس پر زرِ کثیر صرف ہوا ہے۔ "گاندھی نمبر" شاعر کے خاص نمبر کی روایات کے عین مطابق ہے۔ یقیناً اِسے پسند کیا جائے گا اور یہ گاندھی صدی کا ایک یادگار تحفہ قرار دیا جائے گا۔

۱۹ دسمبر ۶۹ء

افتخار امام صدیقی



# پیغامات

راشٹرپتی بھون
نئی دہلی

## شری وی۔ وی۔ گری صدر جمہوریۂ ہند

"گاندھی جی کی پوری زندگی انسانیت کی خدمت کے لئے وقف رہی۔ وہ اپنے کردار اور مونہ عمل سے اپنی نسل کے افکار و خیالات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئے اور دنیا پر یہ خوبی واضح کر دی کہ روحانی صداقت جسمانی تشدد سے کام لینے والی طاقتوں پر فتحیاب ہوتی ہے۔ نفرت کے ماحول میں محبت، انتقام کے ماحول میں عفو و درگذر، بدی کے ماحول میں نیکی اور خطرے کے ماحول میں عزم و استقلال —— یہ تھا اُن کا نصب العین۔
جنم صدی تقریبات کا سال جو منایا جا رہا ہے، اُس میں راشٹر پتا کی یاد کو مستقل بناتے اور باپو کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اُن کے دل و دماغ کے کچھ اعلیٰ اوصاف اپنے اندر پیدا کریں اور صداقت اور عدم تشدد کے اقدار پر جو اُن کے فلسفے کی بنیاد ہے، عمل کریں۔

(وی۔ وی۔ گری)

نئی دہلی
۱۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء

## محترمہ اندرا گاندھی، وزیرِ اعظم ہندوستان

ڈیئر شری صدیقی،
آپ کے خط اور تعاون کا شکریہ۔
میں آپ کی جلد صحت یابی کی خواہش مند ہوں۔ اپنے پرچے کے گاندھی صدی نمبر کے لئے میری نیک خواہشات قبول کیجئے۔

آپ کی مخلص

(اندرا گاندھی)

نئی دہلی۔ ۸ دسمبر ۱۹۶۹ء

## شری آئی۔ کے۔ گجرال۔ وزیر برائے ریاست محکمۂ اطلاعات و نشریات و مواصلات

مجھے اس اطلاع سے مسرت ہوئی کہ قوم کے باپو کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر "شاعر" کا گاندھی نمبر شائع ہو رہا ہے۔
ہماری جنگِ آزادی میں گاندھی جی کا حصہ سونے سے زیادہ وزنی ہے۔ اپنے سچائی اور اہنسا کے انوکھے فن سے وہ صدیوں پرانی غلامی زنجیر کو توڑنے میں کامیاب ہوئے اور ہندوستان کو آزاد جمہوریت اور ترقی کی راہ دکھانے میں مدد کی۔

گاندھی جی جن اصولوں کے لئے یاد کئے جاتے ہیں، اُن سے اپنے قارئین کو روشناس کرانے کی اپنی کوششوں کے لئے میری نیک خواہشات قبول کیجئے۔

[illegible]

(آئی۔ کے۔ گجرال)

حیدرآباد ہاؤس۔ ناگپور

۱۷ر دسمبر ۶۹ء

## شری وی۔ پی۔ نائک۔ چیف منسٹر مہاراشٹر اسٹیٹ

مہاتما گاندھی کی تعلیمات اور اُن کے فلسفۂ زندگی کو عملی جامہ پہنانا ہی اُن کو بہترین خراجِ عقیدت پیش کرنا ہے۔ قومی یکجہتی گاندھی جی کا پیغام تھا اور آج پہلے سے زیادہ اِس قومی یکجہتی کو لانے کی ضرورت ہے۔

مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ ماہنامہ "شاعر" راشٹر پتا گاندھی جی کو خراج پیش کرنے کے لیے خصوصی "گاندھی نمبر" نکال رہا ہے۔ میں خاص نمبر کی کامیابیوں کا متمنی ہوں۔

V. P. Naik

(وی۔ پی۔ نائک)

سیکریٹریٹ بمبئی ۳۲

یکم دسمبر ۱۹۶۹ء

## شری ایم۔ ڈی چودھری۔ وزیرِ تعلیم۔ حکومتِ مہاراشٹر

جیسا کہ گاندھی جی نے متعدد بار کہا تھا کہ اُن کی زندگی بجائے خود ایک بہت قیمتی پیغام ہے۔ اُنکے خیالات میں آج بھی اتنی ہی تازگی اور برجستگی ہے جو خود اُن کے زمانے میں تھی اور ایسا اِسلئے ہے کہ اُنہوں نے جو کچھ بھی سکھایا وہ خود اُنکی زندگی کا ایک حصّہ تھا، ذاتی تجربے تھے اور اُن پر عمل تھا۔ اِسلئے بہتر یہی ہے کہ گاندھی جی کے خیالات کو موجودہ نسل میں زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے اور اِس سلسلے میں آپ کے مشہور پرچے کے مخصوص گاندھی نمبر کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔ میں آپ کی کامیابی کا خواہش مند ہوں۔

[illegible]

(ایم۔ ڈی۔ چودھری)

سیکریٹریٹ۔ بمبئی ۳۲

۴ر نومبر ۱۹۶۹ء

## شری بی۔ ایم۔ یاگنک۔ وزیر برائے نشہ بندی حکومتِ مہاراشٹر

مجھے اِس اطلاع سے مسرت ہوئی کہ گاندھی صدی کے موقع پر "شاعر" کا گاندھی نمبر شائع ہو رہا ہے۔ خاص نمبر کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات بھیجتے ہوئے میں اُمید کرتا ہوں کہ ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں گاندھی جی کے اُصولوں کو اپنائیں گے۔

[illegible]

(بی۔ ایم۔ یاگنک)



# گاندھی درپن

# مہاتما گاندھی کی زندگی کے اہم واقعات

۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء — موہن داس کرم چند گاندھی کاٹھیاواڑ میں پوربندر کے مقام پر پیدا ہوئے۔

۱۸۷۶ء — راجکوٹ کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔

۱۸۸۳ء — کستوربا سے ۱۳ سال کی عمر میں شادی۔

ستمبر ۱۸۸۸ء — بحری جہاز سے انگلینڈ کیلئے روانہ ہوئے۔

۱۰ جون ۱۸۹۱ء — بار کے رکن بنائے گئے۔

۱۲ جون ۱۸۹۱ء — بحری جہاز سے بھارت کیلئے روانگی۔

۱۸۹۱ء — وکالت شروع کی اور قانونی مسودہ نویس کی حیثیت سے راجکوٹ میں پریکٹس اختیار کی۔

اپریل ۱۸۹۳ء — قانونی کام کیلئے جنوبی افریقہ کے لئے روانہ ہوئے۔

مئی۔ جون ۱۸۹۳ء — نسلی امتیاز کا شکار ہوتے اور جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا۔

۲۲ اگست ۱۸۹۴ء — نٹال انڈین کانگریس کی بنیاد ڈالی۔

ستمبر ۱۸۹۴ء — نٹال کی سپریم کورٹ میں بحیثیت ایڈوکیٹ اندراج۔

۱۸۹۵ء — جنوبی افریقہ میں ہر انگریز کے نام ایک اپیل جاری کی۔

جنوری ۱۸۹۶ء — بھارت واپس آئے اور جنوبی افریقہ میں رہنے والے بھارتیوں کی طرف سے ایجی ٹیشن شروع کیا۔

۱۸۹۸-۹۹ء — جنوبی افریقہ میں بھارتیوں کے تجارتی حقوق پر عائد پابندیوں کے خلاف [illegible]

۱۹۰۰ء — [illegible] انڈین ایمبولینس کور قائم کی۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۰۱ء — بھارت کیلئے بحری جہاز سے روانہ ہوئے۔

۲۰ جنوری تا یکم فروری ۱۹۰۲ء — رنگون کا دورہ کیا۔

جولائی ۱۹۰۲ء — بمبئی منتقل ہو گئے اور وہیں پر وکالت شروع کی۔

نومبر ۱۹۰۲ء — ٹرانسوال میں مرتب کئے گئے ایشیائی عوام کے خلاف قانونی مسودے پر بھارتی کاز کی حمایت کے لئے جنوبی افریقہ بلائے گئے۔

۱۹۰۳ء — ٹرانسوال برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔

جون ۱۹۰۳ء — اخبار "انڈین اوپینین" کا [illegible]

۱۹۰۴ء — ڈربن کے قریب معاہدہ فینکس [illegible]

۱۹۰۵ء — تقسیم بنگال کی مخالفت کی اور [illegible] سے بائیکاٹ کی حمایت کی۔ ٹرانسوال میں مقیم [illegible] کے مسائل سے متعلق برطانوی [illegible] تک وفد کی قیادت کی۔

۱۲ مئی ۱۹۰۶ء — بھارت کیلئے ہوم رول کی [illegible]

جون جولائی ۱۹۰۶ء — زولو کی بغاوت میں [illegible] بھارتیوں کی ٹکڑی قائم کی [illegible] عہد کیا۔

اکتوبر۔ نومبر ۱۹۰۶ء — [illegible]

[illegible]

ملاقات کے لئے طلب کیا گیا اور ایک معاہدے پر
پہنچنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔

اگست ۱۹۰۸ء بھارت میں برطانوی حکومت کو ختم
کرانے کے لئے تشدد کو نقصان دہ اور بے فائدہ قرار دیا۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۰۸ گرفتار ہوئے اور دو مہینے کی سخت
سزا پائی۔

۱۲ دسمبر ۱۹۰۸ [illegible] جیل سے رہا کر دیئے گئے

۳۰ جنوری ۱۹۰۹ حیدرآباد کے آخری مہینے کے لئے کھادی
عوام کو تیار کرنے کے لئے اخبارات میں مضامین لکھے۔

۲ مئی ۱۹۰۹ء پریٹوریا سنٹرل جیل میں منتقل کر دیئے گئے

۲۴ مئی ۱۹۰۹ء پریٹوریا سنٹرل جیل سے رہائی۔

[illegible] ۱۹۱۰ "انڈین ہوم رول" پر ٹالسٹائی کی رائے
جاننے کے لئے اس کی ایک کاپی ٹالسٹائی کو ارسال کی۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۱۲ گوکھلے کے ہمراہ جنوبی افریقہ کا سفر کیا
اور بدیشی لباس ترک کیا۔

۱۱ اپریل ۱۹۱۳ ماتا کستوربا نے پرامن مزاحمت کی
تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

اکتوبر ۱۹۱۳ نیوکیسل کا دورہ کیا اور تین پونڈ ٹیکس
[illegible] تک متاثرہ مزدوروں کو کام بند کر دینے
کی تلقین کی۔

۶ نومبر ۱۹۱۳ء ٹرانسوال کو عظیم مارچ کی قیادت کی
[illegible] فورڈ کے مقام پر گرفتار کر لئے گئے۔

[illegible] جنوری [illegible] سے ملاقات کی اور تجاویز پیش کیں۔

[illegible] ۱۹۱۴ [illegible] معاہدہ ہو جانے پر ستیہ گرہ
[illegible] کر دیا گیا۔ [illegible] پر رہنے والوں کی اخلاقی تعلیم
کے لئے [illegible] رکھا۔

[illegible] اور ایمبولینس سروس کے
[illegible] میڈل عطا کیا گیا۔

[illegible] احمد آباد میں ستیہ گرہ آشرم قائم کیا۔
[illegible] آشرم [illegible] سے موسوم ہوا۔

جنوری۔ مارچ احمد آباد کے ٹیکسٹائل مزدوروں کے کاز
۱۹۱۸ء کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ [illegible] معاہدے
کے لئے برت رکھا۔

۲۸ فروری ۱۹۱۹ رولٹ بل کو واپس لینے کے لئے ستیہ گرہ
کے حلف نامے پر دستخط کئے۔

۶ اپریل ۱۹۱۹ آل انڈیا ستیہ گرہ تحریک کا افتتاح کیا۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ امرتسر میں سانحہ جلیانوالہ ظہور پذیر ہوا۔

ستمبر ۱۹۱۹ گجراتی ماہنامے "نوجیون" کے مدیر کے فرائض
سنبھالے۔

اکتوبر ۱۹۱۹ء انگریزی کے ہفتہ وار اخبار "ینگ انڈیا"
کی ادارت سنبھالی اور پنجاب میں ہونے والی سرکاری زیادتیوں
کی تحقیقات کے لئے قائم کردہ غیر سرکاری کمیٹی میں
شمولیت اختیار کی۔

۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء دلی میں منعقدہ آل انڈیا خلافت کانفرنس
کی صدارت کی۔

دسمبر ۱۹۱۹ امرتسر میں کانگریس کی جانب سے مونٹیگو
چیمسفورڈ اصلاحات کو منظور کرنے کا مشورہ دیا۔

اگست ۱۹۲۰ء الیسرائے کے نام خط لکھا جس میں
قیصر ہند میڈل، زولو وار میڈل اور بوئر وار میڈل
واپس کر دیئے۔

نومبر ۱۹۲۰ء احمد آباد میں گجرات ودیا پیٹھ قائم کیا۔

دسمبر ۱۹۲۰ء ناگپور کانگریس اجلاس نے موصوف
کی وہ قرارداد منظور کر لی [illegible] کانگریس
کا مقصد [illegible] سے بھارتی
[illegible]

اگست ۱۹۲۱ء بدیشی کپڑے [illegible]
کی قیادت کی اور بمبئی میں بدیشی کپڑے [illegible]

فروری ۱۹۲۲ء [illegible] گجرات) میں ستیہ گرہ کی
مہم شروع کرنے [illegible] وائسرائے کو نوٹس دیا۔

[illegible] ۱۹۲۲ء [illegible]

سابرمتی سے گرفتار کیے گئے بعد ۱۸ مارچ کو چھ سال کی سزا سنائی گئی۔

ستمبر ۱۹۲۴ء ہندو مسلم اتحاد کے لئے ۲۱ دن کا برت شروع کیا۔

ستمبر ۱۹۲۵ء آل انڈیا اسپنرز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔

۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء ڈانڈی مارچ شروع کیا۔

۵ مئی ۱۹۳۰ء گرفتار کیے گئے اور بغیر مقدمہ چلائے سزا دی گئی۔ پورے بھارت میں ہڑتال۔

۲۹ اگست ۱۹۳۱ء۔ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگرس کے یک رکنی وفد کی حیثیت سے بحری جہاز سے انگلینڈ روانہ ہوئے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء فرقہ وارانہ ایوارڈ کے تحت ہریجنوں کے لئے علیحدہ رائے دہندگی کے خاتمے کے لئے جیل میں مرن برت شروع کیا۔

۱۱ فروری ۱۹۳۳ء۔ ہفتہ وار اخبار ہریجن جاری کیا جو ہندی اور انگریزی میں شائع ہوا۔

۸ مئی ۱۹۳۳ء۔ اپنی آتما کی شدھی کے لئے ۲۱ دن کا برت شروع کیا۔ نو بجے شب غیر مشروط طور پر رہا کر دیئے گئے۔

۲۶ جولائی ۱۹۳۳ء۔ سابرمتی کا ستیہ گرہ آشرم بند کر دیا گیا۔

۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء۔ واردھا کے قریبی گاؤں سیوا گرام میں اقامت اختیار کی۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء واردھا میں منعقدہ تعلیمی کانفرنس کی صدارت کی اور بنیادی دستکاریوں کے ذریعے تعلیم کی اسکیم کا خاکہ پیش کیا۔

۸ اگست ۱۹۴۲ء۔ برطانوی حکومت سے بھارت چھوڑنے کی اپیل کی۔

۹ اگست ۱۹۴۲ء۔ گرفتار کئے گئے اور پونا کے آغا خاں میں نظر بند کر دیئے گئے۔

۲۲ فروری ۱۹۴۴ء۔ آغا خاں محل میں کستوربا گاندھی کا سورگباش۔

جنوری اور فروری ۱۹۴۶ء: چھوت چھات کے خلاف اور



ہندوستانی کے پرچار کے لئے جنوبی بھارت کا دورہ کیا۔

۷ و ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء۔ شملہ تشریف لائے، شملہ کانفرنس کا اجلاس ہوا اور گفت و شنید ناکام رہی۔

۲۷ اگست ۱۹۴۶ء۔ گاندھی جی نے بذریعہ تار برطانوی حکومت کو سانحۂ بنگال کے اعادے کے خلاف متنبہ کیا۔ اس سلسلے میں ولول کو بھی خط لکھا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۴۶ء۔ کلکتہ کو روانگی۔ بہار میں فسادات۔

۶ نومبر ۱۹۴۶ء۔ نواکھالی کے لئے روانہ ہوئے۔

یکم و ۲ اپریل ۱۹۴۷ء۔ دلی میں منعقدہ ایشیائی تعلقات سے متعلق کانفرنس سے گاندھی جی نے خطاب کیا۔

۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء۔ فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے کے لئے جناح کے ساتھ مشترکہ اپیل جاری کی۔

یکم مئی ۱۹۴۷ء۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اصولی طور پر تقسیم ہند کو منظور کر لیا۔

۶ جون ۱۹۴۷ء۔ گاندھی جی نے ماونٹ بیٹن کو خط لکھا کہ وہ کانگریس سے تمام تصفیہ طلب امور کو دوستانہ طور پر طے کرنے کے لئے مسٹر جناح کو رضامند کریں۔

۱۲ جون ۱۹۴۷ء کانگریس ورکنگ کمیٹی سے خطاب کیا۔

۲۷ جولائی ۱۹۴۷ء شہزادوں سے اپیل کی کہ وہ عوام کو اقتدار اعلیٰ کا حق دیں۔

۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء بھارت اور پاکستان کے درمیان دوستانہ سمجھوتے پر زور دیا۔

۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے کے لئے دلی میں برت رکھنے کا فیصلہ کیا۔

۱۸ جنوری ۱۹۴۸ء امن کمیٹی نے قرارداد پر دستخط کئے، امن قائم رکھنے سے متعلق ایک حلف نامہ گاندھی جی کو پیش کیا جس پر گاندھی جی نے برت ختم کر دیا۔

۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء پرارتھنا سبھا میں بم کا دھماکہ۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء شام کی پرارتھنا سبھا میں جاتے ہوئے شہید کر دیئے گئے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری



# گاندھی جی اور ہندوستانی مسلمان

## چند سوالوں کے جواب

گاندھی جی کی زندگی کی معمولی سے معمولی تفصیل بھی راز میں نہیں ہے اور اُن پر اتنا کہا اور لکھا گیا ہے کہ مزید گنجائش نہیں رہی۔ تاہم اُن کا بھرپور اور بے لاگ جائزہ لینے کی اکثر کوششیں یک طرفہ ہوگئی ہیں۔ حالانکہ گاندھی جی بذاتِ خود یک طرفہ نہیں، بلکہ ہندوستانی سماج کے مندر کی ایک ایسی مورتی تھے، جیسی مورتی انسانی ہاتھوں نے ابھی تک نہیں تراشی ہے۔

گاندھی جی کی جیسی تاریخی شخصیتوں کا جائزہ لینے کے لئے لازم ہے کہ تینوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا جائے:

(۱) جو خیالات اُنہوں نے تحریر یا تقریر میں ظاہر کیے۔

(۲) جو کچھ اُن کے عمل کے نتیجے میں سامنے آئے؛

(۳) اُن کے بارے میں دوسروں نے جو کچھ کہا یا لکھا۔

پھر دُوسروں کی بھی ۳ قسمیں ہیں: (ا) مدّاح اور جاں نثار (ب) صاحبِ نظر نکتہ بیں (ج) مخالفین۔

اب ہمارے سامنے لکھنے اور بیان کرنے والوں کی تینوں صفیں موجود ہیں اور ہمارا کام جتنا مشکل تھا، اُسی قدر آسان ہوگیا ہے۔

پٹابھی سیتا رمیّہ (جنہیں گاندھی جی نے کانگرس ڈیلی گیٹوں کی اکثریت کی رائے دبا کر سبھاش بوس کے مقابلے میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کا صدر چنوایا تھا) مہادیو دیسائی اور پیارے لال (جو سائے کی طرح ساتھ رہے۔) اور بابو راجندر پرشاد (جو گاندھی جی کو واقعی مہاتما سے کم نہیں سمجھتے تھے اور اُن کے ہر ایک اشارے کو فیصلہ حکم جانتے تھے۔

نکتہ چینوں میں بھی گاندھی جی کی عظمت ماننے والے اور مدّاح شامل ہیں۔ مثلاً ابوالکلام آزاد، رابندر ناتھ ٹیگور، ڈی جی تنڈولکر (مستند سوانح Mahatma کے مصنّف)، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، پولاک، بریلسفورڈ، پتھک لارنس اور ہڈسن (تازہ ترین کتاب The great devide کے مصنف)۔ جواہر لال نہرو اور لوئی فشر بہ یک وقت مدّاح اور نکتہ چیں ہیں۔

مخالفانہ اور بے رحمانہ تنقید کرنے والوں میں اوّل نام بزرگ سیاست داں، ممبر پارلیمنٹ اِندولال یاگنک کا آنا چاہیئے، جو ۱۹۳۱ء تک کم و بیش پندرہ سال گاندھی جی کے دم قدم کے ساتھ تھے۔ (ان کی کتاب Gandhi As I Know him ہمارے سامنے موجود ہے اور گاندھی شناسی میں بے مثل قدر و قیمت رکھتی ہے) ایس کے

مترجم ادا ( گاندھی جناح کے مصنف ) کیمونسٹ دانش ور ھیرن مکرجی، رجنی پام دت، سبھاش بوس اور جناح کے سوانح نگار ایم۔ ایچ سیّد وغیرہ۔ گاندھی جی کو " باپو " یعنی پوپ ( پوپ اور باپو کے لفظ اور معنی ایک ہی ہیں ) یا خلیفہ کے مقام پر خدا کا سایہ یا اَوتار، نجات دہندہ اور " مہاتما " مان لینے سے کام آسان ہوجاتا ہے۔ نہ ماننے کے بعد تلاش کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہر زمانے میں، وہم شناس سیاست داں گاندھی جی کی باتیں سُن کر چکرا تے ہیں اور تہہ تک پہنچنے میں ہچکچاتے ہیں۔

## گاندھی جی کے یہاں لفظ و معنی کا فاصلہ بہت تھا

جواھرلال نہرو ۱۹۲۹ء سے پہلے اپنے والد بزرگوار کی سیاسی لائن سے بالکل مختلف سمت میں جارہے تھے۔ انہوں نے بنگال اور مہاراشٹر کے نوجوانوں خصوصاً سبھاس بوس اور دوسرے اشتراکی ہم خیالوں سے مل کر گاندھی جی کی " دو رُخی سیاست " کے خلاف کانگرس کے اندر محاذ بنایا تھا۔ گاندھی جی نے جواہرلال کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنا نام صدارت سے واپس لے کر نوجوان نہرو کو ہنگامہ خیز اجلاس لاہور (۱۹۲۹ء) کی کُرسیٔ صدارت پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد سے اُن کو اپنا وارث یا کانگرس کا رہنمائے اعظم مقرر کرنے کی لگاتار کوشش کرتے رہے۔ آخر بنا کر چھوڑا۔ جواہرلال نے ایک بار سے زیادہ ( سوانح اور ہندوستان کی دریافت میں ) لکھا ہے کہ گاندھی جی کا مطلب سمجھنے میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ عجیب اُلٹ پھیر کرتے ہیں۔ میری زبان اُن سے بالکل مختلف ہے۔ گاندھی جی نے ایک بار جواب میں کہا " ہاں ابھی تو میری زبان سمجھنے میں اِس شہزادے کو مشکل ہوتی ہے۔ جب میں دنیا سے اُٹھ جاؤں گا تو یہ جواہر ـــ جو واقعی جواہر پارہ ہے ـــ میری ہی زبان بولا کرے گا " ( واردھا ۱۹۴۲ء ) ۔ ہری پورہ اور ترپی پورہ کانگرس کے اجلاس کے موقعوں پر سبھاش چندر بوس اپنا ماتھا پیٹتے تھے اور گاندھی جی کو A Paradox اور Impossible man کہا کرتے تھے۔ بوس نے ایک خط میں ( جو مرحوم کی کتاب میں شامل ہے ) یہاں تک اپنی پریشانی ظاہر کی ہے گویا آدمی سے نہیں کسی گتھی یا معمّے سے واسطہ ہو۔ ایک بار جب ( ۱۹۴۰ء میں ) گاندھی جی وائسرائے لارڈ لنلتھگو سے ملنے گئے اور جنگ عظیم پر انگریزوں کی پالیسی کیا ہونی چاہیئے، یہ مشورہ دے کر نکلے تو وائسرائے چکراتے ہوئے دم بخود کھڑے رہے۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ حسبِ معمول معزز مہمان کو رخصت کرنے کے لئے ADC کو بلوا کر گاڑی تک پہنچانا ہے۔ گاندھی جی ٹہلتے ہوئے باہر آگئے اور وائسرائے نے ناگواری یا بدحواسی کے مارے اُنہیں رخصت تک نہ کیا۔

زمانۂ جنگ کے وائسرائے لارڈ ویول کا بیان ہے کہ گاندھی جی آئے، آدھے گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ اب تک میں نہیں سمجھا کہ اُن کا مطلب کیا تھا۔ ایک ایک جملے سے کم از کم دو دو معنی تو ضرور نکلتے ہیں اور اگلی ملاقات جس روز ہونی تھی، پریشانی کے مارے رات بھر میری آنکھ نہیں لگی ( کہ دیکھئے اب کے کیا کہتے ہیں ) ۔

سر اسٹیفورڈ کرپس بڑے جہاں دیدہ سیاستداں تھے۔ انگریزوں نے اُنہیں نازک وقت میں رُوس کے لئے سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ گاندھی جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتے تھے۔ ۴۲ء کے بعد جب دوبارہ وزارتی مشن میں گفت و شنید کرنے آئے تو اُنہوں نے یاد دلایا کہ پچھلی ملاقات میں ہم جہاں تک پہنچے تھے اُس کی رُوداد تو آپ کے پاس ہوگی ہی؟ گاندھی جی نے کہا، ہاں غذائی تجربوں پر اور سبزی خوری کے متعلق آپ سے جو بات ہوئی تھی وہ مجھے یاد ہے۔ وہ عجب مخمصے میں پڑ گیا کہ یہاں ایک قوم کی غلامی اور آزادی کا سوال درپیش ہے اور انہیں اس ماحصل ہی سے انکار ہے جو ہفتوں کی

دیدہ ریزی اور بحث کے بعد سامنے آیا تھا۔
وزارتی مشن کی گفتگو کانگرس اور لیگ کے رہنماؤں سے جاری تھی۔ اس دوران کئی ایسے واقعے پیش آئے۔ مولانا نے سوال کیا کہ اگر آج آپ ہندوستان کو مکمل آزادی دینے سے انکار کر دیں تو کیا اندازہ ہے کتنے سال تک آپ اس ملک میں اپنا مفاد قائم رکھ سکتے ہیں۔ ویسا ہی کھرا جواب ملا۔ ۲۰، ۲۵ سال۔ مولانا نے جواب دیا۔ ہم یہ ضمانت دے سکتے ہیں کہ ہندوستان مکمل آزادی کے بعد بھی اتنے سال کامن ویلتھ میں رہ کر یا کسی اور طریقے سے برطانوی مفاد کو نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔
مشن کے لوگ ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے اور کرپس نے کہا: اتنے برسوں سے بات چیت چل رہی ہے آج تک گاندھی جی نے اتنی صاف بات نہیں کہی۔
ہڈسن کا بیان ہے کہ لارڈ ویول سے جب گاندھی جی ملے تو انہوں نے کہا: اچھا مسلم لیگ وزارتی مشن کا پلان قبول کرتی ہے لیکن صوبوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں جو پیراگراف ہے اس کا مطلب ہم وہ نکالیں گے جو ہم سمجھتے ہیں کہ مشن کے ذہن میں رہا ہوگا۔ وائسرائے نے سادگی اور شرافت کا واسطہ دیا اور کہا مجھے لفظوں کے قانونی الٹ پھیر میں مت الجھائیے، میں سپاہی آدمی ہوں۔ کہہ دیجئے کہ آپ وہی مطلب مان لیں گے جو پلان کے مصنفوں نے ٹھہرایا ہے۔ گاندھی جی کہہ چکے تھے کہ میں دستور ساز اسمبلی میں جانے کو بھی ایک تعمیری ستیہ گرہ سمجھتا ہوں چنانچہ وائسرائے کے محل میں بھی ستیہ گرہی کی شان قائم رکھ کر نکل آئے۔ یہ گتھی ایسی الجھی کہ چھڑائے نہ چھٹ سکی۔
لارڈ ماؤنٹ بیٹن جنہوں نے چند ہفتوں کے اندر ہندوستان کی آزادی کا فیصلہ منوا لیا، اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ گاندھی جی سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ آپ کس بات کو قبول کریں کب انکار کر دیں مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کو مرکزی حکومت سونپ دیجئے اور اب اقلیت کی نہیں بلکہ اکثریت کے حق کی حفاظت کیجئے۔ غالباً منشا یہ ہے کہ مسلم لیگ اقلیت کی نمائندہ بن کر پورے ملک کی حکومت نہیں چلا سکے گی اسلئے ہر پھیر کر کانگرس ہی کو راضی کرنا پڑے گا۔ لفظ و معنی کا یہ فاصلہ بھی تھا جس نے مسلم لیڈر شپ کو رفتہ رفتہ ان سے بدظن کر دیا۔ مسٹر جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو پہلی دوسری ملاقات میں جتا دیا تھا کہ آپ کو جو بات منوانی ہو وہ نہرو اور پٹیل سے منوائیے۔ گاندھی جی کے ماننے نہ ماننے سے کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ کہہ دیں گے کہ میں کانگرس کا نمائندہ نہیں ہوں ورکنگ کمیٹی نہیں مانتی، میں کیا کروں؟ البتہ میں پوری مسلم لیگ کی طرف سے اقرار یا انکار کر سکتا ہوں اور جو کہوں گا، اس پر قائم رہوں گا۔

## اُن کی عظمت کا جھنڈا گاڑنے میں مسلمانوں کا ہاتھ بھی تھا

گاندھی جی نے اپنی عمر کے پچاس سال سیاسی اور سماجی ہنگاموں میں بسر کئے اور ہندوستان میں ان کی فیصلہ کن حیثیت کا زمانہ ستمبر ۱۹۱۹ء سے اگست ۱۹۴۲ء تک شمار کرنا چاہیے۔ اسی زمانے کے تجربوں میں اُن کے عروج و زوال کی پوری داستان پوشیدہ ہے۔
گاندھی جی، جو خود کو تلک کا شاگرد اور گوکھلے کا عقیدتمند کہتے تھے کسطرح ہندوستانی سیاست کے منظر پر نمودار ہوتے ہی تلک اور گوکھلے دونوں سے زیادہ مقناطیسی شخصیت بن گئے۔ اس کا راز جاننے کے لئے جنگ عظیم سے ذرا پہلے اور فوراً بعد ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی حالت اور سیاسی شعور کو ضرور پرکھ لینا چاہیئے۔

اٹھارویں (۱۸) صدی ختم ہوتے ہوتے ہندوستان کے مختلف حصوں، قبیلوں اور نسلوں کے مسلمان سیاسی اقتدار کھو چکے تھے۔ ۱۹ویں صدی کے وسط تک جب انگریزی اقتدار کے مرکزوں میں ایک معاشی خوش حالی شروع ہوئی اور پارسی گجراتی، بنگالی متوسط طبقہ اس میں شریک ہوئے تب صرف چند شہروں کو چھوڑ کر شمالی ہند میں مسلمانوں کا متوسط طبقہ نئے انتظام سے بے دخل ہو چکا تھا اور اس کی معاشی اور تمدنی حالت بھی خستہ ہو چلی تھی لیکن ۱۹ویں صدی کے خاتمے پر اداسی کم ہوئی تو نئے تعلیمی اور تمدنی مرکزوں میں دستکاری پیشہ مسلمانوں میں بے چینی اور تعلیم یافتہ تجارت پیشہ مسلمانوں میں نئی معاشی سرگرمیوں میں شریک ہونے کی امنگ جاگ اٹھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۸۷ – ۹۲ء میں جو کانگریس کے سالانہ اجلاس مدراس، الہ آباد اور لکھنؤ میں ہوئے ان میں مسلمان ڈیلی گیٹوں کی تعداد برابر بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ آبادی کا چوتھائی کا حصہ ہوتے ہوئے بھی ایک تہائی سے زیادہ ڈیلی گیٹ بھیجنے لگے تھے۔ اپنے برادرانِ وطن کی طرح شہری تعلیم یافتہ اور خوشحال طبقے سے آتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریزی سیاست کو نئے بنگالی ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کی سیاسی بیداری سے کچھ پریشانی شروع ہوئی تو انہیں زک دیتے اور پچھڑے ہوئے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے اس نے بنگال تقسیم کر دیا۔ اب یہ راز عالم آشکارا ہو چکا ہے کہ وائسرائے لارڈ منٹو کے اشارے ہی پر چند سرمایہ دار اور تعلقہ دار مسلمانوں کا ایک وفد شملہ میں وائسرائے سے ملا، فرقہ وارانہ انتخاب کا مطالبہ کیا جس کے ذریعے آبادی کے تناسب سے گورنمنٹ اور کونسلوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ہو سکے، انکی پسماندگی کا علاج کیا جا سکے اور تبھی نواب ڈھاکہ کی صدارت میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی (۱۹۰۵–۰۶)

تباہ حال مسلمان کسانوں، دستکاروں، پرانے قسم کے تعلیم یافتہ مگر بے روزگار جوشیلے جوانوں اور مقروض زمینداروں کی سماجی اور سیاسی بے چینی پچھلے سو برس میں کئی بار مذہبی تحریکوں کی صورت میں ابھر چکی تھی اور عام مسلمانوں کے پاس اب یہی ایک ڈھال تھی جسے وہ برطانوی اقتدار کے خلاف اپنی عظمتِ دیرینہ کی یاد میں اٹھائے ہوئے تھے اور جس کے پیچھے ان کے طبقاتی مفادوں کا اختلاف چھپ جایا کرتا تھا۔

ہز ہائی نس آغا خان یا گوپال کرشن گوکھلے یا بپن چند رپال یا سری نواس شاستری کی اعتدال پسندی عام مسلمانوں کے دل و دماغ سے اپیل نہیں کر سکتی تھی۔ تلک کی جنگ جوئی میں سخت ہندو مذہبیت بھی شامل رہی اسلئے وہ بھی اس میدان کے شہسوار نہ بن سکے۔ سی آر داس کی نظر اس معاملے کی تہہ کو پہنچی اور انہوں نے آگے چل کر یہاں تک اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کا مسئلہ بڑی حد تک معاشی ہے۔ ان کو جب تک آبادی کے تناسب سے ملازمتیں نہ مل جائیں سرکاری تقرریوں میں ساٹھ فیصدی اور میونسپل کارپوریشن میں اسّی فیصدی جگہیں دی جائیں۔ (یہی اعلان سبھاش چندر بوس نے بھی جب وہ کارپوریشن کے چیف ایکزی کیوٹیو کونسلر ہوئے کیا تھا) اس طرح مسلم درمیانی طبقے کو صاحب اقتدار انگریز اور ترقی یافتہ ہندو کے سامنے اپنے حق اور حیثیت کا احساس ہوا اور اس احساس کو سراہا گیا۔

تاریخ میں پہلی بار اقلیت اکثریت کے احساس، شکایت اور مطالبے کا جو یہ دور ہندوستانی مسلم سیاست میں آیا، اس کی بدولت چمڑے کپڑے، لوہے اور جہاز سازی کی نئی صنعتوں میں دیکھتے دیکھتے ساحلی علاقوں کے تجارت پیشہ مسلمان حاوی ہونے لگے۔ شہری جائدادیں بھی ان کے پاس زیادہ تھیں، پہلی جنگِ عظیم ان کی سیاسی بے چینی اور معاشی امنگ کے ساتھ ایک ولولہ بھی لائی تھی۔

جنگِ عظیم ختم ہوتے ہوتے مسلمانانِ ہند کی پرانی ڈھال پر ایک ضرب پڑی۔ ترکی سلطنت کے شکست کھانے سے

عرب مقدس مقامات پر خلافت کی اجارہ داری ٹوٹ گئی اور پرانی چال کے اینٹی برٹش رہنماؤں نے جو خطرے کا بگل بجایا، اُس پر نئے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان بھی دوڑ رے۔ ہندوستان کے بے بس مسلمان اس فاتح برطانوی سلطنت پر کیسے دباؤ ڈال سکتے ہیں؟ ابھی یہ مسئلہ درپیش تھا کہ گاندھی جی خلافت کانفرنس کے اسٹیج پر نظر آئے۔ اُن کی اپنی مذہبی اصطلاحوں میں قدیم صوفیا کی گونج تھی۔ لباس، عادات، وضع قطع میں اصحاب صفّہ کی سی سادگی، تقریروں میں خدائے واحد، آیات قرآنی اور سیرت النبی کے حوالے۔ خلافت کی تائید کو انہوں نے ہندوستان کی اندرونی آزادی اور گئو رکشا سے کچھ اس طرح جوڑا کہ جو سیاسی رہنما اس داؤ پیچ سے نفرت کرتے تھے دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اب ان کے ایک طرف مولانا ابوالکلام تھے، دوسری طرف آکسفورڈ کے گریجویٹ، انگریزی اخبار کے ایڈیٹر مولانا محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں جیسے جوشیلے اور آتش نشاں رہنماؤں نے تو گاندھی جی کو غیبی امداد سمجھا اور سر آنکھوں پر اٹھالیا۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء کے درمیان کا زمانہ، جب گاندھی جی کو چھ سال کی سزا ہوئی (مگر وہ دو سال بعد رہا کر دئے گئے) ان کی سیاسی فتوحات اور تاریخ ہند کا شاندار باب ہے اور قوم کی طرح کچھ عجب نہیں کہ گاندھی جی بھی ۱۹۲۱ء کے ایک سال میں "سوراج" لانے کا یقین رکھتے ہوں۔

## گاندھی جی کی پسپائی میں مسلمانوں کی بدحالی

۱۸۵۷ء میں جو ابال اُبلا تھا وہ اب بدلے ہوئے حالات میں پھر ابال پر آیا تھا۔ گاندھی جی اُسے خاص درجۂ حرارت پر لے جا کر روک لینا چاہتے تھے۔ لیکن یہاں اُن سے اندازے کی غلطی ہوئی۔ ممکن ہے وہ اسے آئندہ کی تیاری سمجھتے ہوں، تاہم تحریک آزادی کی دشمن طاقت نے اس کا فائدہ اُٹھایا۔ مسلمان قوم پرست "باغیوں" کو سزائیں دینے میں بھی حکومت ہند نے کچھ زیادہ شدت برتی۔ فوج اور نوکریوں کے بائیکاٹ کے جن الفاظ پر دکراچی کانفرنس، علی برادران کو لمبی سزائیں دی گئیں۔ ان کے بار بار دُہرانے پر بھی گاندھی جی کو کسی نے نہیں چھوا۔ انگریز جانتا تھا کہ عام مسلمانوں کا جوش و خروش کسی بھی سیاسی تحریک کو بغاوت کا رنگ دینے میں کامیاب ہو جائے گا اس لئے ایک طرف تو "وفاداران سرکار" کو تھپک کر بڑھاوا دیا جائے اور باغیانہ ذہن کو شدت سے کچلا جائے۔ دوسری طرف ہندو متوسط طبقے کو چونکا دیا جائے کہ مسلمانوں کے حوصلے بڑھا کر تمہیں اُلٹا نقصان ہوگا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے کئی شہروں میں بلوے ہو گئے (ان میں کم از کم تین سہارن پور، ملتان اور کوہاٹ کے پیچھے مقامی انگریز افسروں کا اشارہ بھی تھا۔)

بلوؤں سے پہلے ہی بعض تنگ نظر قوم پرست رہنماؤں کو اندیشہ تھا کہ عام مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی لہر پھیلا کر گاندھی جی نے غلطی کی ہے۔ اب وہ حق طلب کریں گے اور نہ ملنے پر اپنے امن پسند ہندو ہمسایوں سے ٹکرا جائینگے۔ جب ملبار سے کوہاٹ تک فساد ہو چکے تو سوامی شردھانند اور مدن موہن مالویہ نے ہندو اتحاد اور شدھی سنگھٹن کے لئے پکارا۔ راستے یہاں سے بٹ گئے۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا، اُدھر خلافت تحریک کا اصل اُصول ہی ختم ہو گیا۔ مسلمانوں میں بددلی پھیلی اور قومی اتحاد کا وہ قلعہ (خلافت، گئو رکھشا اور پنجاب سے انصاف کی گارنٹی) جس کی دیواریں ریت پر کھڑی تھیں اور جس کے دمدموں پر گاندھی جی نے "ہندو، مسلم سکھ اتحاد" کا جھنڈا لہرا کر توپیں چڑھا دی تھیں۔ اپنی جگہ سے توپوں سمیت سرک گیا۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء کے آخر تک جو چار نہایت ہنگامی سال گذرے ہیں، گاندھی جی نے ان میں دو بار بے رحمانہ پسپائی اختیار کی۔ اِس پسپائی میں اُن کے پاس چرخہ، اہنسا، سودیشی، گرام سُدھار اور اچھوت اُدھار کا تعمیری پروگرام

تھا اور کوئی شک نہیں کہ ملک کے اعتدال پسند سیاسی کارکنوں کو وہ تسلی دے سکے لیکن وہ عام جوشیلے بے اعتدال اور سیاسی حیثیت سے بے تربیت مسلمان جو اُنکے تخت کا سب سے مضبوط پایہ بنے تھے، رفتہ رفتہ بیٹھتے گئے۔ ۱۹۲۱ء کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۸ء میں پھر گاندھی جی نے (نہرو رپورٹ ہاتھ میں لیکر) خطاب کیا کہ اگر اس متحدہ مطالبے کی بنا پر ایک سال کے اندر پورن سوراج نہ ملا تو سال پورا ہوتے ہی ہم مکمل آزادی کے لئے اُٹھیں گے اور حاصل کر لیں گے۔ مسلمانوں کے کئی قومی رہنماؤں کے بددل ہوجانے کے باوجود بہتوں نے گاندھی جی کے اس اعلان پر کمر ہمت کسی اور ۳۱-۱۹۳۰ء تک کے سیاسی قیدیوں کی تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک لاکھ میں تیس ہزار مسلمان تھے۔ سرکاری رپورٹیں گواہ ہیں کہ سرکاری اسکولوں، کالجوں کے بائیکاٹ کرنے، جلسے جلوس میں لاٹھیاں گولیاں کھانے اور سرکاری نوکریاں چھوڑنے میں بھی مسلمانوں کے نچلے متوسط طبقے نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا لیکن تعمیری پروگرام کی اینٹ مسالہ گاندھی جی کی قدامت پسند یا جدید شہری تہذیب سے فرار کی پالیسی نے مہیا کیا تھا، اسمیں یا تو ان پر اندھ وشواس رکھنے والے آسکتے تھے یا گھر سے کنجوسی اور کم خرچی کی عادت لئے ہوئے دکاندار کے تعلیم یافتہ سپوت یا دیہات سے ابھرے ہوئے نوجوان۔ شہری ماحول میں پلے ہوئے، قالوں اور پلیٹوں میں دسترخوان پر چنا ہوا کھانا کھانیوالے درمیانی طبقے کے مسلمانوں کیلئے اِس سادھوانہ تہذیب کے چوکھٹے میں سمانا مشکل تھا۔ وہ کنارے ہوتے چلے گئے۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان سطح کے نیچے ایک اور زبردست لہر بھی زمین کاٹ گئی اور یہ تھی تجارت پیشہ، صنعتی اُمنگ رکھنے والے شہری مسلمانوں کا نئے بینکنگ، اسٹاک ایکسچنج اور مالیاتی سرمایے کے مقابلے میں پسپا ہوجانا۔ ۳۲-۱۹۲۹ء کی جان لیوا کساد بازاری کے دنوں میں اِدھر متوسط درجے کے زمینداروں (خاص کر مسلمانوں) کی قرقیاں عام ہوئیں۔ شہری ساہوکاروں نے رجوصدیوں سے ولیش یا بنیے ہی چلے آرہے تھے) ان کی شہری جائدادیں نیلام کرائیں، اراضی خریدی۔ کاریگر اور چھوٹے دکاندار روٹیوں کے محتاج ہوگئے اور سرمائے کے ذخیرے سے نئے مل اور کارخانے (مثلاً آٹا مل، شکر مل، چمڑے اور کپڑے کے کارخانے) سر اُٹھانے لگے۔ کانپور اور احمد آباد نئے سودیشی مل مالکوں کی طاقت کا مرکز بن کر ابھرے۔ سیٹھ چھوٹانی اور عمر سوبانی جیسے گاندھی جی کے جاں نثار مسلم سرمایہ دار رفتہ رفتہ دیوالہ نکالنے پر مجبور ہوگئے۔

ایک باقاعدہ پروپیگنڈا مہم پورے ملک میں چلی کہ گاندھی جی عام مسلمانوں کو صرف اتنی دور تک لیجانا چاہتے ہیں جہاں سے انگریزوں پر دباؤ ڈال کر ملکی سرمایہ داروں کو بڑھاوا دے سکیں۔ شہروں کے نئے تعلیم یافتہ، ملازمت پیشہ اور چھوٹے کاروباری مسلمان گاندھی جی کی اِس "دورنگی" سے نہ صرف شبہہ میں پڑ گئے بلکہ دور ہٹ گئے۔

گاندھی جی نے جب ۳ سال کے اندر ایک کروڑ روپیہ اور ایک لاکھ والنیٹر جمع کرنیکا نعرہ بلند کیا (۱۹۲۱ء) تو اُس کی پشت پر کسی مذہبی نعرے کی ضرورت نہ رہ گئی تھی۔ ابتک گاندھی واد محض ایک طرح کا ہندو مذہبی ہالہ پیدا کر چکا تھا۔ نئے صنعتی مرکزوں خاص کر احمد آباد اور بمبئی کے نو دولتیے بانیہ ہندو کاروباری اور صنعتی حلقوں نے جی بھر کر چندہ دیا اور والنیٹروں کے خرچ بھی اُٹھائے۔

اس طرح عام مسلمانوں نے دیکھا کہ ان کی روٹی روزگار، تجارت وصنعت یا سماجی تنظیم کی بیل کا اِس پرانے برگد کے سائے میں پنپنا مشکل ہے۔ عین اُسی طرح گاندھی وادیوں نے بھی محسوس کیا کہ مسلمان جس شدت کے ساتھ مذہبی نعروں کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور جس تیزی سے اشتعال کا شکار ہوجاتے ہیں، ان کا سیدھے سادے اور دیرپا سماج سدھار کے کام میں شریک ہونا اور ٹکنا مشکل ہے۔

نمک ستیہ گرہ (۱۹۳۱ء) ختم ہوتے ہوتے گاندھی جی کی "انقلابی سیاہی" سے صرف انہی تعصباتی مسلمانوں کو آس رہ گئی تھی جو انگریزوں کی لائی ہوئی تہذیب اور اُن کے سیاسی اقتدار کو ایک ہی سکّے کے دو رُخ سمجھنے کی غلط فہمی میں گاندھی جی کی طرح مُبتلا تھے۔ امپیریلزم اور مغربی تمدن دونوں سے یکساں متنفر تھے اور قومی آزادی کی سیاسی تحریک میں اسلام کے اُن اصولوں کی بقا دیکھتے تھے جن اصولوں سے نئے ایران اور ترکی نے دست برداری کر لی تھی۔ ان مسلمانوں کی بیشتر تعداد کو نہ سرکاری نوکریوں سے رغبت تھی، نہ امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار سے اور نہ کونسلوں میں جا کر حقوق طلبی سے۔ کبھی مشروط، کبھی غیر مشروط۔ یہی مسلمان گاندھی جی کے ہر ایک انقلابی نعرے پر ساتھ دیتے اور سمجھوتے کی ہر گفتگو اور پسپائی (یا ایک قدم آگے ایک قدم پیچھے کی پالیسی) پر اُس وقت تک پُر اُمید رہے جب تک مہاتما جی نے بے دلی سے اپنے ہر ایک جوئے کی شکست مان کر ہندوستان کا بٹوارہ (اور قوم پرست مسلمانوں کا بلیدان) قبول نہ کر لیا۔ (۱۹۴۷ء)۔

## "نہ وہ مکمل سیاستداں تھے نہ بے لوچ سادھو"

یہ جملہ ہیرن مکرجی (ایم پی) نے اُن کی عدم تشدد پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے جب انہیں اپنا رہنما بنایا تو بمبئی کی ایک بڑی مسجد ... اور مسز سروجنی نائیڈو کو تقریر کرانے لے گئے۔ دلی میں تو خاص جامع مسجد میں سوامی شردھانند سے تقریر کرائی گئی تھی۔ وہ اِس سیاست داں میں ایک ایسا البیلا سادھو دیکھتے تھے جو ہندوستان کے سارے مذاہب کے نزدیک قابلِ احترام رہا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک دنیاوی دانشمندی اور روحانی پاکیزگی کا یہ نمونہ سیکڑوں سال سے غیبی طاقتوں کا مالک اور بادشاہوں سے ٹکرا جانے والی شخصیت چلا آ رہا تھا لیکن ہر ایک سیاسی ہلّے پر یہ نظر آنے لگا کہ وہ خدا رسیدہ روحانی آدمی کا اُصول قربان کر کے بنیئے کے سے مول بھاؤ کی گنجائش رکھ لیتے ہیں اور منہ مانگی مراد نہ ملنے پر گھٹنے ٹیک کر معاملہ کر لیتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں ایک پٹھان مزدور میر عالم نے اسی کارن غصے کے مارے اُن پر خونی حملہ کیا تھا۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک پتھی قوم کے سیاستداں کیلئے سادھو ہونا کوئی تماشہ نہیں بلکہ ایک سہارا تھا اور وہ ہر ایک بے بسی پر اپنے "اندر کی آواز" کو غیبی اشارہ سمجھتے تھے۔ آگے بڑھتے وقت وہ سیاستداں کی زبان بولتے تھے اور پیچھے ہٹتے وقت سادھو کی اشاراتی اور الوہی تسلیاں دیا کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو یقین تھا کہ چرخے اور سودیشی اور عدم ادائیگی ٹیکس (جس کا ابتدائی خیال بہت پہلے امریکی مفکر تھورو اور روسی ادیب ٹالسٹائی دے چکے تھے) کی ہمہ گیر تحریک سے وہ بچھڑے ہوئے ہندوستانی دیہات میں امنگ پیدا کر سکیں گے اور یہی اُمنگ بالآخر ملک کی تقدیر کا فیصلہ کرے گی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تحریک اُن اُجڑے دیہاتوں تک بھی پہنچی جن تک کبھی ڈاک نہ پہنچی تھی۔ ملک نے سیاسی بیداری کا طویل سفر چار پانچ سال میں طے کر لیا لیکن اُن کی سیاسی رہنمائی بھگوان کرشن یا رام کے اوتار کے روپ میں چھپ گئی۔ وہ پوجے جانے لگے اور سیاسی پلیٹ فارم پر مخالفت اور اختلاف کو جو اظہار کا حق ہونا چاہیے اور ہوتا ہے وہ اس پرستش کے تلے ملیا میٹ ہو گیا۔ بالآخر گاندھی واد ایک سماجی اصلاحی پروگرام بن کر رہ گیا۔

## "میرا دل چیر کر دیکھو تو ہندو مسلم اتحاد بھرا ہوا پاؤ گے۔"

یہ جملہ گاندھی جی نے ۱۹۳۸ء میں پٹھانوں کے علاقے کا دورہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ انہوں نے

اپنی عملی زندگی جنوبی افریقہ کے ایک مسلمان سیٹھ عبداللہ کی وکالت ۱۸۹۴ء سے شروع کی اور ہندوستانی مسلمانوں کے مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے (۱۹۴۸ء) اپنے پران تج دیے۔

انہوں نے ایک بار سے زیادہ کہا اور لکھا کہ ہندو دھرم مجھے اپنی جان سے زیادہ پیارا ہے۔ قرآن کی تعلیمات بھی عزیز تھیں یہاں تک کہ اپنی پرارتھنا میں گیتا، قرآن اور انجیل کی تلاوت لازم قرار دیدی۔ ایکبار مسلمان بچوں کو پڑھانے کے لئے اور دوسری بار مولانا شبلی کی سیرت النبی کا مطالعہ کرنے کے لئے انہوں نے جیل ہی میں اردو لکھنا پڑھنا سیکھا۔ وہ شروع کی اکثر تقریروں میں کہا کرتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر مجھے سوراج یا آزادی بھی قبول نہیں۔ وہ اپنے برت کو پیغمبروں کے روزے کی تقلید بتاتے تھے۔ اور تو اور انہوں نے مولانا محمد علی کی بیٹی گلستار کو (اس کی شادی سے پہلے) اپنا وارث مقرر کر دیا تھا۔ سابرمتی آشرم اور بعد میں سیوا گرام آشرم میں آئے ہوئے مسلمانوں کا وہ خاص طور سے خیال رکھتے تھے۔ مسلمان بچوں یا طالب علموں کو ہمیشہ مشورہ دیتے تھے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ کیا کرو اور اپنے مذہب پر قائم رہو۔ تواضع اور انکساری کے مارے انہوں نے دیہاتی مسلمانوں کے آگے تھال لگائے اور بھوجن بھی پروسا۔ حکیم اجمل خاں کی جوتیاں تک سیدھی کیں۔ یہ اُن پر اور وہ ان پر جان چھڑکتے تھے اور اس میں کہیں بھی ریاکاری یا وقتی مصلحت کا شائبہ نہ تھا۔ اُن کے نظریے میں اسلام کیا، سبھی مذاہب کی اخلاقی خوبیوں کے لئے جگہ تھی۔ وہ ایک آدرش (وادی) کی طرح دل سے چاہتے تھے کہ ساری ہندوستانی جنتا کو نہیں تو کم از کم سرفروشوں کی ایک بڑی جماعت کو ان ساری خوبیوں سے لیس کر دیں اور سچا "ستیاگرہی" بنا دیں، لیکن جو شرطیں انہوں نے ستیاگرہی سانچے میں ڈھالنے کی رکھی تھیں ان میں صرف اخلاقی نہیں بلکہ روزمرہ کی عادات پر بھی لاگو ہوتی تھیں، مثلاً چرخہ کاتنا، گوشت سے پرہیز کرنا، مرد وزن کے تعلقات سے "پاک" رہنا (بعد میں اس شرط پر زور نہیں دیتے تھے) عبدالغفار خاں، منظر علی سوختہ جیسے چند سیدھے سادے کرداروں کو چھوڑ کر شہری تربیت یافتہ مسلمانوں نے یہاں تک کہ ڈاکٹر سید محمود اور ابوالکلام آزاد پر یہ شرطیں بار گذرتی تھیں۔ چنانچہ نہ صرف ان کے آشرم بلکہ تعمیری پروگرام بھی تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ایک سماجی اصلاح کا صیغہ بنتے چلے گئے اور برہمو سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، پرارتھنا سماج اور آریہ سماج کی طرح گاندھی سماج بھی ایک ایسا حلقہ بن گیا جہاں کچھ آدرشوں کی خاطر زندگی بسر کرنیوالوں کے لئے روٹی روزگار کا یا کم از کم قیام وطعام کا سہارا موجود تھا۔

چرخا چلانے اور ہاتھ کا کاتا کپڑا پھیلانے کی مہم پر گاندھی جی نے دس سال میں ایک کروڑ سے زیادہ روپیہ خرچ کیا، لیکن گاڑھا تیار کرنے والے لاکھوں مسلمان بنکروں کو اس سے کوئی فیض نہ پہنچا (کیونکہ اس کا شمار کھدر میں نہ تھا)۔ دیسی صنعتوں کی سرپرستی نے ان لاکھوں مسلمان کاریگروں کا بھلا نہ کیا جو صدیوں سے پرانے شہری پیشوں میں لگے ہوئے تھے اور اب اپنے اوزار بیچ بیچ کر احمد آباد، کان پور، فیروز آباد، ٹاٹا نگر، بمبئی اور کلکتہ کی بھاری صنعتوں میں اُمڈے چلے آرہے تھے کیونکہ اُن کی نفیس کاریگری پر دیہات کے کھردرے پن کی دیسی چھاپ نہ تھی۔ غریب دیہاتی آبادی کے لئے تو اُن کے پاس ایک پروگرام تھا بھی، شہری پرولتاریہ کے لئے وہ بھی نہ تھا۔ شہروں کے دبنگ مسلمان مزدور بہت جلد ان سے بے نیاز ہو گئے (کیونکہ نئے اُبھرتے ہوئے بے رحم مل مالکوں کو گاندھی جی نے مزدوروں اور صنعتوں کا متولی یا ٹرسٹی قرار دے کر طبقاتی مسئلے کو اپنے دائرۂ عمل سے خارج کر دیا تھا) اور سودیشی کے گاندھیائی موڑ نے بڑے تاجروں اور مل مالکوں کے ایک ایسے گروہ کو بڑھاوا دیا جو بدیسی مال کی بجائے

کرنے والے حلقوں کو (جن میں مسلمان دکاندار بھی تھے) بے دخل کر کے سرمایے کی گردش پر قابض ہوتا جا رہا تھا اور جس میں گجراتی، جینی، مارواڑی سیٹھ باز خاص کر نمایاں تھے۔

تفصیلات کی چھان بین سے ایک عجیب و غریب نتیجہ نکلتا ہے کہ گاندھی جی کی سیاسی جدّوجہد کی بار بار ناکامیوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور علاقوں کو اُن سے اتنا برگشتہ نہیں کیا جتنا پسپائی اور پھر تعمیری پروگراموں کی حد بندیوں نے جن میں اگرچہ دینی مذہبی اصلاحی شان تھی ــــ لیکن قدیم ہندو تہذیبی اثرات کے رنگ میں رنگی ہوئی اور جس سے مسلمانوں کے معاشی اور سماجی مسائل کا کوئی میل نہیں ہوتا تھا۔

گاندھی جی کے دل میں جو ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ بھرا ہوا تھا جب وہ پہلی دوسری بار مجاہدانہ انداز سے سامنے آیا تو جس پتھر کو چھوا پارس بنا دیا۔ علیگڑھ کی مسلم یونیورسٹی کیسی کیسی آرزوؤں سے بنی تھی لیکن بائیکاٹ کے اعلان کا اثر جتنا اُس پر ہوا اُتنا نہ آشوتوش مکرجی کی کلکتہ یونیورسٹی پر ہوا نہ مالوی جی کی بنارس یونیورسٹی پر ــــ دہلی، لکھنؤ اور بمبئی کی شاندار ہڑتالوں اور جلوسوں میں بھی مسلمان ہی آگے رہتے تھے۔ نان کو آپریشن کے ہنگامی زمانے میں شہروں کے مسلمان وردیاں پہن کر پریڈ کرتے ہوئے نکلتے اور دکانوں پر پہرہ دیتے۔ لیکن یہ سیاسی ہیجان ایک رُوپ تھا، اصلیت نہ تھی۔ اسکے پس پردہ معاشی اور سماجی اصلیت کو گاندھی جی نے نظر انداز کیا تو رُوپ بھی اُن کے منتر کے اثر سے نکل گیا۔

جب بلوے ہو چکے اور گاندھی جی کے ۲۱ روزہ برت کے بعد اتحاد و اتفاق کے عہد و پیمان ہو لیئے تو ایک اور ہی اصلیت جو پہلے سے روشن تھی گاندھی جی کی زبان قلم پر آئی: "ہندو بزدل ہوتا ہے اور مسلمان غنڈہ" (۱۹۲۴ء) گاندھی جی کا تعمیری پروگرام اور انہساتمک عمل خاموشی سے مصیبت کا مقابلہ کیئے جانے کی تعلیم "بزدل" کو دلیر بنا سکتی تھی، "غنڈے" کو نہیں سدھا سکی۔ مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی، شوکت علی، محمد علی جناح، ظفر علی خاں اور حسرت موہانی کانگرس میں مسلمانانِ ہند کے مختلف حلقوں اور علاقوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ پرانے خیال کے آزادی پسند مولویوں کے علاوہ سبھی تو دس سال کے اندر گاندھی جی کی کانگرس سے کترا کر نکل گئے اور جب گاندھی جی نے برطانوی حکومت کو ہندو مسلم نفاق سے اور کئی قدم آگے جا کر ہندو اچھوت نفاق پھیلانے پر آمادہ دیکھا تو وہ بلبلا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اچھوت تو ہندو دھرم کی شرن میں ہیں میں اپنی جان دیدوں گا، ہندو دھرم کی یہ توہین برداشت نہیں کروں گا۔ جس شدّت سے انہوں نے اچھوتوں کو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ساتھ مخلوط انتخاب میں کھینچنے کی کوشش کی اور اسکے ہر جانے میں جو حقوق انکو دینے پر آمادہ ہو گئے، وہ انہوں نے کبھی سات کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو دلوانا گوارا نہ کیئے تھے بلکہ ۱۹۳۲ء کے بعد تو وہ صاف طور سے کہنے لگے تھے کہ پہلے میں ہندوؤں کو ساتھ لے لوں، رہا ہندو مسلم مسئلہ، اقلیت اکثریت کے حقوق کا سوال تو وہ انگریز کے اقتدار تک ہے، اُس کے بعد خود بخود دُور ہو جائے گا۔

گاندھی جی نے سستے نسخے سے جو اکسیر تیار کی تھی، مسلم لیگ نے اُسی کو آزمایا اور گاندھی جی کے ہر قدم پر ٹوکا کہ انکی دھمکیاں انگریزوں سے براہ راست معاملہ کرنے کیلئے ہوتی ہیں تاکہ اقتدار سے مسلمانانِ ہند کو محروم رکھا جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء سے تقسیم ہند کے وقت تک شہروں کا مسلم درمیانی طبقہ جسے سرکاری نوکریوں، عہدوں، کاروباری لائسنسوں کی فکر تھی گاندھی واد کو برطانوی سیاست سے بھی زیادہ خطرناک سمجھنے لگا تھا۔ یہی طبقہ تھا جس کے درد کا مداوا گاندھی جی کے نسخے میں نہ تھا، لیکن جیسے وہ شدّت کے ساتھ بیس برس پہلے استعمال کر چکے تھے۔ تب اگر مکمل آزادی کے لئے فیصلہ کن جنگ لڑلی گئی ہوتی (ظاہر ہے کہ وہ تشدد سے پاک نہ ہوتی) تو ملک کا اور ہندوستانی مسلمانوں کا کچھ اور ہی رول ہوتا۔ آخر ۴۲ء میں جاپان کی فتح قریب دیکھ کر بھی گاندھی جی نے تشدد کے امکان کو گوارا کیا۔ ۴۲ء کی تحریک کی ناکامی نے گاندھی جی کا دور تمام کیا اور مسلم لیگ کا حوصلہ بڑھا دیا۔ ▲

ڈاکٹر شرت کمار جین



# گاندھی جی کے اُصولِ فکر کا معاشی پہلو

گاندھی جی کے اصولِ فکر کے معاشی پہلو کی وضاحت سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم اُن کے معاشی فلسفے کو بخوبی سمجھیں۔ گاندھی جی بنیادی طور پر ماہرِ علم معاشیات نہیں بلکہ ایک مفکر تھے، اس لیے انہوں نے معاشی مسائل پر اصولی طور سے کہیں بھی ترتیب وار خیالات کو پیش نہیں کیا ہے۔ صداقت۔ عدم تشدد اور اخلاق پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں جہاں بھی معاشی مسئلے درپیش آئے وہاں انہوں نے اُن کے حل کی راہیں کھولیں۔

سکھ کیسے ہو؟ عام انسان کے اِس سوال کا جواب پانے کے لئے ہی نوعِ انسان اُسی دن سے محوِ عمل ہے جس دن سے اُس نے علم کا پھل چکھا اور جنت سے نکالا گیا۔ اِس دنیا میں آکر اُس میں لامحدود نفسانی خواہشات پیدا ہوئیں اور اپنی نامکمل خواہشات کی وجہ سے اُسے محض ایک ہی چیز نصیب ہوئی اور وہ غیر آسودگی ہے غیر آسودگی کو مٹا کر ہی سکھ کا حصول ممکن ہے۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لئے مختلف راستے ہو سکتے ہیں جن میں دو بہت اہم ہیں۔ پہلا تو یہ کہ انسان اپنی خواہشوں ہی کو محدود کرے تاکہ اُسے نامکمل خواہش سے پیدا ہوئی غیر آسودگی اور دُکھ نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ زیادہ سے زیادہ خواہشوں کی تکمیل کر کے قناعت اور سکھ کی مقدار بڑھائی جائے۔

مغربی فلسفے پر منطبق علمِ معاشیات اِس دوسرے طریقے کا آئینہ دار ہے مگر ہندوستانی زراعتی روایت نے پہلے طریقہ ہی کو سب سے اچھا تسلیم کیا ہے۔ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کے ساتھ اس روایت کا میل دیدنی ہے۔ مہاتما بُدھ نے خواہشات سے معرّیٰ ہونے ہی کو راہِ نجات بتایا ہے۔ لیکن گاندھی جی کے معاشی افکار کا ایک نمائندہ لفظ ایثار (Non-Possession) اور اُن کے معاشی اُصول (Economic Programme) کی علامت "چرخہ" ہے۔

ایثار یا صبر و قناعت کی تشریح کرتے ہوئے وہ ۳ ستمبر ۱۹۲۵ء کے "Young India" میں کہتے ہیں کہ "ہمیں یہ سوچنا نہیں چاہیئے کہ ہم وہ سب لے لیں جو ہم پا سکتے ہیں۔ ہمیں اُن چیزوں کے لینے سے انکار کر دینا چاہیئے جنہیں سبھی نہیں پا سکتے۔"

اُن کے معاشی افکار عدم تشدد کے اصول ہی کی وسیع شکلیں ہیں۔ معاشی زندگی میں جبر و تشدد اور ذخیرہ اندوزی کو وہ عدم تشدد مانتے تھے۔ جب کہ ایثار یا صبر و قناعت کے بغیر جبر و تشدد کی بیخ کنی ممکن نہیں۔ یہ بات مدلّل ہے

کہ اگر سبھی لوگ اپنے صرف consumption کی مقدار میں اپنی خواہش کے مطابق اضافہ کرنا چاہیں اور Con-sumption کی اشیاء محدود ہوں تو آپسی تنازعہ اور تشدد کا رونما ہونا عین ممکن ہے۔ ایسی حالت جب کسی ملک کے سماج کے درمیان پیدا ہوتی ہے تو معاشرے کے متفرق طبقوں میں تنازعہ کی مستقل فضا پیدا ہو جاتی ہے مارکس نے اس طرح کے تنازعہ کو class-struggle کا نام دیا ہے۔ یہ تنازعہ جب بین الاقوامی معاشرے میں پیدا ہوتا ہے تو ایک جنگِ عظیم کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ گاندھی جی ایسی خوفناک حالتوں کا ازالہ تنازعہ کے وسیلے سے نہیں بلکہ تنازعہ کے وجوہ کی بیخ کنی سے کرنا پسند کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ Classless Society کی تمنا class-struggle کے ذریعے نہ کر کے class کو مٹا کر کرتے ہیں۔ اس طرح جب یہ تنازعہ ختم ہو جائے گا تو داخلی امن کے قیام کے تحت نہ تو راجیہ کی ضرورت لاحق ہوگی اور نہ بین الاقوامی جنگ ہی رونما ہوگی۔ تب سارن دنیا میں ایک غیر ریاستی اور غیر طبقاتی معاشرے کی تعمیر ممکن ہو سکتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تکمیل سے انسان سکھ اور قناعت کی مقدار کبھی نہیں بڑھے گی بلکہ خواہشوں پر قابو پانے ہی سے یہ ممکن ہو سکے گا۔ مختصر یہ کہ نجات اور تکمیل میں جو فرق ہے وہی گاندھی جی کے معاشی فلسفے اور مغرب کے معاشی فلسفے میں ہے۔

یہاں نجات کا مطلب سنیاس سے نہیں بلکہ سرگرمیٔ عمل سے ہے۔ گاندھی جی گیتا کو اپنی ماں کہتے تھے۔ گیتا[1] کے دوسرے باب کا ۴۷ واں اشلوک کہتا ہے کہ "اگرچہ نتیجۂ عمل میں بھروسہ نہیں رکھنا ہے پھر بھی عمل سے علیحدگی یا بیزاری بھی نہیں دکھانی ہے۔ عموماً یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اگر Consumption کی مقدار کم سے کم کر دی جائے تو ہم لوگوں میں زیادہ کام کرنے اور زیادہ پیداوار بڑھانے کا حوصلہ نہیں رہ جائے گا اور معاشرہ کارکنندگان سے عاری ہو جائے گا"

لیکن گاندھی جی کے معاشی فلسفے میں کام کرنے کا محرک خود کام ہی ہے۔ گاندھی جی مانتے تھے کہ عمل اپنے آپ میں اپنا نتیجہ ہے۔ مقصد اور ذرائع کے متعلق اُن کا خیال یہاں اِس کی توضیح کرتا ہے۔ وہ مقصد کو ذرائع سے علاحدہ نہیں مانتے تھے ــــــ ذرائع ہی ایک زمانے میں مقصد بن جاتے ہیں اور وہ مقاصد ہی دوبارہ نئے مقاصد کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لہٰذا عمل کرنا اپنے آپ میں ایک رُوحانی احتیاج ہے۔ اِس کے لئے علیحدہ محرک کی ضرورت اُنہیں قابلِ قبول نہیں معلوم ہوئی۔

ذریعہ کے پاکیزہ ہونے سے مقصد بھی پاکیزہ ہو اس لئے مقصد اور ذریعہ میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ وہ منوسمرتی[1] کے اِس جملے کے حامی تھے کہ "جو معاشی نظریے سے پاکیزہ ہے وہی دراصل پاکیزہ ہے۔" Non Possession کی کمی میں جبر و تشدد کا آغاز ہوتا ہے۔ دولت کے مالکانہ حق پر مستقبل کے Consumption کا انحصار ہے۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ صداقت کی تلاش کرنے والا اور محبت کا رہرو کل کے لئے کچھ ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا۔ بھگوان بھی کل کے لئے کچھ نہیں جوڑتا۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بناتا جو اس لمحے کے لئے ضروری ہو۔ اگر ہم خالقِ مطلق کے انتظام پر یقین رکھتے ہیں تو ہمیں یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ وقت پر ہماری ضرورتوں کی تکمیل

---

[1] کتاب کا نام

کرے گا، اس لئے ذخیرہ اندوزی کی پالیسی یقیناً احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے معاشرے میں پھیلی ہوئی غربت اور غیر مساوات کی جڑ ہماری یہی پالیسی مضمر ہے۔ گاندھی جی کے مطابق امیروں کو دھن سے منہ موڑنے کی طرف پہل کرنی چاہیئے۔ گاندھی جی کو یقین تھا کہ Non - Possession کی پالیسی پر چلنے والے لوگ پرندوں کی مانند بغیر پوشاک اور مکان کے گذر اوقات کر سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی مانتے تھے کہ اس نصب العین تک ہماری رسائی ناممکن ہے۔ تاہم ہمیں حتی الامکان اس کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ذخیرہ اندوز اشخاص خدمتِ خلق کی جانب مائل نہیں ہو سکتے۔ اس سے واضح ہے کہ Non- Possession کو وہ احکامِ خداوندی مانتے تھے اور اسی کے وسیلے سے معاشی توازن کے بغیر پُرامن معاشرے کا قیام کرنا چاہتے تھے۔

گاندھی جی کے معاشی فلسفے کی مخالفت کا ایک سبب معاشی نقطۂ نگاہ سے متقابل پیداواری مصارف بھی ہیں۔ اگر ہم آلات کے ذریعے ایک مربع میٹر کپڑا دو رُوپے میں پیدا کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ چرخے اور کرگھے پر اُسے تین یا چار رُوپے میں پیدا کریں۔ اس سے حاصل شدہ محدود ذرائع کا بے جا استعمال ہی ہوگا۔ مگر یہ مخالفت تبھی پیدا ہوتی ہے جب ہم دو پیداواری نظام کی محض تخلیقی کارگذاری پر توجہ دیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پیداوار کے مختلف نظام کو معاشی نقطۂ نگاہ کے علاوہ دوسری نگاہ سے بھی دیکھیں۔ اگر ایک نظامِ پیداواری مصارف کو گھٹاتا ہو، لیکن معاشی بدحالی اور طاقتوں کے centralization کی حوصلہ افزائی کرتا ہو اور انسان کو اس حد تک Leisure دیتا ہو کہ اگر وہ تخلیقی کاموں کے علاوہ تخریبی مقاصد میں منہمک ہو جائے تو پیداواری مصارف کے نظریے سے اہم ہونے پر بھی وہ اخلاقی نظریے سے انسان کے لئے قابلِ اعتماد ہو جاتا ہے۔ اسی سبب سے Consumption پیداوار کے مالی اخراجات کو دھیان میں رکھ کر ہی کوئی پیداواری نظام نہیں اپنانا چاہیئے۔ کسی نظام کو اپنانے کے سماجی یا سیاسی اقدار کے ساتھ ساتھ اس کی غیر مادی اہمیتوں پر بھی نگاہ ڈالنی چاہیئے۔

یہ بات نہیں کہ گاندھی جی کو چرخے اور مل کے بنے کپڑوں کی پیداواری خرچ کے فرق کا علم نہیں تھا۔ پھر بھی ملوں کے ذریعے پیداوار کے چند نسبتاً غیر مفید پہلوؤں کو نگاہ میں رکھ کر اُنہوں نے اسے نظر انداز کیا۔ چرخہ جبر و تشدّد سے مبرّی ہونے کا، معاشی انصاف Non-possession کا پیغامبر تھا۔۔۔ پھر ایک ایسے پیداواری نظام کے خاکے کا تذکرہ ہوا ہے جس سے ذی رُوح آلات کا استعمال کیا جائے گا، جس میں انسان کو گذر اوقات کے لئے دربدر بھٹکنے کی ضرورت نہیں رہ جائے گی اور پیداواری خرچ کا سوال بھی نہیں اُٹھے گا۔ کیونکہ زمین تو قدرت کی دین ہے۔ مفت محنت کرنے والے بھی مل جائیں گے۔ مفت زمین اور مفت مزدور مل کر مفت سرمایے کی تعمیر کریں گے۔ اس طرح پیداوار کا خرچ صفر ہو جائے گا اور گذر اوقات کے لئے محنت نہیں کرنی ہوگی۔ ابھی جو پیداواری خرچ میں خرچ کا پہلو اہم ہے ویسا نہ رہ کر 'پیداوار' کا پہلو مقدّم ہوگا، اسی لئے گاندھی جی نے Intelectual labourer کے concept کو بڑھاوا دیا ہے۔

اِس طرح گاندھی جی کا معاشی فلسفہ اگرچہ عدم تشدّد سے نکلا ہوا ہے مگر وہ لافانی معلوم ہوتا ہے کیونکہ سائنسی اور تکنیکی ترقی کی روشنی میں دیکھنے پر بھی اِس کا موزوں پن دیدنی ہے۔ تکنیکی ترقی کے سبب دنیا میں جو سماجی، سیاسی اور تمدّنی فضا بدل رہی ہے اُن مسائل کے لئے بھی گاندھی جی کا معاشی فلسفہ ہی موزوں حل پیش کرتا ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب زیادہ Consumption کے لئے ہر شخص سرگرمِ عمل رہے گا تو جنگ و

اور تشدد رُونما ہوگا، اس لئے ایثار لازمی ہے۔ دوسری طرف سیاسی سطح پر تشدد کی علامت " state " کے غیر لازمی ہوجانے کے لئے ضروری ہے کہ معاشی طاقتوں کا Decentralization گاؤں میں ہو۔ گذر اوقات کے لئے لازمی اشیاء کی پیداوار میں ہر گاؤں خود کفیل ہو اور اُن آلات کا استعمال نہ ہو جو استبداد (Exploitation) میں معاون ہوں اور جو انسانوں کی طاقتوں کے استعمال میں رُکاوٹ ثابت ہوں۔

بقول گاندھی جی:

"اگرچہ میں سائنسی ترقیوں کا مداح ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ زمانۂ قدیم ہی کو سائنسی ترقیوں کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے اور اُسے ہی نئے ڈھنگ سے مزّین کرنا ہے۔ یہ آپ کو خیال نہیں کرنا چاہئے کہ میں اسی گاؤں کی زندگی کو ترجیح دے رہا ہوں۔ میرے خوابوں کا گاؤں اب بھی میرے دل میں ہے۔ میرے مثالی گاؤں میں صاحبانِ فہم و ذکا رہی سکونت پذیر رہیں گے۔ غلاظت اور تاریکی میں جانوروں کی مانند نہیں رہیں گے۔ عورتوں اور مردوں کو پوری آزادی ہوگی اور دنیا کی کسی بھی طاقت کے رُوبرو ایستادہ ہو سکیں گے۔ وہاں نہ پلیگ ہوگا نہ ہیضہ نہ چیچک اور نہ دوسری کوئی وبا۔ کوئی بے کار نہیں ہوگا اور نہ کوئی عیش کی زندگی گذارے گا، بلکہ ہر شخص کو اپنے حصے کی جسمانی محنت ( Manual labour ) کرنی ہوگی۔"

گاندھی جی کے مندرجۂ بالا خاکے سے ہمیں یہ سمجھنے میں مشکل نہیں ہوگی کہ وہ ایک زراعت اور صنعت سے مخلوط معاشی نظام کی حمایت کرتے تھے۔ اس نظام کا بھاری صنعتوں سے آغاز نہیں ہوتا ہے یہ اعلیٰ معیارِ زندگی کی بھی تنظیم نہیں کرتا۔ اس کے تحت مقابلہ (competition) کی بھی گنجائش نہیں مگر یہ نظام ایک تشفی بخش، معاشرتی تنظیم کی تخلیق کریگا۔ جس کی بنیاد صداقت اور عدم تشدد ہوگی یا یوں کہا جائے کہ "سرودے" کا اصول ہوگا۔

یہ بات شک، و شبہہ سے پُر ہے کہ آج ہم گاندھی جی کے مرتب معاشی دستورالعمل کی مانند مناسب لائحۂ عمل بہ تقاضائے وقت مرتب کر سکیں۔ ان کے چرخے کا ایک دھاگا جہاں ایک طرف بھارت میں پونجی واد کا خاتمہ کر رہا تھا اور بھارت کو اہنسک سماج کی طرف لا رہا تھا، وہاں انگریزی حکومت کے گلے میں پھانسی کا پھندا بھی ڈال رہا تھا۔ اُن کا سودیشی جذبہ جہاں ایک جانب حب الوطنی کا جادو جگا رہا تھا، وہاں دوسری جانب لنکاشائر اور مینچسٹر کے کل کارخانوں کی جڑیں بھی کاٹ رہا تھا۔ شاید ہی ہم اپنے دور کے لئے ایسا کوئی دستورالعمل مرتب کر سکیں۔ یہ گاندھی جی کی معاشی سوجھ بوجھ تھی۔ اس کا ردّعمل یہ ہے کہ کچھ لوگ اس بھرم میں پڑ جاتے ہیں کہ گاندھی جی بنیادی طور پر ایک سیاست داں ( Politician ) تھے اور ہندوستان میں Effective بننے کی دُھن میں مہاتما کا رُوپ اختیار کیا۔ مگر یہ تو ان کے فکر اور عمل میں یگانگت لانے کا ایک واحد مقصد تھا جس نے اُنہیں معاشی دستورالعمل مرتب کرنے پر مجبور کیا۔

ان سبھی دستورالعمل، معاشی توازن، انصاف اور ترقی کا کوئی دوسرا آغاز کنندہ ہوگا اور ہم آپ اس میں شریک ہوں گے۔ ایسا نہیں تھا اور گاندھی جی کے دستورالعمل کا پلاننگ کمیشن بیٹھ کر خاکہ بنائے گا، ایسی بات بھی نہیں ہے ان کا ہر سدھار اپنی شخصیت سے شروع ہوتا ہے۔ ۵، اگست ۱۹۴۷ء کے 'ہریجن'[1] میں وہ رقم طراز ہیں کہ،

---

[1] یہ رسالہ گاندھی جی نکالا کرتے تھے اور اس میں اُن کے افکار و خیالات ہوتے تھے۔

"اب ہم اس پر غور و فکر کریں کہ عدم تشدد کے واسطے سے معاشرتی Equal Distribution کیسے کیا جائے۔ اس شخص کے لئے جس نے اُسے اپنا آدرش بنایا ہے پہلا قدم یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی میں لازمی تغیر کر کے اپنی ضرورتوں کو ہندوستان کی غربت کے پیش نظر سب سے کم کرے گا۔ اُس کی آمدنی بے ایمانی سے معرّیٰ ہوگی اور سٹّے بازی کی نیت بھی چھُٹ جائے گی۔ ساتھ ہی اس کی رہائش اس نئی زندگی کے مطابق ہوگی۔ جب ان سب چیزوں کو اپنی زندگی کے سانچے میں ڈھال لے گا تو وہ اس حالت میں قدم رکھے گا کہ اس آدرش کو اپنے ساتھیوں اور ہمسایوں میں پھیلا سکے۔"

"ظاہر ہے کہ گاندھی جی نے معاشی دستور العمل کو ہندوستان کی وقتی ضرورت، حالت، تمنّا، اہنسا اور ایثار کے [illegible] نظریہ بنایا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ گاندھی جی کے معاشی فلسفے کی دورِ حاضرہ میں کیا افادیت ہے۔ لیکن ہم اُن کے معاشی دستور العمل کے معاملے میں یہ سوال نہیں کرتے ہیں، کیونکہ اگر اُن کے فلسفے کو ہم نے مان لیا ہے تو اس کے مطابق اپنی ضرورتوں کو محفوظِ خاطر رکھ کر دستور العمل مرتب کیا جا سکتا ہے۔ پھر گاندھی جی اپنے دستور العمل کے لئے کبھی مُصر نہیں ہوئے۔ بنیادی مقصد عدم تشدد سے پُرمعاشرے کا قیام ہے' ایسے معاشرے کا قیام جہاں امن اور چین کی حکمرانی ہو یا جس پروگرام کے ذریعے ہو وہی اپنایا جائے۔ لہٰذا ہمیں صرف اسی سوال کا حل تلاش کرنا ہے کہ اُن کا معاشی فلسفہ ہمارے لئے کہاں تک سُودمند ہے۔

گاندھی واد (Gandhism) 'Minimum' کا اُصول ہے۔ آج کا دَور Minimum کا ہے۔ بیشتر لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بہتری، سب سے زیادہ پیداوار، اعلیٰ ترین معیارِ زندگی، سب سے زیادہ منافع، سب سے زیادہ اُجرت اور سب سے زیادہ تن آسانی کی ضرورت ہے۔ لیکن کیا اِس 'سب سے زیادہ' کے سراب نے ہمیں سُکھی کیا ہے؟ امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ خوش حال ملک ہے۔ اُس کی آبادی بھارت کا ایک تہائی حصّہ ہے پھر بھی وہاں بھارت سے تین گُنا زیادہ لوگ خودکشی کرتے ہیں۔ ایک ماہرِ نفسیات نے تو یہاں تک کہا ہے کہ برٹین کی معاشی ترقی کی رفتار کم ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہاں کی خودکشی کی شرح میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ دُوسری طرف جاپان کی ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں خودکشی کی شرح اُونچی رہی ہے۔ نیویارک شہر کے پچاس فی صد سے زیادہ بالغ حضرات بغیر نیند کی گولی استعمال کئے سو نہیں سکتے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگلے سو برسوں میں وہاں کے بچے یہ یقین ہی نہیں کر سکیں گے کہ لوگ یوں ہی بستر پر جاتے تھے اور انہیں نیند آ جاتی تھی۔

آٹومیٹک مشین اور کمپیوٹروں کے اس دَور میں تکنیکی نقطۂ نگاہ سے یہ ممکن ہے کہ سارے امریکہ کے پیداواری نظام کو صرف تین سو آدمی برقرار رکھیں۔ ٹیسٹ ٹیوب کے بچے اور ہم صحبت ہوئے بغیر بچہ پیدا کرنے کے طریقوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے انسانوں کی تخلیق کی جائے جو صرف دیکھنے میں انسان ہوں اور محنت کر سکتے ہوں لیکن جن کے دماغ میں کوئی دوسری طاقت نہ ہو بلکہ وہ زندہ مشین ہوں۔ یہ تین سو انسان بھی اگر اسی طرح کارخانے میں تخلیق کئے گئے ٹیسٹ ٹیوبی انسان ہوں تو باقی انسان کیا کریں گے۔ ان کی Creative طاقت کا کہیں تو خاتمہ ہوگا ہی اور انہیں Destructive کاموں میں لگنا ہی ہوگا۔ اس کی روک کے لئے ضروری ہے کہ مختلف تکنیک کی وجہ سے پیداوار کی لاگت میں ہونیوالے فرق کی فکر کئے بغیر اپنے کام کو پوری توجہ کے ساتھ کیا جائے۔ اِسطرح ایک ایسا عہد آ رہا ہے جب انسان کو گاندھی جی کا معاشی فلسفہ ایک نظری تقاضا معلوم ہوگا اور عمل کا مقصد خود بخود عمل ہی نظر آئیگا۔

ڈاکٹر گیان چند



# مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال

نوٹ: اِس مضمون کی بھاشا ہندوستانی ہے جسے ہر ہندی والا پُوری طرح سمجھ سکتا ہے۔
۲۔ اِس میں باپو کے سارے بول انجمن ترقی اُردو ہند کی کتاب "مشترکہ زبان" کے پہلے ایڈیشن سے لئے گئے ہیں۔

ہمارے نیتاؤں میں صرف مہاتما گاندھی ایسے تھے جنہوں نے زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ایک بڑی گتھی بھاشا کی ہے اور اِس پر باپو نے بار بار بڑے خوبصورت ڈھنگ سے اپنے وِچار ظاہر کئے ہیں۔ اگر ہم نے ان پر دھیان نہیں دیا تو گھاٹا ہمارا ہوا۔ مہاتما جی جنتا کے آدمی تھے۔ جنتا کی نبض پر ہاتھ رکھتے تھے' اِس لئے وہ اسی بھاشا کو قومی بھاشا مانتے تھے جو جنتا بول چال کے کام میں لاتی ہو۔ بھاشائی سائنس کے لحاظ سے بھی بھاشا کا بول چال کا رُوپ ہی اصلی رُوپ ہے۔ لکھاوٹی رُوپ جھوٹا اور نقلی ہے۔ بھاشا کے سوال پر مہاتما جی کا سب سے پرانا لیکھ لگ بھگ ۱۹۰۹ء کے "ہند سوراج" میں ملتا ہے:

" سارے ہندوستان کے لئے تو ہندی ہی ہونی چاہیئے۔ اسے اُردو میں لکھا جائے یا ناگری میں۔ ہندو مسلمانوں کے وِچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لئے بہت سے ہندوستانیوں کے لئے دونوں لکھاوٹوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایسا ہونے پر ہم آپس کے بیوہار میں سے انگریزی کو نکال باہر کر سکیں گے۔"

کئی سال بعد انہوں نے ہندی کی یہ تعریف پھر دُہرائی:

" ہندی بھاشا میں اُسے کہتے ہوں جسے اُتّر میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا اُردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔"

جو ہندی اور اُردو کو دو الگ بھاشائیں کہتے ہیں' اُن کے لئے مہاتما جی کا جواب تھا کہ اُتّری بھارت میں مسلمان اور ہندو دونوں ایک ہی بھاشا بولتے ہیں۔ فرق صرف پڑھے لکھوں نے پیدا کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں مہاتما جی پہلی بار ہندی ساہتیہ سمیلن کے سبھاپتی ہوئے۔ اپنے بھاشن میں آپ نے پھر ہندی کی وہی تعریف کی۔ ۱۹۳۵ء میں آپ دُوسری بار سمیلن کے سبھاپتی ہوئے اور اِس بار سمیلن سے ہندی کی اپنی تعریف منوالی۔

آپ نے اپنے کئی لیکھوں اور بولوں میں نہ صرف اُردو اور ہندی بلکہ ہندوستانی کو بھی ایک بھاشا مانا ہے۔

"ہندی، ہندوستانی اور اُردو شبد ایک ہی زبان کو ظاہر کرتے ہیں جسے اُتر بھارت میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے"۔

(ہریجن سیوک۔ ۳ رجولائی ۱۹۳۷ء)

"ہندی، ہندوستانی اور اُردو یہ تینوں شبد ایک ہی بھاشا کی طرف اشارہ کرتے ہیں"۔

(ہریجن ۵ رجولائی ۴۶ء)

لیکن اِس کے ساتھ ہی ساتھ مہاتماجی کے ایسے بول بھی بہت کافی ہیں جن میں اُردو اور ہندی بلکہ ہندوستانی کو بھی الگ بھاشا کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر

"اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو اُنہیں اُردو پڑھنی ہی چاہیئے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیئے"۔

(نوجیون، ۲۱ رجولائی ۱۹۲۷ء)

ہندوستانی کو اصلی شکل دینے کے لئے ہندی اور اُردو کو اس کی پالنے والی بھاشائیں سمجھنا چاہیئے، اِس لئے کانگریس کو ان دونوں کی طرف اچھے وچار رکھنے چاہئیں..."

"کانگریس سے آزاد رہ کر ہندی اور اُردو برابر ترقی کرتی رہیں گی۔ ہندی زیادہ تر ہندوؤں میں اور اُردو مسلمانوں میں محدود رہے گی..."

"ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو اس بات کا سپنا دیکھتے ہیں کہ یہاں خالی اُردو یا خالی ہندی ہی رہے گی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ناپاک سپنا ہے اور ہمیشہ سپنا ہی رہے گا"۔

(ہریجن سیوک، ۲۹ راکتوبر ۳۸ء)

"ہندی اور اُردو دو ندیاں ہیں اور ہندوستانی ساگر ہے۔ ان دونوں میں سے ہمیں کسی سے نفرت نہیں ہونی چاہیئے۔ ہمیں تو دونوں کو اپنانا ہے۔ ہندوستانی کا پیٹ اتنا بڑا ہے کہ وہ دونوں کو اپنا لے گی"۔

(دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس میں ۲۷ رجنوری ۴۶ء کی تقریر)

آپ یہ سُن کر تعجب کریں گے کہ یہ دونوں باتیں سچ ہیں۔ اگر بول چال کے رُوپ کو سامنے رکھیں تو اُردو، ہندی اور ہندوستانی ایک بھاشا ہیں۔ اگر ان کا لکھا ہوا رُوپ اور ساہتیہ دیکھیں تو اُردو اور ہندی الگ الگ زبانیں ہیں۔

اِسی طرح اِن کے لیکھوں میں ایک طرف بہت سی ایسی مثالیں مِل جائیں گی جہاں انہوں نے زور دیا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی اور ہندی صرف ہندوؤں کی بھاشا نہیں۔ مثلاً:

"ہندی بولنے والے حصّوں میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کی مادری زبان ہندی ہی ہے۔ اِسی طرح ایسے ہزاروں ہندو ہیں جن کی ماتری بھاشا اُردو ہے"۔

(ہریجن سیوک ۲۹ راکتوبر ۳۸ء)

دوسری طرف کئی بار وہ اُردو بھاشا اور لپی کو مسلمانوں سے اور ہندی بھاشا اور دیوناگری کو ہندوؤں سے جوڑ دیتے ہیں مثلاً:

"اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو انہیں اُردو پڑھنی ہی چاہیئے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیئے"۔ (نوجیون ۲۱ رجولائی ۲۷ء)

یہ دونوں باتیں انمیل ہیں لیکن گہرائی میں جاکر دیکھا جائے تو دونوں اپنی اپنی جگہ سچ ہیں۔ اُردو پڑھنے والے زیادہ تر مسلمان اور ہندی پڑھنے والے ہندو ہوتے ہیں لیکن سب مسلمانوں کی بھاشا اُردو ہی نہیں ہوتی اور کچھ ہندو ہندی نہ پڑھ کر اُردو پڑھتے ہیں۔

مہاتما جی بیچ بیچ ہندی اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے اُنہوں نے عام طور پر قومی زبان کو ہندوستانی کہنا شروع کیا۔ چنانچہ اُن کے اشارے پر ۱۹۲۵ء میں کانپور کانگریس نے اپنے ودھان کی دفعہ ۳۳ یہ کر دی کہ آئندہ سے کانگریس کی شاخوں اور ورکنگ کمیٹی کا کام ہندوستانی میں کیا جائے گا۔ جو لوگ والے ہندوستانی نہیں بول سکتے وہ انگریزی یا کسی صوبائی بھاشا کا استعمال کر سکتے ہیں۔

مہاتما جی کی بھاشا کی پوری اسکیم سنہ ۲۴ء کے ایک لیکھ میں یوں دی ہے:

"ایک خاص میعاد کے اندر ہر صوبے کی عدالتوں اور اسمبلیوں کا کام کاج اُسی صوبے کی بھاشا میں جاری ہو جانا چاہیئے۔ اپیل کی آخری عدالت کی زبان ہندوستانی قرار دی جائے۔ لکھاوٹ چاہے دیوناگری ہو یا فارسی۔ مرکزی سرکار اور بڑی اسمبلیوں کی بھاشا بھی ہندوستانی ہی ہو۔ انتر راشٹری راج بیوہار کی بھاشا انگریزی رہے۔"

(نوجیون ۲۶ دسمبر سنہ ۲۴ء)

مہاتما جی نے ایک آدرش وادی کی طرح یہ سب لکھ دیا ہے۔ ان باتوں پر عمل کرنے میں جو مشکلیں ہیں سنہ ۲۴ء میں اس کا اندازہ مہاتما گاندھی تک کے لئے مشکل تھا۔ آج ہم سب کو معلوم ہے، مثلاً ہائی کورٹوں کا کام صوبائی بھاشاؤں میں ہو اور سپریم کورٹ کا ہندوستانی میں تو قانون اور انصاف کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر ہندوستانی میں یہ جان کہاں کہ وہ سپریم کورٹ، پارلیمنٹ اور مرکزی سرکار کی بھاشا بن سکے۔ اس ذمے داری کو اُٹھاتے تو خالص ہندی یا خالص اُردو بھی لنگڑانے لگتی ہے۔ بہر حال سنہ ۲۴ء میں ایک موٹے اصول بلکہ آدرش کے رُوپ میں یہ مانگیں سراہنے کے لائق تھیں۔

ہندوستانی اور دکھنی ہند والے۔ ہندی یا ہندوستانی کو قومی زبان بنانے سے اصلی دقت [illegible] والوں کو ہوتی۔ ان سے مہاتما جی نے بار بار اپیل کی کہ باقی دیش واسیوں کی خاطر ہندی سیکھ لیں۔ لکھتے ہیں۔

ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں صرف تین کروڑ اسّی لاکھ سے کچھ اُوپر مدراسی لوگ ہندوستانی بولنے والوں کی بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس علاقے کے ۳۸۰ لاکھ لوگوں کا دھرم کیا ہے۔ کیا ان کے لئے ہندوستان انگریزی سیکھے یا پھر باقی ۲۷۷ لاکھ ہندوستانیوں کے لئے انہیں ہندوستانی سیکھنی چاہیئے۔" (ینگ انڈیا ۲۱ جنوری سنہ ۲۱ء)

بنگلور میں سنہ ۳۵ء میں ہندی پرچار سبھا کے کنووکیشن میں کہا:

"بھارت کے بیس کروڑ آدمیوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے کرناٹک کے ایک کروڑ دس لاکھ نر ناریوں کو ان کی بھاشا ہندی سیکھنی چاہیئے۔"

۵ جولائی سنہ ۴۶ء کے ہریجن میں مہاتما جی نے پھر کرناٹک والوں سے اپیل کی کہ ۲۰ کروڑ دیش بھائیوں کے ساتھ سمبندھ قائم کرنے کے لئے ہندی سیکھیں۔

مہاتما جی کی ہندوستانی میں بڑی لچک تھی۔ وہ سنسکرت بھری ہندی اور عربی فارسی بھری اُردو کے خلاف تھے لیکن یہ مانتے تھے کہ کبھی کبھی ہندوستانی میں سنسکرت یا عربی فارسی میں سے کسی ایک کا زور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ دکھن والوں کے لئے ہندوستانی میں سنسکرت شبد ہونے ہی چاہئیں۔ لکھتے ہیں:

"اگر سنسکرت جاننے والے ہندو سنسکرت شبدوں کا ایک حد تک استعمال کرتے ہیں تو اُن کا ایسا کرنا ضروری ہے۔ صرف عربی جاننے والے مسلمان بھی یہی کرتے ہیں... تامل یا تیلگو کی کسی چیز کا ترجمہ آپ ہندی یا ہندوستانی میں کریں اور اس میں سنسکرت شبد نہ آئیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا آنا قریب قریب لازمی ہے کیونکہ ان میں سنسکرت شبد بہت زیادہ ہیں۔ یہی حال عربی لفظوں کا ہے عربی کی کسی چیز کا ترجمہ اگر ہم ہندی یا ہندوستانی میں کرنے بیٹھیں تو اس میں عربی شبدوں کو آنے سے ہم روک نہیں سکتے۔" (ہریجن سیوک ۲۳ جون ۳۶ء)

مہاتما جی نے ۳۷ء اور ۳۵ء میں یہ رائے ظاہر کی کہ چونکہ دکھن کی بھاشاؤں اور بنگالی میں سنسکرت شبد زیادہ ہیں، اس لئے سنسکرت شبدوں سے بھری ہوئی ہندی ہی ان لوگوں کو اپیل کر سکتی ہے۔ اسی طرح جیسے پنجاب والوں کو ہندوستانی میں عربی فارسی شبدوں کی ملاوٹ ہوگی۔

**لکھاوٹ:** یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن مہاتما جی نے غضب یہ کیا کہ صوبائی بھاشاؤں والوں کو بار بار یہ صلاح دی کہ وہ اپنی بھاشا دیوناگری لپی میں لکھنے لگیں۔ ۳۵ء میں بنگلور کے ہندی کے پرچار کنووکیشن میں مہاتما جی نے کرناٹک والوں پر زور دیا کہ وہ ہندی سیکھ لیں، اس پر وہاں کے ایک شخص نے بگڑ کر لکھا۔ تامل والا تامل کی جگہ انگریزی میں سوچتا ہے، آپ کی یوجنا کے بعد وہ ہندی میں سوچنے لگے گا۔ اس طرح اس میتی کا صاف نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اور ساری بھاشائیں مٹ جائیں اور صرف ایک ہندی رہ جائے، وہ بھی دونوں لکھاوٹوں میں، کیونکہ سب بھاشاؤں کی لکھاوٹ تو دیوناگری ہی ہو جائے گی۔

اس پر مہاتما جی نے ۱۵ اگست ۳۵ء کے ہریجن میں جواب دیا کہ اگر پورا راشٹر اپنی بھاشا کے سوا ایک کُل بھارتی بھاشا جان لے تو کیا حرج ہے۔ یہ بھاشا ہندی یعنی ہندوستانی ہی ہو سکتی تھی۔ رہا ماتری بھاشا کا سوال تو آپ مجھے غلط سمجھے۔ میں ماتری بھاشا کو پہلی جگہ دیتا ہوں۔ ہاں لپی کے بارے میں مجھے اپنی رائے پر پچھتاوا نہیں ہے۔ جو الگ الگ بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں یا جن کے ساتھ اس کا گہرا رشتہ رہا ہے، پر جُدا جُدا لکھاوٹوں میں لکھی جاتی ہیں، اُن کی ایک ہی لپی ہونی چاہیئے اور وہ لکھاوٹ دیوناگری ہی ہے۔

اس کے بعد بھی مہاتما جی صوبائی بھاشاؤں کے لئے دیوناگری کی وکالت کرتے رہے۔ لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ دیوناگری لکھاوٹ کا ایک اندولن چل رہا ہے جس کا ساتھ میں دل سے دے رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مختلف صوبوں میں خاص کر جن صوبوں میں سنسکرت شبدوں کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ بولی جانے والی تمام بھاشاؤں کے لئے دیوناگری لکھاوٹ کو مان لیا جائے۔" (ہریجن سیوک ۲۴ جون ۳۶ء)

"رومن لکھاوٹ نہ تو ہندوستان کی لکھاوٹ ہو سکتی ہے اور نہ ہونی چاہیئے۔ یہ برابری تو فارسی اور دیوناگری کے بیچ ہی ہو سکتی ہے اور اس کی بنیادی خوبیوں کو الگ رکھ دیں تو بھی دیوناگری ہی سارے ہندوستان کی سب کو منظور لکھاوٹ ہونی چاہیئے کیونکہ مختلف صوبوں میں چالو زیادہ تر لکھاوٹیں بنیادی طور سے دیوناگری ہی سے نکلی ہیں ... لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر یا دوسرے ایسے لوگوں پر جو اس سے انجان ہیں اسے زبردستی لادنے کی ہمیں کسی طرح کی کوئی خواہش نہیں کرنی چاہیئے۔" (ہریجن سیوک، ۳ جولائی ۳۶ء)

مہاتما جی کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تمام صوبائی بھاشائیں تو دیوناگری میں لکھی جائیں لیکن خود ہندی، دیوناگری اور اُردو دونوں میں لکھی جائے۔ ایسا کچھ شبہہ کسی اُتر بھارتی کے دل میں اُٹھا اور اُس نے مہاتما جی سے کئی سوال کئے جن کا

جواب ۲۶ ر اپریل ۱۹۴۷ء کے ہریجن سیوک میں ملتا ہے۔ سوال کرنے والے نے کہا تھا کہ اگر آپ ہندو مسلم ایکتا کے لئے اردو سیکھنے کو کہتے ہیں تو بنگال، مہاراشٹر، گجرات، دکھنی بھارت وغیرہ کے مسلمان تو اردو نہیں جانتے، صوبائی بھاشائیں بولتے ہیں۔ اتر بھارت کی تمام بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں اور دکھنی بھارت کی بھاشاؤں میں سنسکرت شبد آگئے ہیں۔ پھر ان میں عربی فارسی جیسی اجنبی زبانوں کے شبدوں کے پرچار کیوں کیا جائے۔ دوسرا سوال لپی کے بارے میں تھا کہ زیادہ تر صوبوں کی لپیاں دیوناگری سے نکلی ہیں، صرف پنجاب اور سندھ والے ناگری کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ باقی لوگوں سے اردو لپی سیکھنے کو کیوں کہا جاتا ہے۔ مہاتما جی نے جواب دیا کہ آپ کی بات میں بہت کچھ سچائی ہے لیکن ہندو مسلم ایکتا کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اگر دوسرے صوبوں والے دیش پریم کے ساتھ ایک۔ اور لپی اردو سیکھ لیں تو ان کا فائدہ ہی ہے۔

مہاتما جی اور انگریزی : آگے بڑھنے سے پہلے ہم انگریزی کے لئے مہاتما جی کے وچار جانتے چلیں۔ وہ ۱۹۰۹ء سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ہمیں انگریزی کو نکال باہر کرنا ہے۔ ودیشی بھاشا ہمیں آزادی نہیں دلا سکتی، لیکن انگریزی کی کوئی جگہ ہونی چاہیے کہ نہیں، اس کی طرف بھی انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ اندور میں ۱۹۳۵ء میں کہا :

یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ میں انگریزی بھاشا سے نفرت نہیں کرتا ہوں۔ انگریزی ساہتیہ بھنڈار سے میں نے بھی بہت رتنوں کا استعمال کیا ہے۔ انگریزی بھاشا کے ذریعے ہم کو سائنس وغیرہ کی خوب جانکاری حاصل کرنی ہے اس لئے انگریزی کی جانکاری بھارت واشیوں کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس بھاشا کو اس کی ٹھیک ٹھیک جگہ دینا ایک بات ہے، اس کی پوجا کرنا دوسری بات ہے۔"

۱۹۲۴ء میں بھاشا سے متعلق مہاتما جی نے اپنی پوری اسکیم کھول کر بیان کی۔ اس کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔ اس میں انگریزی کو صرف انتر راشٹری یعنی دوسرے ملکوں سے کام کاج کے لئے باقی رکھا ہے۔ دیس کے بھیتر اسے کوئی جگہ نہیں دی۔ یہ ہمیں ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۹۲۷ء میں جھریا میں کوئلے کی کھانوں کے مزدوروں کی طرف سے مہاتما جی کو انگریزی میں ایک ایڈریس دیا گیا۔ آپ نے اسے سننے سے انکار کر دیا اور اسے بغیر پڑھے ہوئے ہی پڑھا ہوا مان لیا گیا۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۲۷ء کے نوجیون میں مہاتما جی نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ آئندہ کسی سبھا کی کارروائی کسی ایسی بھاشا میں ہو جسے زیادہ لوگ نہ جانتے ہوں تو وہ لوگ اس سبھا سے اٹھ کر چل دیں۔ ظاہر ہے کہ باپو کا اشارہ انگریزی کی طرف تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما جی پڑھے لکھوں کے لئے انگریزی جاننا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ صرف کچھ لوگ انگریزی پڑھ لیں اسے کافی مانتے تھے۔ ۱۵ر اگست ۱۹۳۵ء کے ہریجن میں لکھتے ہیں :

" میں نے بار بار یہ سمجھایا کہ ہماری ترقی میں انگریزی کی ایک مقرر جگہ ہے۔ ہمارے راجنیوں کی اور ساری پچھمی دنیا کی بات سمجھنے کے لئے اور پچھم کی اچھی سے اچھی باتیں ہندوستانی کو سکھانے کے لئے ہمارے کچھ آدمیوں کو ضرور انگریزی سیکھنی چاہیئے، کیونکہ پچھمی بھاشاؤں میں اس کا سب سے زیادہ پرچار ہے۔"

اس لیکھ میں انگریزی کو راجنیوں کی باتیں سمجھنے کا ذریعہ بھی قرار دیا ہے۔ راجنیوں سے مطلب ہوپے ہی ہو سکتے ہیں۔ صرف اس لیکھ کے سوا اور کہیں یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ مہاتما جی نے صوبوں کے بیچ میل جول کے لئے انگریزی کو ضروری سمجھا ہو۔ سچ یہ ہے کہ مہاتما جی انگریزی کو دیس کی ترقی کے راستے میں روڑا سمجھتے تھے۔ ایک جگہ انگریزی سیکھنے کو وقت برباد کرنا کہہ گئے ہیں :

" انگریزی زبان نے ہم پر جو جادو ڈالا ہے۔ اس کے اثر سے ہم ابھی تک چھوٹے نہیں ہیں۔ اس جادو کے

جال میں پھنس کر ہم لوگ ہندوستان کو اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ جتنے سال ہم انگریزی سیکھنے میں برباد کرتے ہیں اگر اتنے مہینے بھی ہم ہندوستانی سیکھنے کی تکلیف نہ اٹھائیں تو سچ سچ ہی کہنا ہوگا کہ ہم عام لوگوں کی طرف اپنے پریم کی جو ڈینگیں ہانکا کرتے ہیں وہ نری ڈینگیں ہی ہیں۔"

(رچنا تمک کاریہ کرم)

آج تعلیم کے ماہر عام طور پر مانتے ہیں کہ ہندوستان میں ہر پڑھے لکھے کو انگریزی ضرور پڑھنی چاہیئے۔

__مہاتما جی اور اردو__ ۔ مہاتما جی نے سب سے زیادہ حمایت اردو کی کی، لیکن دکھ کی بات ہے کہ ان کی سب سے زیادہ مخالفت اردو والوں ہی نے کی۔ یہ ایک سچائی ہے کہ آزادی سے پہلے کی اردو تحریک، مسلم لیگ تحریک کے پاس تھی۔ مہاتما جی اردو کے پریمی تھے لیکن اپنی کچھ گول مال باتوں سے انہوں نے اردو والوں کے من میں شک پیدا کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن میں انہوں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد بنانے کا سجھاؤ دیا جس کا مقصد صوبائی بھاشاؤں اور ان کے ساہتیہ کاروں میں میل جول پیدا کرنا تھا۔ اس پریشد کی بیٹھک ۲۴ر اپریل ۱۹۳۶ء کو ناگپور میں ہوئی۔ پہلے ہی جلسے میں یہ پرستاؤ رکھا گیا کہ اس سبھا کا کام 'ہندی ہندوستانی' میں ہوگا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے سخت اعتراض کیا کہ جب کانگریس نے ہندوستانی کو ملک کی زبان طے کیا ہے تو یہ ہندی ہندوستانی کیا ہے۔ مہاتما جی نہ مانے۔ اسے بدل کر 'ہندی اتھوا ہندوستانی' کرنے پر تیار ہو گئے۔ مولوی عبدالحق نے تجویز کی کہ ہندی ہندوستانی کی بجائے صرف ہندوستانی یا پھر 'ہندی یا اردو' کر دیا جائے۔ ان کی بات نہ مانی گئی اور وہ پریشد چھوڑ کر چل دیئے۔ اردو والوں میں مشہور ہے کہ اس موقع پر مہاتما جی نے کہا تھا،

"اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

(بہ حوالہ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۶۳)

مجھے یقین نہیں آتا کہ مہاتما جی نے ایسا کہا ہوگا۔ اردو اور مسلمانوں کا کوئی مخالف بھی اس سے زیادہ کیا کہتا۔ باپو اردو کے پریمی تھے، لیکن جنوری ۱۹۴۲ء میں کسی اردو والے نے مہاتما جی کو چٹھی لکھی جس میں دوسری باتوں کے سوا یہ بھی کہا تھا کہ "آپ تو اردو کو کھلم کھلا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جانے والی مسلمانوں کی بھاشا کہہ چکے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر مسلمان چاہیں تو بھلے ہی اس کی حفاظت کریں۔" مہاتما جی نے یہ چٹھی اور اس کا جواب ۸ر فروری ۱۹۴۲ء کے ہریجن سیوک میں چھاپا ہے۔ جہاں انہوں نے چٹھی کی دوسری غلط فہمیوں کو دور کیا ہے، اوپر دی ہوئی بات کا کاٹ نہیں کیا۔ اس سے انکار نہیں کیا۔ لیکن کئی سال ہوئے مہاتما جی کے ایک بھگت ڈاکٹر جعفر حسن نے اخباروں میں لکھا تھا کہ مہاتما گاندھی نے یہ شبد نہیں کہے تھے۔ بہرحال 'ہندی ہندوستانی' کا فقرہ اردو والوں کے لئے ویسا ہی ثابت ہوا، جیسے سانڈ کے لئے لال کپڑے کا چیتھڑا۔ مولوی عبدالحق نے اردو کے لئے ایک زبردست اندولن شروع کیا اور کہا کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد اردو کو ختم کرنے اور ہندی کو لادنے کی ایک سازش ہے۔

مہاتما جی نے ۱۶ر مئی ۱۹۴۲ء کے ہریجن میں 'ہندی ہندوستانی' نام کے لیکھ میں لکھا کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد ساہتیہ سمیلن کی پیداوار ہے۔ ۲۵ برس کی پرانی سنستھا سے میں نام بدلنے کو کہوں تو یہ گستاخی ہوگی۔ اگر کسی کو ہندی نام سے چڑ ہے تو اسے جاننا چاہیئے کہ ہندی مسلمانوں کا دیا ہوا نام ہے۔ مہاتما جی نے ایک اور لیکھ (ہریجن سیوک ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۲ء)

میں اس بات پر دکھ ظاہر کیا کہ سمیلن نے ہندی کی تعریف میں اُردو لکھاوٹ کو شامل کر کے جو بڑا قدم اُٹھایا ہے مسلمانوں نے اُس کی داد نہیں دی۔

۳۲ء میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق میں ایک سمجھوتہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ اُردو ہندی کے قابل لوگ مل کر ایک ڈکشنری بنائیں۔ ہندی کے لیکھکوں نے جو اُردو شبد اور اُردو کے لیکھکوں نے جو ہندی شبد استعمال کئے ہیں، وہ سب اس ڈکشنری میں جمع کئے جائیں اور یہ ہندوستانی بھاشا کا شبد بھنڈار ہوگا۔ مہاتما جی نے اس سمجھوتے کو بہت سراہا لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا کام آگے نہ بڑھا۔ آخرکار ۴۲ء تک مہاتما جی کا پکّا وچار ہو گیا کہ راشٹر بھاشا کا نام صرف ہندوستانی ہو انہوں نے کانگریسیوں کو رائے دی کہ راشٹر بھاشا کا ذکر کرتے وقت وہ اُردو یا ہندی نہ کہہ کر ہندوستانی ہی کہا کریں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ۵ جولائی ۴۶ء کے ہریجن میں انہوں نے دکھن والوں کو "ہندی ہندوستانی" سیکھنے کی رائے دی۔

۲ مئی ۴۲ء کو مہاتما جی نے واردھا میں ہندوستانی پرچار سبھا بنائی لیکن دو تین مہینے بعد ہی بھارت چھوڑو آندولن کے سلسلے میں پکڑے جانے پر اس کا کام رُک گیا۔ ۴۴ء یا ۴۵ء میں یہ کام پھر سے چالو ہوا۔ مہاتما جی ڈاکٹر تاراچند کی یہ بات مانتے تھے کہ شروع میں اُتری بھارت میں ایک بھاشا تھی جسے ہندو مسلمان دونوں بولتے تھے۔ جو ایک تھی، وہ دو ہو گئی۔ ہندوستانی پرچار سبھا کا کام ان دونوں کو پھر سے ایک بنانا ہے۔ ۲۷ فروری ۴۵ء کو آپ نے مولوی عبدالحق کو واردھا بلایا اور کہا:

"عبدالحق صاحب نے ناگپور میں جو بات کہی تھی، اُسے اُس وقت میں نہ سمجھ سکا۔ ہندی یعنی اُردو، اُسے میں نے مانا نہیں تھا۔ اُس وقت ان کی بات مان لیتا تو اچھا ہوتا۔ . . ناگپور میں بھارتی ساہتیہ سمیلن کیا تھا لیکن وہ وہیں شروع ہوا اور وہیں ختم ہوا۔ ہم لوگ ملنے آئے تھے اور پھر الگ الگ ہو گئے۔ ایسے سمیلن سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ وہ ہندوستانی نہیں بلکہ بھارتی ساہتیہ سمیلن تھا۔"

مجھے معلوم نہیں کہ ہندی ساہتیہ سمیلن نے ہندی کی اپنی تعریف بدل دی تھی یا کچھ اور بات تھی کہ مہاتما جی نے ساہتیہ سمیلن کی ممبری سے استعفیٰ دینے کی بات سوچی۔ سمیلن کے سبھاپتی پرشوتم داس ٹنڈن اور مہاتما جی کے بیچ چٹھی پتری ہوئی۔ ٹنڈن جی مہاتما جی کے بہت بڑے بھگت تھے لیکن انہوں نے لکھا کہ میں آپ کے وچار سے کہ ہر ایک دیش واسی ہندی اور اُردو دونوں سیکھے، اتفاق نہیں کرتا۔ آخر ۱۵ جولائی ۴۵ء کو مہاتما جی نے سمیلن چھوڑ دیا۔

جون ۴۷ء میں جب ملک کے بٹوارے کا فیصلہ ہو گیا، تب بھی مہاتما جی اپنی بات پر اٹل رہے۔ اعتراض کیا گیا کہ جب پاکستان ایک حقیقت بن گیا ہے تو ہندوستانی زبان کو ہندی اور اُردو لکھاوٹوں کے ساتھ مقبول بنانے کی کوشش ریت کی رسّی بٹنا ہے، پاگل پن ہے، لیکن مہاتما جی اپنے وشواس پر قائم رہے جب انہیں بتایا گیا کہ قومی زبان ہندی ہوگی جو دیوناگری میں لکھی جائے گی تو انہوں نے کہا کہ میں اس پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتا۔" (ہریجن ۲ اگست ۴۷ء)

۱۵ اکتوبر ۴۷ء کو دہلی ڈائری میں لکھتے ہیں:

"میں نے اخباروں میں ایک پیراگراف دیکھا ہے کہ آئندہ سے یو پی کی سرکاری زبان ہندی دیوناگری لپی کے ساتھ ہوگی۔ اس سے مجھے دُکھ ہوا۔ ہندو مسلمان میں برابر کے سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ اُردو لپی کو بھی باقی

(باقی صفحہ ۵۱ پر دیکھئے)

سید مبارز الدین رفعت



# گاندھی جی کی یاد میں

آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے کی بات ہے ۔ ۱۸۶۹ عیسوی کا سال اور یہی اکتوبر کے مہینے کی دوسری تاریخ ۔ کاٹھیاواڑ گجرات کے ایک شہر پور بندر کے ایک خوش حال کھاتے پیتے متوسط گھرانے میں ایک لڑکے نے جنم لیا ۔ پیدا ہوا تو عام لڑکوں کی طرح روتا بلکتا پیدا ہوا ۔ لڑکے کے والد کرم چند جی گجرات کی ایک چھوٹی سی دیسی ریاست کے دیوان ، لڑکے کی ولادت پر خوشی سے پھولے نہ سمائے ۔ ہندوستان میں لڑکی کے مقابلے میں لڑکے کی ولادت بڑی خوشی کی بات سمجھی جاتی ہے گھر کا چراغ وہ ، خاندان کا وارث وہ ، باپ دادا کا نام روشن کرنے والا وہ ۔ بھلا کرم چند جی کو کیسے خوشی نہ ہوتی ۔ وہ خوش ، ان کی بیوی خوش ۔ ان کے عزیز اقربا خوش ، لیکن لڑکا ان سب باتوں سے بے خبر روتا تھا ، بلکتا تھا ۔

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو ہمہ خنداں بدند و تو گریاں

اُس وقت کسے خبر تھی کہ کسے اندازہ تھا کسے معلوم تھا کہ یہی ننھی منی جان ، یہی مزغۂ گوشت ، یہی بے لبس اور ناتوان بچہ — موہن چند کرم چند گاندھی — اُس سلسلۂ ناب کی ایک کڑی ہے جس میں حکیم سقراط ، حضرت عیسیٰ ، مہاتما مہاویر ، مہاتما گوتم بدھ ، سیدنا امام حسینؑ اور ٹالسٹائی جیسی عظیم المرتبت ہستیاں بندھی ہیں ۔ یہ وہ عظیم ہستیوں کا سلسلہ تھا جو عمر بھر حق کی تلاش میں رہے ، جو عمر بھر حق پر قائم رہے اور حق ہی پر اپنی جانِ شیریں نثار کر دی ۔ جو انسانیت کے بہت بڑے علم بردار تھے جو انسانیت کے بہت بڑے مبلغ تھے ، جو انسانیت کے بہت بڑے خدمت گذار تھے اور جو انسانیت کے بہت بڑے مخدوم تھے ، کیونکہ کہنے والے نے بالکل سچ کہا ہے کہ " ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد "

گاندھی جی کی زندگی کے حالات کم و بیش قریب قریب ہر ہندوستانی کو معلوم ہیں ۔ یہاں اُن کے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ البتہ یہاں ایک بات ضرور عرض کرنے کے قابل ہے کہ انسانیت کے اور خادموں اور محسنوں کی سوانح حیات کی طرح گاندھی جی کی سوانح حیات میں بھی یہ بات مشترک ہے کہ وہ انسانیت کی بے لوث خدمت کی ایک پُر اثر داستان ہے اور اس داستان میں لوگوں کو آمادۂ عمل کرنے اور انسانیت کا احترام اور اس کی بے غرضانہ خدمات کا جذبہ پیدا کرنے کا کافی سامان موجود ہے ۔

گاندھی جی نے اپنی آپ بیتی کا نام ہی "تلاش حق" دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی پوری زندگی حق کی تلاش اور اُس کی جستجو میں بیتی۔ یہ بھی گاندھی جی کی عظمت کی ایک دلیل ہے کہ حق کی تلاش اور اُس کی جستجو میں جہاں کہیں بھی انہوں نے ٹھوکر کھائی یا جہاں کہیں بھی بشریت کے تقاضوں سے اُن سے غلطی ہوئی، اُس کا انہوں نے بڑے کھلے دل کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ گاندھی جی کی عظمت اور اُن کی بڑائی کی سب سے بڑی دلیل ان کا انسان دوستی کا بے پناہ جذبہ ہے۔ انسانیت سے اُن کی بے اندازہ محبت ہے اور اس کی خدمت کا اور اس کے کام آنے کا سرشار ولولہ ہے۔ اُن کا یہ جذبہ انسان انسان کے درمیان کسی بھی قسم کی حد بندی، کوئی دیوار، کوئی فرق و امتیاز اور کسی اونچ نیچ کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ گاندھی جی نے اپنی حیات مستعار کو حق کی تلاش قرار دیا تھا اسی لئے وہ کسی ایک ملک، کسی خاص نسل، کسی مخصوص مذہب یا فرقے کا حصہ نہ بنے۔ حق کی تلاش میں اپنا سب کچھ تیاگ کر وہ پیچ پیچ انسانیت کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ جیسے سمندر میں بوند۔ اسی لئے گاندھی جی کی اپنی کوئی آرزو اپنا کوئی ارمان، اپنی کوئی تمنا انسانیت کی بھلائی کے سوا نہ رہی تھی۔ اُن کی خواہش، آرزو، ارمان اور تمنا سب کچھ بس انسانیت کا سکھ چین اور انسانیت کی فلاح تھی۔ انسانیت کی بے پناہ خدمت کا جذبہ لئے گاندھی جی نے اپنی پوری زندگی بسر کی اور انسانیت کی خدمت ہی میں اپنی جان دی۔ اسی تلاش حق کی وجہ سے گاندھی جی نے کسی خاص ملک کو اپنا ملک، کسی خاص نسل کو اپنی نسل یا کسی خاص مذہب کو اپنا مذہب نہیں مانا وہ پوری دنیا کو اپنا ملک، پوری انسانیت کو اپنی نسل، پوری دنیا کے بسنے والوں کو اپنی قوم اور ہر سچائی کو اپنا مذہب قرار دیتے تھے۔ شری مد بھگوت گیتا کے اشلوک جس طرح ان کے قلب کو تسکین دیتے اسی طرح قرآن شریف کی آیتیں ان کے قلب کو منور کرتیں اور انجیل مقدس اور گرو گرنتھ صاحب کے اقوال سے بھی وہ فیضیاب ہوتے تھے۔ گاندھی جی نے خود بتایا ہے کہ روس کے عظیم مصنف ٹالسٹائی کی کتابیں پڑھ پڑھ کر ہی وہ عدم تشدد کے فلسفے پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ مشہور انگریز مصنف جان رسکن کی تصانیف کے مطالعہ ہی سے کارخانہ داری کی دنیا سے ان کا جی پھرا۔ جنوبی افریقہ کے قیام کے زمانے میں جس کام کا آغاز انہوں نے کیا تھا اُس کو دیکھ کر ٹالسٹائی نے گاندھی جی کو لکھا تھا کہ اِس وقت دنیا میں جتنے کام ہو رہے ہیں، اُن میں سب سے بڑا کام آپ کر رہے ہیں۔

گاندھی جی نے تمام مذاہب کی خوبیوں کو اپنا مذہب مانا تھا لیکن اُن برائیوں سے جو اُن مذہبوں کے ماننے والے مذہب کے نام پر پھیلاتے ہیں، ان سب سے اپنا دامن بچایا تھا۔ انہوں نے ایک ایسے عہد میں جنم لیا تھا جب کہ پوری دنیا کارل مارکس اور ڈارون کے نظریات سے متاثر تھی اور ان نظریات سے متاثر ہو کر مادیت کی طرف اندھا دھند قدم بڑھا رہی تھی۔ ماضی قریب میں تین عظیم شخصیتوں نے انقلاب برپا کر کے دنیا کی تاریخ کا دھارا ہی بدل ڈالا ہے۔ گاندھی جی، لینن اور سن یاٹ سن۔ لیکن ان تین عظیم شخصیتوں میں صرف گاندھی جی ہی نے مادیت کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ لینن اور سن یاٹ سن نے انسان کیا سوچتے ہیں اور کیسے جیتے ہیں، جیسی باتوں کے ذریعے انقلاب پیدا کیا۔ لیکن اکیلے گاندھی جی نے انسان کیسے سوچتے ہیں اور کیوں جیتے ہیں جیسی باتوں کے ذریعے انقلاب پیدا کیا ہے۔

گاندھی جی نے ہر ظلم اور ہر زیادتی کے لئے اہنسا یا عدم تشدد کے زبردست ہتھیار کو استعمال کرنے کا

پرچار کیا۔ نہ صرف پرچار کیا بلکہ اُس کو ہر طرح برت کر اور استعمال کر کے بھی دکھایا۔ اس موثر ہتھیار کو انہوں نے سب سے پہلے جنوبی افریقہ میں جنرل اسمٹس کی ظالمانہ حکومت کے خلاف بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا اور اس کے بعد انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی جنگِ آزادی میں پوری طرح برتا۔ خاص طور پر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب پر ایمان رکھنے والے، مختلف تہذیبیں برتنے والے، مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف نسل کے لوگ بستے ہیں اور جو ہر قسم کے تعصبات سے بے طرح چمٹے ہوتے ہیں، وہاں ایسے ہی فلسفۂ حیات پر عمل کر کے پُر امن تعلقات باہمی کی عملی صورت ممکن ہے اور اسی کے ذریعے اس ملک میں خود جیا جا سکتا ہے اور دوسروں کو جینے دیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی غلامی کے دور میں اور اس کے بعد آزادی کے دور میں اور بھی زیادہ شدت سے ہمارے فرقہ وارانہ فسادات ہمارے لسانی جھگڑے اور ہر طرف پھیلی ہوئی خود غرضی بس گاندھی جی کے فلسفۂ حیات ہی کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فلسفے پر ایمان نہ لا کر ہی ہم اس کے یہ بھیانک نتائج و عواقب بھگت رہے ہیں۔

گاندھی جی نے اہمسا یا عدم تشدد کا پرچار ایک ایسی دنیا کے سامنے کیا جس کی بنیاد ہی تشدد پر رکھی گئی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کی جنگ کی جس پُر امن طریقے پر انہوں نے قیادت کی اور جس طرح لہو کی ایک بوند بہائے بغیر ہندوستان دنیا کی عظیم ترین سلطنت کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔ اس نے دنیا کی بڑی بڑی فوجیں اور زبردست ہتھیار رکھنے والوں کے سامنے ایک عجیب سوال لا کھڑا کیا۔ اب تک دنیا اسی کو طاقت ور مانتی آئی تھی جس کے پاس بڑی بڑی فوجیں اور مہلک ترین ہتھیار ہوں۔ لیکن ہندوستان میں کئے جانے والے اس تجربے کے بعد دنیا عدم تشدد کے بل پر کمزوروں اور بے ہتھیاروں میں پیدا ہونے والی اس عجیب طاقت کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ فوجوں اور ہلاکت آفریں ہتھیاروں کے بل پر لڑائیاں اور تباہیاں دنیا نے بہت دیکھ لیں۔ اب اگر ایٹم بم اور ہیڈروجن بم کی بے پناہ تباہ کاریوں سے ڈری سہمی انسانیت کو جینا اور جینے کے طریقے سے جینا ہے تو اسے بس اہمسا یا عدم تشدد سے پیدا ہونے والی طاقت اور اسی طاقت کے بل بوتے پر پھیلنے والے امن و امان اور آشتی ہی کو آزما دیکھنا ہوگا۔ ایشیائی ملکوں کی کانفرنس میں (۲۵) ایشیائی ملکوں کے نمائندوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا کہ اگر آپ مغربی ملکوں کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں تو یہ پیغام صرف محبت ہی کا ہونا چاہیئے۔ یہ پیغام بس صداقت ہی کا ہونا چاہیئے۔ بقول شاعر ؎

"اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے!"

گاندھی جی صرف مذہبی آدمی ہی نہ تھے، وہ صرف سماج سدھارک ہی نہ تھے۔ وہ ان دونوں باتوں کے علاوہ بہت بڑے سیاست داں بھی تھے۔ اپنے کاموں میں انہوں نے مذہب، سماج اور سیاست کا تانا بانا کچھ اس طرح جوڑا تھا کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہی نہیں نا ممکن ہے۔ سیاست اور سماج کو دین سے جدا کر دیا جائے تو بقول علامہ اقبال بس چنگیزی ہی باقی رہ جاتی ہے۔ گاندھی جی اس بات کو دل سے مانتے تھے۔ لیکن دین سے وہ کسی ایک دین یا دھرم کی برتری ہرگز مراد نہ لیتے تھے، بلکہ وہ حق کو، صداقت کو تمام ادیان میں مشترک سچائی کو دین اور دھرم مانتے تھے۔ سیاست میں بھی گاندھی جی نے حق و صداقت ہی کو اپنے سامنے رکھا۔ وہ سیاست کی ایسی دنیا میں حق و صداقت کو لے کر اُٹھے تھے جس میں ڈپلومیسی یا عیاری یا ابلہ فریبی ہی سب سے بڑی کامیابی مانی جاتی ہے۔ اس کے لئے بڑی مردانگی اور ہمت کی ضرورت تھی۔ گاندھی جی کو خدا نے ایسی ہی مردانگی اور ہمت عطا کی تھی۔

گاندھی جی نے اہنسا یا عدم تشدد اور صداقت کی باتیں صرف ہندوستان کے سامنے ہی نہیں رکھیں۔ اُنہوں نے پوری کو یہ پیغام دیا کہ عدم تشدد اور انسانیت کا اور تشدد پھاڑ کھانے والے درندوں کا مذہب ہے۔ یہی صداقت تمام مذاہب کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ لیکن اس بات پر پکا ایقان پیدا کرنے والے اور اس کو عمل کے میدان میں آزما کر دکھانے والے کی سب کو ضرورت تھی۔ گاندھی جی نے اسے عمل کے میدان میں آزما کر دکھایا اور اس پر سچا ایقان پیدا کرنے میں اپنی پوری زندگی بسر کر دی۔

یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کو ہماری قوم نے اپنا باپو بابائے قوم اور دنیا نے انہیں عالمی خدمت گار اور عالمی قائد مانا۔ ہر ملک نے اپنا محترم جانا اور اُن کی تعلیمات اور ان کی خدمات کو استحسان کی نظر سے دیکھا۔ ہماری قومی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بدلنے اور سُدھارنے میں گاندھی جی کا ہاتھ نہ رہا ہو۔ اِس لئے گاندھی جی کی ولادت کے صد سالہ جشن سال گرہ کے موقع پر ذرا ہم اپنے دلوں کو بھی ٹٹول کر دیکھیں کہ ہم نے اپنی قومی زندگی کو کس حد تک اپنے بابائے قوم کے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ گاندھی جی کا نام لینا، انکے اصولوں کی سوگند کھانا بہت آسان ہے لیکن ان کے اصولوں کو اپنانا اور اُن پر عمل کرنا بڑی جان ماری کا کام ہے۔ ہماری قومی بے حسی، بے ایمانی، خود غرضی اور بغض و عناد کے موجودہ دَور میں یہ بات کس سے کہی جائے کہ نمائشی طور پر رسماً اور اوپری دل سے قدم قدم پر گاندھی جی کے مجسّمے کھڑے کرنے، ہر ادنیٰ و اعلیٰ سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں ہر جگہ ان کی تصویریں آویزاں کرنے، اُن کے نام پر شاہراہوں اور محلوں کے نام رکھنے، معمولی سے لے کر اعلیٰ تعلیمی اداروں، حد یہ کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور گھٹیا سے گھٹیا صنعتی اور تجارتی مرکزوں کو اُن کے نام سے نسبت دینے، اُن کی یادگار میں ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کی بجائے صدق دل سے گاندھی جی کی تعلیمات پر عمل بڑی بات ہے۔ ہماری قوم کا بھی عجیب حال ہے۔ اچھی سے اچھی بات، اچھے سے اچھے اصول، بڑی سے بڑی صداقت اور عظیم سے عظیم حق کو ہم ایک کھیل تماشا اور ایک رسم کی صورت نہایت اطمینان کے ساتھ دے دیتے ہیں۔ گاندھی جی عمر بھر مذہبی منافرت اور عناد کے خلاف لڑتے رہے اور اسی کے لئے انہوں نے اپنی جان تک قربان کر دی۔ اِدھر ہم نہایت فخر کے ساتھ گاندھی جی کے پجاری بنے بڑی شدّت کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات برپا کرتے ہیں۔ اپنی ماؤں بہنوں کی عصمت دری کرتے ہیں۔ اپنے بھائیوں کو قتل کرتے ہیں۔ قومی سرمایہ کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بناتے ہیں۔ بہیمیت اور بربریّت کا کونسا فعل ایسا ہے جس کو ہم نے اُٹھا رکھا ہے۔ انسانیت کا کون سا ننگا ناچ ہے جس سے ہم نے پرہیز کیا ہے۔ گاندھی جی نے آپسی نفاق مٹانے اور قومی یکجہتی پیدا کرنے، ہندی اور اُردو کا جھگڑا مٹا کر دونوں زبانوں کی خوبیوں سے آراستہ "ہندوستانی" ۔۔ جس میں نہ عربی کے بوجھل اور ثقیل لفظ ہوں اور نہ سنسکرت کے ادق اور کٹھن شبد ہوں ۔۔ ایک کُل ہند، عام فہم، عوام کی سمجھ میں آنے والی ایک قومی زبان کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانا چاہتے تھے مگر ہم، گاندھی جی کے نام لیوا، ہر بات میں ان کی دُہائی دینے والے، کھدر اور گاندھی ٹوپی پہنے، اقتدار کی اُونچی سے اُونچی کرسی پر بیٹھے قومی یکجہتی کے نام پر ہندی اور شُدھ ہندی کو عوام پر مُسلّط کرنے سے ذرا بھی نہیں شرماتے۔ ہم صوبہ واریت کے جنون میں دیوانگی کی حد تک پہنچے۔ گاندھی جی کی جے پکارتے کونسا تشدد ہے جس سے باز آئے ہیں۔ ان سب باتوں کے ساتھ ہم گاندھی جی کی ذات پر فخر اور انتہائی فخر کرتے ہیں اور اُن کی ولادت کا سو سالہ جشن مناتے ہیں۔ غالب کو نذرِ عقیدت پیش

کرتے ہوئے ساحر لدھیانوی نے کتنی سچی لیکن کتنی تلخ بات کہہ گئے ہیں ؎

یہ جشن مبارک ہو، لیکن یہ حقیقت ہے — ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں
گاندھی ہو کہ غالب ہو، انصاف کی نظروں میں — ہم دونوں کے قاتل ہیں دونوں کے پجاری ہیں

ہماری قوم نے یہ سب ڈھونگ نہ کئے، بس گاندھی جی کی تعلیمات پر عمل کر لیا اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل نکلے تو یہی ان کی خدمت میں ہمارا سچا خراجِ عقیدت ہے۔ یہی اُن کی پکی، سچی اور دائمی یادگار ہے۔

گاندھی جی اپنے ملک کی جن بنیادوں پر تعمیرِ جدید کرنا چاہتے تھے اور جس راستے پر گاندھی جی اپنی قوم کو چلانا چاہتے تھے۔ چاہے ہمارا ملک ان بنیادوں پر تعمیر نو پائے یا نہ پائے؛ چاہے ان کی بے حس قوم اس راستہ پر چلے یا نہ چلے، گاندھی جی کی عظمت، اُن کی بڑائی اور حق پسندی اس سے بے نیاز ہے۔ ان کی عظمت اور ان کی بڑائی آنے والے زمانوں میں ہر ملک اور ہر قوم کے انسانیت دوستوں اور انسانیت کے سچے خدمت گذاروں کے دلوں میں اُجالا کرتی رہے گی اور ناامیدی کے اندھیرے میں ان کی شخصیت روشنی کے مینار کی طرح ان کو راستہ دکھاتی رہے گی۔

اسی لئے ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کی اس بھیانک رات کو جو تاریخ عالم کی ایک بڑی المناک اور ڈراؤنی رات تھی، جواہر لال جی نے بڑی بھرّائی اور درد میں ڈوبی آواز میں ریڈیو پر کہا تھا "دوستو اور ساتھیو! ہماری زندگی کی روشنی بجھ گئی اور اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے!" ناتھورام گوڈسے اور اس کے ہم خیال انسانیت دشمن سفاک اور شقی القلب انسانوں کے سوا یہ اکیلے نہرو جی کی آواز نہ تھی۔ یہ کروڑوں انسانوں کے دلوں کی آواز تھی۔ اُس وقت وہ ساری امیدیں جو ایک دنیا گاندھی جی کی ذات سے وابستہ کئے بیٹھی تھی، ناامیدی کے گہرے سمندر میں ڈوب گئی تھیں۔ دنیا کو راستہ دکھانے اور اس کو ناامیدی کے اندھیرے سے نکالنے کی جو توقعات گاندھی جی کی ذات سے وابستہ ہو گئی تھیں، سب پامال ہو گئیں۔ یہ توقعات اور یہ امیدیں اس لئے بھی پامال ہوئیں کہ امن، صداقت اور عدم تشدد کا دیوتا خود اپنے ہی ملک کے ایک بے درد، سیاہ باطن ظالم کے مذہبی جنون کی بھینٹ چڑھا۔ اسی مذہبی جنون کی قربان گاہ پر ذبح ہوا جس سے وہ لڑتا آیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی نہرو جی نے کہا۔ "میں نے ابھی کہا کہ روشنی بجھ گئی، لیکن میں نے غلط کہا۔ جو روشنی اس ملک میں چمکی تھی، وہ کوئی معمولی روشنی نہ تھی۔ جس روشنی نے اس دیس میں اتنے برسوں اُجالا کیا تھا، برسہا برس تک وہی روشنی اس دیس میں اُجالا کرتی رہے گی آنے والے ہزاروں برسوں تک چمکتی رہے گی۔ دنیا اس روشنی کو دیکھتی رہے گی اور ان گنت دل اس روشنی سے اُجالا پاتے رہیں گے، کیونکہ اس روشنی کے اندر ایک زندہ اور پائندہ صداقت تھی!" یہ اکیلے نہرو جی کی آواز نہ تھی، یہ آنے والی نسلوں کے ان گنت دلوں کی آواز تھی۔

شاید یہی بات تھی کہ گاندھی جی کے مارے جانے کے المناک حادثے پر پوری دنیا نے جس طرح ماتم کیا وہ دنیا کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ گاندھی جی کسی ملک کے فرماں روا، سربراہ یا صدرِ مملکت نہ تھے لیکن ان کے ماتم میں مجلسِ اقوامِ متحدہ کے مرکز پر اس مجلس کے تمام اراکین قوموں کے قومی پرچم سرنگوں کر دیئے گئے۔ حالانکہ اصولاً صرف کسی ملک کے فرماں روا، سربراہ یا صدرِ مملکت کی وفات پر اُس کے احترام میں ایسا کیا جاتا ہے۔ گاندھی جی تو بس ایک فقیر منش، بے لوث، بے ریا، مخلص خادمِ انسانیت تھے، اسی لئے پوری دنیا نے انھیں

اپنا قائد، اپنا رہنما اور اپنا مخدوم تسلیم کر لیا اور اُن کی یاد میں بے اختیار آنسو بہاتی رہی۔ آج تک دنیا کے مختلف ملکوں نے گاندھی جی کو جس جس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے دورِ حاضر میں شاید ہی کسی شخص کو ایسا خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہوگا۔

یاد کیجئے، آج سے سو سال پہلے وہی بچہ جو روتا بلکتا اِس دنیا میں آیا تھا اور اُس کے عزیز و اقارب خوش تھے، دنیا میں چھا گیا ایسا چھا گیا کہ ایک عالم کی آنکھوں کا تارا، سب کے من کا دُلارا بن کر جیا۔ اپنی زندگی سے مطمئن، اپنے کام پر خنداں و شاداں و فرحاں جب اس دنیا سے چلا تو ایک عالم کو اپنا سوگوار اور ماتم گذار چھوڑ چلا ؎

ہم چناں زی کہ وقت مردنِ تو　　ہمہ گریاں بوند و تو خنداں !

گاندھی جی کی شمعِ حیات گُل ہو گئی۔ اس شمع کو ایک عقل و خرد کے اندھے اور انسانیت کے دُشمن نے بُجھا دیا۔ وہ شمع بُجھ گئی لیکن اس شمع کی ضیا دنیا کے ہر انسانیت دوست اور حق پسند دل میں جگمگا رہی ہے اور ہمیشہ جگمگاتی ہی رہے گی۔ یہ عدمِ تشدد کی شمع تھی۔ یہ صداقت کی ضیا تھی۔ اہنسا کو کون جُھٹلا سکتا ہے۔ صداقت کو کون مِٹا سکتا ہے۔ یہ شمع لافانی ہے۔ یہ ضیا لافانی ہے۔ اِسے کون بُجھا سکتا ہے! جے اہنسا کی، جے حق اور صداقت کی، جے مہاتما گاندھی کی! ▲

---

## بقیہ "مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال"

ا کہا جائے۔ ایک ایسا مُلک نہ بنانا چاہیئے جہاں مسلمانوں کے لئے عزت کی زندگی ناممکن ہو جائے۔"

۸ اکتوبر کو لکھتے ہیں کہ "ہماری قوم پرستی اگر دونوں لپیوں کے سیکھنے سے گھبراتی ہے تو وہ بہت گھٹیا قسم کی قوم پرستی ہے۔"

بھاشا کے بارے میں اُن کے آخری بول ۸ دسمبر ۴۷ء کو ملتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"کیا اُردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کر کے میں کمتر درجے کا ہندو یا ہندوستانی ہو گیا۔ کیا وہ ایک اکھل بھارتی بھاشا کی سیوا کر سکتے ہیں۔ اگر اُردو لپی اور بھاشا کو اس سے نکال دیا جائے۔ میں ہمیشہ تو تمہارے پاس رہوں گا نہیں، مگر تم میرے رُخصت ہو جانے کے بعد میرے شبدوں کو یاد کرو گے۔"

اور اگلے مہینے ہی وہ رُخصت ہو گئے۔ اُنہیں کے ساتھ ہندوستانی بھی مر گئی۔ یہ مانا کہ آج بھاشا کی گتھی بہت اُلجھ گئی ہے۔ یہ اُردو، ہندی، ہندوستانی کا سوال نہیں، اب ہندی اور تامل، ہندی اور بنگالی، ہندی اور انگریزی کا سوال ہے۔ پھر بھی مُلک کی عام ایسی بول چال کی بھاشا کے بارے میں مَیں سوچتا ہوں تو باپو کے وچار آج بھی سولہ آنے کھرے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم یو۔ پی، بمبئی، آندھرا اور کشمیر وغیرہ کے بازاروں میں جس بھاشا سے اپنا کام چلاتے ہیں اُسے ہندی کہنا بھی جھوٹ ہے اور اُردو کہنا بھی غلط۔ وہ ہندوستانی ہے۔ بھاشا شاستر کے قاعدے سے اُردو ہندی کی تقسیم بالکل جھوٹی اور بے بنیاد ہے۔ بول چال کی بھاشا ایک اور ساہتیہ کی بھاشائیں دو، کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی طرح اِنہیں سمو کر ایک کر دیا جائے۔

آج ہمارے دیش کی بھاشائی گتھی سلجھانے کے لئے باپو کی کتنی ضرورت ہے۔! ▲

خواجہ عبدالغفور



# مہاتما گاندھی اور اُن کی خوش مذاقی

مہاتما گاندھی نہایت ہی سنجیدہ، خداترس اور مذہبی آدمی تھے۔ ان کی شخصیت اِس قدر ارفع و اعلیٰ تھی کہ لوگ از خود اُن کے سامنے سر جُھکایا کرتے تھے۔ حالانکہ اُن کی سادگی ان کا اخلاق و کردار اور ان کا رہن سہن ایسا تھا کہ غریب سے غریب آدمی کو بھی اُن میں اور خود میں کچھ فرق نہ دکھائی دے سکتا تھا۔ ہم نے اُن کی اس سادگی میں بھی وہ دبدبہ اور شان دیکھی ہے کہ جو بڑے سے بڑے فرمانروا اور حاکمِ وقت کے دربار میں بھی نہیں مل سکتی۔ اپنی سروس کے ابتدائی دَور میں چونکہ وردھا پر ٹھہرنے کا اکثر اتفاق ہوا کرتا تھا۔ پہلے سے حصول اجازت کے بغیر ہی ہم سیواگرام پہنچ جاتے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُس شرف سے محروم لوٹے ہوں جس کے لئے ہم وہاں پہنچ جایا کرتے تھے۔ اُن کی بات چیت کا موضوع کچھ اِس طرح ہوتا کہ وہ نوجوان عہدے داروں کے دل و دماغ پر یہ مُرتسم کر دیتے کہ باوجود برطانوی سامراج کے ماتحت ہونے کے بھی اپنے ملک اور اپنی قوم کی بھلائی اور مفاد کا خیال مقدّم ہونا چاہیئے۔ وہ کسی قسم کے باغیانہ خیالات کو اُبھارے بنا ہی اپنے حیطۂ اقتدار اور دائرۂ عمل میں اپنی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں لگانے کی سُوجھ بُوجھ بڑھاتے اور اپنی دل لبھانے والی باتوں سے نہ صرف شخصیت پر چھا جاتے بلکہ دل و دماغ پر بھی۔

اُن میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا تھا لیکن وہ بھی سنجیدہ اور اعلیٰ۔ وہ کسی کا دل دُکھائے بغیر لطافت و شیرینی پیدا کرتے اور تنقید و تعریض کے بغیر ہی بطورِ صلاح اور سوجھاؤ ہر ایک کی اصلاح کرتے جاتے۔

ان کا خود کا کہنا تھا۔ "اگر مجھ میں مزاح کا شعور یا لطافت و ظرافت کی حس نہ ہوتی تو میں دنیا بھر کے مخالفین کا مقابلہ کرتے کرتے از کار رفتہ ہو جاتا۔ میں تو ان سب کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ہنس سکتا ہوں کہ جو مجھ پر ہنستے ہیں۔ میری یہی صلاحیت تو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔"

ان کا مشاہدہ تھا کہ جب زندگی کلیوں کی طرح چٹک چٹک کر خوشبو پھیلاتی رہتی ہے یا چمن میں موسمِ بہار کے ساتھ پرندوں کے گیت اور نغمے اُبل پڑتے ہیں تو ہنسنا نہایت آسان ہے لیکن جب ہر طرف مایوسی ہو، مستقبل تاریک ہو، زندگی کا بہاؤ اُلٹی طرف کو جائے اور کوئی بات قاعدے اور قرینے سے نہ ہو تو ہنسنا اور خوش طبعی کا اظہار کرنا زندگی کا ایک کارنامہ ہوگا اور اِسی بات پر بالو عمل پیرا اور کاربند تھے۔ وہ بے شک محبّت، زندگی اور ہنسی خوشی کے مہاتما تھے۔

اُن کی صحبت میں ایسے لگتا کہ جیسے اُن کی آتما ساری فضا پر چھائی ہوئی ہے اور اس میں ہم بھی سموئے ہوئے

سے ہیں۔

گاندھی جی کی زندگی عوام الناس سے راست ربط رکھنے اور ان کی خدمت کرنے میں بیت گئی، اسی لئے تو دنیا بھر میں وہی ایک ایسی ہستی تھی کہ جن سے شخصی تعلقات کا ہر شخص سچا دعویٰ کر سکتا ہے اور بے شک وہی ایک ایسی عظیم ہستی تھے کہ جن کو تمام دنیا میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنے ملانے کا موقع حاصل رہا، اسی وجہ سے انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر طرح کے مسئلے مسائل سمجھنے کی اُن کی صلاحیت کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ان میں عوام الناس سے محبت اور ان کے لئے کارہائے نیک کرنے کا جذبہ اس قدر موجزن تھا کہ اسی سے دھوپ بھی ٹھنڈی چھاؤں میں تبدیل ہو جاتی۔ وہ اپنی مصروفیات اور ادائیگی فرائض کے ساتھ ساتھ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اُداس اور قنوطیت سے بھرے ماحول میں بھی خوشیاں بکھیرا کرتے۔ ان کا مزاج ہمہ گیر ہوتا اور وہ ہر ایک کو اُس میں شریک کر لیا کرتے۔ اُن سے جب کسی نے پوچھا تھا کہ وہ ہمیشہ ریل کے تیسرے درجے کے ڈبے میں کیوں سفر کرتے ہیں تو اُنہوں نے نہایت ہی سادگی سے جواب دیا تھا۔ "اس لئے کہ ریلوے میں کوئی چوتھا درجہ نہیں"۔ اور یہ بات تو حاضر جوابی، حاضر دماغی اور شگفتہ مذاق اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اِسے فنِ مزاح کی ہر کتاب کا جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔

جب مہاتما گاندھی یورپ کے سفر کے دوران پیرس پہنچے تو کسٹم والوں نے اُن کا سامان دیکھنا چاہا۔ اِس پر اُنہوں نے اپنا زادِ راہ بتاتے ہوئے کہا "میرے پاس یہ چرخہ ہے، کھانے کے برتن ہیں، بکری کے دودھ کے ڈبے ہیں۔ ہاتھ کے بُنے ہوئے تولیے اور دھوتیاں ہیں اور اِس کے علاوہ میری اپنی شخصی شہرت ہے جس کی آپ کے پاس کچھ بہت زیادہ مالیت نہیں ہو سکتی۔"

مہاتما گاندھی اپنی صحت اور تندرستی کو قدرتی طریقوں سے قائم رکھنے کے قائل تھے۔ اُن کی بیماری میں ڈاکٹر نے پینسلین کا انجکشن دینا ضروری سمجھا اور کہا۔ "آپ یہ انجکشن لگا لیں گے تو تین ہی دن میں اچھے ہو جائیں گے ورنہ تین مہینے لگ جائیں گے"۔ گاندھی جی نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے مجھے کون سی جلدی ہے"۔ ڈاکٹر نے اصرار کے طور پر کہا" اور جو اس بیماری کے جراثیم آپ پھیلا دیں گے"۔ گاندھی جی نے خوش طبعی سے کہا۔ "تب تو آپ یہ انجکشن اور سبھوں کو لگا دیجئے۔"

گاندھی جی جب گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن پہنچے تو ایک برطانوی اخبار کے نمائندے نے بطور طنز اُن سے سوال کیا۔ "ہندوستانیوں نے آپ کو اپنی نمائندگی کے لئے کیوں منتخب کیا ہے؟ کیا آپ سے بہتر نمائندہ اُنھیں نہیں مل سکتا تھا۔"

یہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس کر بولے۔ "شاید یہ بات ہو کہ اُن کے خیال میں مجھ جیسا کم عقل آدمی ہی برطانیہ کے مقابلے میں بھاری ہو سکتا ہے۔"

گول میز کانفرنس سے واپسی پر لارڈ ولنگڈن نے ظاہرداری کے طور پر گاندھی جی کا استقبال کیا۔ حالانکہ پنڈت نہرو اور سرحدی گاندھی کو حراست میں لے لینے کے احکام لارڈ ولنگڈن جاری کر چکے تھے۔ جب یہ بات گاندھی جی کو معلوم ہوئی تو اُنھوں نے بڑی پتے کی بات کہی۔ "یہ ہمارے عیسائی وائسرائے کے کرسمس کے تحفے ہیں۔"

کسی انگریز نے اُن سے رسماً پوچھا۔ "آپ کے خاندان کا کیا حال ہے؟" گاندھی جی نے فوراً جواب دیا۔ "میرا خاندان (یعنی ساری ہندوستانی قوم) بدحال ہے۔"

۱۹۳۱ء میں ریمزے میکڈانلڈ گاندھی جی سے بات چیت کرنے آئے اور اتفاقاً اسی وقت ڈاکیہ بھی اُن کے نام

کے خطوط لے کر پہنچا تو انہوں نے لفظی و معنویت کے اعتبار سے کہا "میں Man of letters سے پہلے ملنا چاہوں گا۔ سیاست داں تو انتظار کر سکتے ہیں۔ فی الحقیقت تو وہ ہمیشہ انتظار ہی کیا کرتے ہیں"

لارڈ مونٹ بیٹن کا بیان ہے کہ جب شہزادہ فلپس کی منگنی شہزادی الزبتھ سے طے ہوئی تو گاندھی جی بہت خوش ہوئے اور اُن کو خط میں لکھا "آپ کے بھتیجے کی شادی انگلستان کی ہونے والی ملکہ سے قرار پائی ہے، اس کی مجھے بے حد خوشی ہے۔ اس مبارک موقع پر میں شادی کا تحفہ دینا چاہوں گا لیکن یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ میرے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے۔ میں انہیں کیا دے سکتا ہوں؟" مونٹ بیٹن نے انہیں جواب دیا "آپ کے پاس بے شک کچھ نہیں، لیکن چرخہ تو ہے۔ بس اسی کو کمر کمر اُیے اور اُن کے لئے کچھ بُن ڈالئے" گاندھی جی کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور انہوں نے ایک خوبصورت میز پوش تحفے میں دیا۔ اسی واقعے کو پرنس آف ویلز نے گاندھی صدی کے لندن والے جشن میں نہایت ہی پُر محبت الفاظ میں دُہرایا ہے۔

گاندھی جی لندن میں جب مقیم تھے تو چارلی چپلن اُن سے ملنے گئے۔ باپو اُن سے بالکل واقف نہ تھے اور انہوں نے پوچھ ہی لیا کہ یہ ممتاز شخصیت کون ہے۔ جب اُن دونوں کا تعارف ہوا اور بات چیت شروع ہوئی تو کہا جاتا ہے کہ گاندھی جی اُس مشہورِ عالم مسخرے کو سارا وقت ہنساتے ہی رہے۔

پونا میں آغا خاں کے محل سے نظر بندی سے چھوٹنے پر پنڈت مالویہ جی نے مہاتما گاندھی کو مبارکباد کا تار بھیجا اور لکھا:

"خدا سے قوی توقع ہے کہ آپ سو سال تک جئیں گے۔ مادرِ وطن اور بنی نوع انسان کی خدمت کرتے رہیں گے"۔

گاندھی جی ہمیشہ کہا کرتے تھے اور ان کو ایسی اُمید بھی تھی کہ وہ ایک سو پچیس سال کی عمر تک زندہ رہیں گے۔

اس تار کے ملنے پر انہوں نے جواب دیا۔

"یہ یک جنبشِ قلم آپ نے میری متوقع عمر سے پچیس سال گھٹا دیئے ہیں۔ اب جو ایسا کیا ہی ہے تو یہ پچیس برس آپ خود اپنی عمر میں اضافہ کر لیجئے"۔

گاندھی جی کی سالگرہ کے موقع پر اُن کے ماتھے پر ٹیکا لگاتے ہوئے سروجنی نائیڈو نے خوش مذاقی سے یہ فقرہ کسا "آج تو گاندھی جی آپ دُولہا دکھائی دیتے ہیں" باپو بھلا کہاں چوکنے والے تھے۔ انہوں نے نہایت ہی برجستگی سے کہا "تم دُلہن جو ساتھ میں ہو"۔

گاندھی جی کی لاکھوں خصوصیات ہیں۔ ان کا احساس پابندئ وقت بہت تیز تھا۔ انہوں نے ایک بار اپنے پوترے کانتی لال سے وقت پوچھا۔ اس نے یوں ہی کہہ دیا "پانچ بجے ہیں" ان کی نظر جو گھڑی پر پڑی تو انہوں نے دیکھا کہ پانچ میں ایک منٹ کم تھا اور اُن کے پوترے نے اس فرق کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ بہت بُرا مانتے ہوئے بولے "اگر وقت کا پُورا پُورا احساس نہ ہو تو گھڑی رکھنا بیکار اور لاحاصل ہے"۔ اور پھر اس طرح وضاحت کی "اگر پورے دیس کے ۳۰ کروڑ آدمی اس طرح ہر ایک منٹ کو نظر انداز کر دیا کریں تو قومی زندگی میں سے ۳۰ کروڑ منٹ ضائع ہو جائیں گے اور یہ ایک بڑا سانحہ ہوگا قومی زندگی کا، اور پھر ہمارے غریب دیس میں تو اتنا سارا وقت تو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے"۔

مہاتما گاندھی نے اس تلخ حقیقت کو شدت سے محسوس کیا تھا کہ ہندوستان کے ۹۰ فی صد لوگ اتنی غریبی میں گذران کرتے ہیں کہ ان کو جسم ڈھانکنے کے لئے کپڑا بھی میسر نہیں ہوتا، اسی لئے انہوں نے گاندھی ٹوپی کو رواج دیا کہ کم قیمت میں سر ڈھانکنے کا سامان تو ہو اور پھر اسی احساس کے تحت انہوں نے خود بھی جسم کے اوپری حصّے کو ڈھانکنے کے لئے قمیص یا کرتے کا پہننا بالکل ترک کر دیا تھا۔ یہ کسی مدرسے میں ایک معمولی سی دھوتی اور کھلے بدن کے ساتھ گئے تو ایک امیر گھرانے کے لڑکے نے ان سے سوال کیا..

"آپ ہم سب کی طرح قمیص یا کرتا کیوں نہیں پہنتے ؟"

اور پھر اُس نے خود ہی اپنی ماں سے مانگ کر ایک قمیص لا کر دینے کی پیشکش کی۔ گاندھی جی بے اختیار مسکرا اُٹھے اور نہایت ہی تحمّل اور متانت سے بولے "بیٹا میں ضرور قمیص پہن لیتا مگر تم جانتے ہو کہ میں ہی ایک ایسا شخص نہیں کہ جس کے بدن پر قمیص نہیں، اور بھی ۳۰/۳۵ کروڑ بھائی ایسے ہیں کہ جن کو تن کا کپڑا نصیب نہیں کیا تمہاری ماں اُن سب کے لئے یہ مہیا کر سکیں گی" ؟

وردھا کے منگلواڑی آشرم کے باورچی خانے کے برتن دھونے کے فرائض گاندھی جی کے ذمے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر جے سی کماریّا ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ جب یہ دونوں مصروفِ کار تھے، کستوربا آئیں اور اُن سے یہ دیکھا نہ گیا کہ مہاتما گاندھی کا قیمتی وقت ایسے فضول کام میں ضائع ہو، اِس لئے اُنہوں نے برتن ان کے ہاتھ سے چھین لئے اور کہا "آپ جا سکتے ہیں، میں یہ کام کر دوں گی"۔ اس پر گاندھی جی نے کماریّا کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا "کماریّا تم بڑے خوش قسمت آدمی ہو کہ تم پر اس طرح حکومت کرنے کے لئے تمہاری بیوی ہیں ہی نہیں۔ مجھے اپنا گھریلو امن برقرار رکھنے کے لئے کستوربا کا حکم ماننا ہی پڑے گا"

چمپارن میں کالی ماتا کی پوجا کے موقع پر آس پاس کے گاؤں والوں نے بکرے کی قربانی کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ گاندھی جی وہاں پہنچے تو یہ جان کر اُن کو بڑا دکھ ہوا۔ انہوں نے دریافت کیا "بکرے کو قربانی کے طور پر کیوں دیا جا رہا ہے ؟" لوگوں نے بتایا کہ کالی ماتا کو خوش کرنے کے لئے یہ قربانی دی جا رہی ہے۔

اس پر باپو نے اپنے مخصوص مدبّرانہ انداز میں ارشاد فرمایا "اگر ماتا کی خوشنودی ہی مقصود ہے تو بکرے کے بجائے آدمی کی بھینٹ زیادہ موزوں رہے گی۔ آدمی تو بہرحال بکرے سے بہتر اور اعلیٰ مخلوق ہے" اور پھر باپو نے کہا "اگر آپ سب راضی ہوں تو میں اس قربانی کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں"

اس خلوص و محبت کے جذبات کے ساتھ پیش کیا ہوا استدلال اس قدر موثر ثابت ہوا کہ سبھوں نے جاندار کی قربانی سے پرہیز کرنے کا وعدہ کیا۔

۱۹۳۶ء میں سر سی وی رامن کی موجودگی میں سوئٹزرلینڈ کے کسی سائنس دان نے مہاتما گاندھی کے سامنے ایک سوال رکھا "لامذہبیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور ہم میں یک جہتی اور اتفاق عنقا ہوتے جا رہے ہیں ایسی صورت میں لامذہبیت کا کسی نہ کسی طرح مقابلہ کیا جانا چاہیئے ؟" رامن نے جواب دیا "اگر خدا ہے تو پھر ہم اس کو کائنات کی لامحدود وسعتوں میں سے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے اور اگر ان فضاؤں میں خدا ہے ہی نہیں

زبانیں، اپنے اپنے طور پر اس مسئلے کے حل کی دعویدار تھیں لیکن لارڈ میکالے نے ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے انگریزی کے رواج پر زور دیا جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ ایسے ہندوستانی پیدا کئے جائیں جو اپنے خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں لیکن جو اپنے مذاق، خیالات، اخلاق و عادات اور ذہنی اعتبار سے انگریز ہوں۔ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جس طریقۂ تعلیم کو اپنایا گیا وہ طریقۂ تعلیم ہندوستان میں آج بھی رائج ہے۔ چنانچہ اسکولوں میں علاقائی زبانیں اور یونیورسٹی میں انگریزی ذریعۂ تعلیم اسی کی یادگار ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہندوستان کی کوئی زبان عام افہام و تفہیم کی یا رابطے کی زبان کی حیثیت سے استعمال نہیں ہوتی لیکن اسی عہد میں اُردو نے ایک ہندوستان گیر زبان کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور جو انیسویں صدی کی سب سے اہم اور عام بول چال اور تعلیم اور انتظامی اُمور میں کام آنے والی زبان تھی۔ یہاں تک کہ پنجاب کی فتح کے بعد انگریزوں نے فارسی کی بجائے اُردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے فروغ دیا جو اپنے لسانی رُجحان کے اعتبار سے ہندوستان کے لئے رابطے کی زبان بننے کی نہ صرف صلاحیت رکھتی تھی بلکہ جو اپنی صلاحیتوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں منوا چکی تھی۔ اگر ایک طرف اُردو عدالت، انتظامیہ اور فوج کی زبان تھی تو دوسری طرف یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش میں ہندوستانی کی مختلف ذیلی بولیوں مثلاً اودھی، برج اور میتھلی وغیرہ میں ادب تحریری صورت میں آرہا تھا۔ اسی طرح ہندی زبان جس کی اصل کھڑی بولی ہے۔ تجارت اور دھندے بیوپار میں استعمال ہوتی تھی۔ یہ کھڑی بولی اُردو کی بھی اصل اور بنیاد ہے جو دوآبہ میں پھیلی پھولی اور پھر اپنے علاقے سے باہر شہری آبادی کی کثیر الاستعمال زبان بنی۔ انگریزی بھی تعلیم یافتہ حضرات میں ابلاغ و ترسیل کی زبان کی حیثیت سے بولی اور سمجھی جاتی تھی، لیکن عام جنتا کے لئے ہنوز یہ بدیسی زبان ہی رہی اور اس طرح جنتا اور تعلیم یافتہ حضرات میں ایک خلیج حائل رہی لیکن پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب آزادی کی تحریک عوام میں پہنچی تو انگریزی کی جگہ ہندوستانی نے لے لی جو اُردو اور دیوناگری دونوں لکھاوٹوں میں لکھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں انگریزی کو بھی پوری طرح نظر انداز نہیں کیا گیا اور دوسری ہندوستانی زبانیں بھی اپنے اپنے لسانی، علاقائی، مذہبی اور ادبی پس منظر میں ترقی کرتی رہیں لیکن اسی دوران میں سیاسی تحریکات کے زیرِ سایہ قوم اور جماعت کے تصور کو ہم معنی قرار دے کر ہندو اور مسلمانوں میں فرقہ واریت کا بیج بویا گیا جو لسانی و ادبی سطح پر ہندی اُردو کی فرقہ وارانہ تقسیم میں تبدیل ہو گیا جب کہ انیسویں صدی کے سب سے بڑے ہندوستانی کے شاعر غالبؔ نے اپنی زبان کو ہندی اور اُردو کو مترادفات کی صورت میں اپنے ادبی پرستاروں کے سامنے پیش کیا تھا۔ ہندی کے ادیبوں اور پرستاروں نے 'ہندوستانی' جیسی ہندوستان گیر زبان کو ماننے سے انکار کر دیا تو دوسری طرف سیاست دانوں نے بھی اُن کی حمایت کی اور بول چال کی عام ہندوستانی کی جگہ بلا ضرورت اُسے سنسکرت کے تت سم شبدوں سے بوجھل بنانے کی کوشش میں ایک ایسی مصنوعی زبان کا مرکب تیار کیا جو عرفِ عام میں تو ہندی کہلاتی ہے لیکن جو متحدہ ہندویت کی سب سے بڑی دشمن ثابت ہوئی۔ اور جس کو قومی زبان کی حیثیت سے قبول کرنے میں جنوبی ہند اور بنگال پس و پیش کرتے رہے۔ دوسری طرف اُردو کے چند پرستاروں نے اسے فارسی عربی اسلوب اور انتخاب الفاظ پابند کر کے ہندوستانی کے سرچشمے سے الگ کرنے کی کوشش کی اور گو اس نے آزادانہ ایک ادبی زبان کی حیثیت سے ترقی کی، پھر بھی مجموعی حیثیت سے اس نے عام ہندوستانی کے دھارے سے اپنے آپ کو الگ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سنسکرت کے شبدوں کے

ساتھ بہت کھلے طور سے انگریزی، فرانسیسی اور پرتگالی لفظوں کو بھی اپنایا گیا۔ چنانچہ عام بول چال میں، فلموں میں، عوامی جلسوں میں اور کالج اور یونیورسٹی کیمپس میں یہی زبان بولی جاتی ہے۔ یہ زبان مختلف لسانی ریاستوں میں، ریاستی زبانوں سے بھی متاثر ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ مہاراشٹر میں مراٹھی، گجرات میں گجراتی، پنجاب میں پنجابی اور بنگال میں بنگالی وغیرہ کے اثرات بھی اس پر مرتسم ہیں اور آئندہ چل کر ہندوستانی مختلف علاقائی زبانوں کے اثرات کے تحت ہی پہچانی جائے گی۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی سرکاری زبان دیوناگری لکھاوٹ میں ہندی قرار پائی اور مختلف ریاستوں کے لئے علاقائی زبانوں کی اہمیت تسلیم کی گئی لیکن عملی طور سے انگریزی کو اس وقت تک کے لئے سرکاری زبان کا رتبہ دیا گیا جب تک کہ ہندی اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ انگریزی کی حیثیت حاصل کر لے۔ ادھر ہندی کے پرچار کے سلسلے میں بڑے زور و شور سے تحریکیں چلیں اور تعلیمی اداروں میں اسے لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جانے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی ایک کثیر تعداد نے سیکھ لی اور اس طرح اسے قومی زبان کی حیثیت دینے کے لئے ہندی کو تیار کیا گیا۔ ہندی تحریک کی ابتدا ہی سے وہ اردو کو اپنا مدّمقابل سمجھتی رہی۔ اب حکومت کے زیر سایہ ہندی ترقی کرتی گئی اور اردو کو خود اپنے علاقوں میں ذریعۂ تعلیم اور دیگر حیثیتوں سے بھی پس پشت ڈالا گیا۔ اردو کے علاقے یوپی، بہار، مدھیہ پردیش وغیرہ میں اس غریب پر جو گذری وہ زبانوں کی تاریخ میں سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس بے دردی سے دنیا میں شاید ہی کسی دوسری زبان کو دانستہ کچلنے کی کوشش کی گئی ہو اور یہ سب کچھ تعصب، منافرت اور احساس کمتری میں کیا گیا۔ گو ہندی کے ترقی کرنے کے لئے پورے وسائل کام میں لائے گئے پھر بھی جیسا کہ ماقبل السطور میں بیان ہو چکا ہے۔ ملک کے متعدد حصوں میں ہندی استعماریت کے خوف سے اس کے خلاف مظاہرے ہوئے اور لوگوں نے احتجاجاً اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ جنوب اس تحریک میں سب سے آگے تھا۔

اگرچہ ہندوستان میں ہندی سب سے زیادہ بول چال کی زبان بنی، تاہم یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ۱۶۷ زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں اور ملک کی آبادی کا ایک خاصہ بڑا طبقہ ۱۴ زبانیں بولتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ہندی علاقوں میں ہندی پرچار مشکل ہو گیا ہے اور نتیجتاً جنوب میں نئی سیاسی پارٹی ڈی۔ ایم۔ کے وجود میں آئی، جسے آہنی عزم و ارادہ سے جنوب میں ہندی کے پنپنے کے سارے امکانات پر گہری ضرب پڑی۔ دوسری طرف بنگال میں ہندی کی راشٹر بھاشا کی حیثیت کی مخالفت کی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۵ء کا لینگویج کمیشن بھی کسی متفقہ نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ ان ساری باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۸ء میں انڈین نیشنل کانگریس کو یہ ریزولیشن پاس کرنا پڑا کہ انگریزی ۱۹۶۵ء تک سرکاری زبان کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہے گی اور انگریزی کی یہ حیثیت اس وقت تک رہے گی جب تک کہ ہندی کو سارا ہندوستان بخوشی قبول نہ کر لے۔ ۱۹۶۳ء میں جب سرکاری زبان کا بل پاس ہوا تو ہندی کے شیدائیوں نے اس بل کی کاپیاں نذر آتش کیں اور ڈی۔ ایم۔ کے اور سوتنترا کے ممبروں نے ہندی کی سختی سے مخالفت کی اور اس طرح پھر انگریزی کو کئی ممبران اور ملک کے ایک کثیر طبقے کی حمایت حاصل ہو گئی۔

متذکرہ بالا ہندوستانی زبانوں کے پس منظر میں اور قومی زبان کے پیش نظر ماہرین کے لئے ایک اور مسئلہ پریشان کر رہا تھا جو لکھاوٹ کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان کی اہم زبانوں کی اپنی لکھاوٹیں ہیں مشترکہ لکھاوٹ شاذ و نادر ہی ہے۔ ہندی اور مراٹھی دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہیں۔ بنگالی اور آسامی کے رسم خط میں بڑی مشابہت ہے۔ دراوڑی زبانوں کے رسم الخط میں بھی مشترک عنصر زیادہ ہے۔ گجراتی رسم خط دیوناگری سے مشابہ ہے اور اردو، سندھی اور کشمیری فارسی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اور گوا کی کوکنی اور کھاسی زبانوں نے عیسائی مشنریوں کے زیر اثر لاطینی یا رومن لکھاوٹ کو اپنا لیا ہے لیکن ہندوستانی سیاست دانوں، ماہرین زبان اور عوامی خدمت گاروں میں کچھ تو ساری زبانوں کے لئے مشترکہ لکھاوٹ کی سفارش کرتے ہیں۔ ایک گروہ دیوناگری کو ترجیح دیتا ہے تو دوسرا رومن لکھاوٹ کو۔ ۱۹۶۱ء میں دلی میں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں بھی جذباتی اور قومی یکجہتی کے پیش نظر ہندوستانی زبانوں کے لئے مشترکہ لکھاوٹ کی قرارداد کو منظور کر لیا تھا لیکن ایک گروہ مشترکہ لکھاوٹ کو قومی و جذباتی ہم آہنگی میں سب سے بڑی رکاوٹ خیال کرتا ہے۔ تو عام طور سے مشترک لکھاوٹ کی حیثیت سے دیوناگری کو عام تائید حاصل ہے تاہم غیر ہندی علاقے دیوناگری سے بہت خوش نہیں ہیں۔ اسی طرح رومن لکھاوٹ بھی سب کے لئے قابل قبول نہیں۔

ڈاکٹر کنہیا لال منشی نے سفارش کی تھی کہ ہندوستانی کے لئے دیوناگری اور اردو دونوں لکھاوٹوں کو اپنایا جائے۔ ڈاکٹر پی۔ سبرائن، سردار حکم سنگھ اور فرینک انتھونی نے ہندی یا ہندوستانی کے لئے لاطینی لکھاوٹ کی سفارش کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ فوج میں اردو کی کتابیں رومن لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہیں لیکن الگورائے شاستری، این۔ وی۔ گاڈگل اور ایل۔ این ساہو نے رومن لکھاوٹ کی مخالفت کی۔ پرشوتم داس ٹنڈن نے یہ کہہ کر کہ سر اسحاق پٹمن نے کہا تھا کہ "دیوناگری لکھاوٹ سب سے مکمل ہے اور انگریزی حکومت رومن کے مقابلے میں دیوناگری کو پسند کرتی ہے، رومن لکھاوٹ کی مخالفت کی۔ آینگر فورمولے میں صرف دیوناگری لکھاوٹ کا ذکر ہے۔ مولانا آزاد نے رسم الخط کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کیا اور کہا کہ دو لکھاوٹیں کٹھنائیوں کا باعث ہوں گی اور دیوناگری لکھاوٹ ہی کی وکالت کی اور یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ حکومت کے (Notifications) دیوناگری اور اردو دونوں لکھاوٹوں میں شائع کئے جائیں۔

(۴)

ہندوستان کے لئے قومی زبان کے مسئلے میں دیگر قومی مسائل کی طرح جتنے بھی افکار اور نقطۂ نظر پیش کئے گئے ہیں ان میں ابہام، الجھن اور غیر واضح طریقۂ فکر کو بڑا دخل رہا ہے۔ خود ہندوستانی کے بارے میں جو گاندھی جی کو راشٹر بھاشا کی حیثیت سے بہت عزیز تھی اور جو حقیقتاً ہندوستان کے قومی زبان کے مسئلے کا خوبصورت، پُرخلوص حل تھا۔ گاندھی کے رفقا میں بھی وقت کی تبدیلی کے ساتھ 'ہندوستانی' کے اپنانے کے سلسلے میں، تبدیلی پیدا ہوتی رہی۔ گاندھی جی ابتدا ہی سے ہندوستان کی قومی وحدت، جذباتی ہم آہنگی اور ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے نقیب تھے اور اپنے اس نظریے اور آدرش کی بنا پر ہندو اور مسلمان سبھی سے لڑتے رہے اور اسی لڑائی میں آخر کار اپنی جان بھی تج دی۔ ہندوستان کے لئے قومی زبان کے بارے میں بھی وہ اپنے اسی قومی و جذباتی ہم آہنگی اور ہندو مسلم اتحاد کے پیش نظر ابتدائے بیسویں صدی ہی سے ہندوستانی کے پیغامبر

رہے اور جب اُردو اور ہندی کے ماننے والوں نے اپنی اپنی زبان کے لئے شدت اختیار کی تو ایسی صورت میں بھی گاندھی جی ہر آن 'ہندوستانی' ہی کی وکالت کرتے رہے اور ہندی اُردو اور ہندو مسلم آبادی میں اُسے ربط باہمی کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ ہندوستانی سے پریم کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ بول چال کی حیثیت سے ہندی اور اُردو کی تفریق کے بغیر یہ تمام جنتا کی زبان تھی اور آپس میں اظہارِ خیال کے لئے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہندو مسلمان میں فرق کئے بغیر استعمال ہوتی تھی۔

ہندوستانی جو قومی زبان کی حیثیت سے گاندھی جی کو بہت عزیز تھی کوئی نئی زبان یا زبان کا کوئی نیا اسلوب نہیں تھا بلکہ یہ کھڑی بولی کا وہی روپ تھا جو اس زبان کی تشکیل کے ابتدائی دور میں کبھی ریختہ، کبھی ہندوی کبھی زبان دہلوی، کبھی زبان ہندوستان، کبھی زبان اُردوئے معلیٰ، اُردو یا ہندوستانی کے مختلف ناموں سے تاریخ کے مختلف ادوار میں یاد کی جاتی تھی اور علاقائی اعتبار سے جو گجرات میں گجری اور دکن میں دکنی کہلاتی تھی جسے امیر خسرو سے لے کر انیسویں صدی کے نصف اوّل تک کبیر، چندر بھان برہمن، نام دیو، قلی قطب شاہ، وجہی، خوب محمد چشتی، میر، ذوق اور داغ وغیرہ مختلف شاعر اور ادیب استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہی ہندوستانی انیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں اُردو اور ہندی دو مختلف ادبی اور تہذیبی اسالیب میں تقسیم ہو کر دو مختلف ادبی اور تہذیبی زبانوں کا روپ اختیار کرتی ہے۔ گو انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں انگریز عالموں نے بھی اسے ہندوستانی ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ تاہم یہ آہستہ آہستہ اپنے مرکز سے ہٹتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک نے سنسکرت کا سہارا لیا اور ہندی کہلائی اور دوسری نے فارسی سے رشتہ جوڑا۔ آخر کار ہندوستان کی فرقہ وارانہ سیاست نے "ہندوستانی" کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ اُردو، ہندی ایک دوسرے کو طاقت بخشنے کے بجائے ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی ہو گئیں۔ لیکن جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک نے زور پکڑا تو آزاد ہندوستان کے لئے ہندوستان کے مذکورہ بالا لسانی پس منظر میں قومی زبان کا مسئلہ بھی سامنے آیا تو گاندھی جی نے جو آزادی کی تحریک کے سب سے بڑے لیڈر تھے، ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی نمائندہ ہونے کی حیثیت کے پیش نظر اور وسیع دائرے کی مناسبت سے ہندوستانی کو پسند فرمایا۔ وہ اسے اُردو اور ہندی کا سنگم اور عوام کی بول چال کی زبان کی حیثیت سے سارے ہندوستان کی زبان سمجھتے تھے اور اسے ہندوی اور اُردو کے امتزاج Synthesis کے طور پر رائج کرنے کے حق میں تھے۔ اُردو ہندی کا امتزاج Synthesis ہی گاندھی جی کی ہندوستانی کو انگریزوں کی ہندوستانی سے قدرے مختلف رنگ دیتا ہے۔ گاندھی جی نے ہندوستانی کے بارے میں اپنے وچاروں کو "ہریجن سیوک" اور "ہند سوراج" میں اکثر دہرایا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

"ہندوستانی کا مطلب اُردو نہیں بلکہ ہندی اُردو کی وہ خوبصورت ملاوٹ ہے جسے اُتری ہندوستان کے لوگ سمجھ سکیں اور جو ناگری یا اُردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہو۔ یہ پوری راشٹر بھاشا ہے۔ باقی جو کچھ ہے، ادھورا ہے۔

پوری راشٹر بھاشا سیکھنے والوں کو اب دونوں ہی لکھاوٹیں سیکھنی چاہئیں۔ راشٹر پریم کا ٹھیک یہی تقاضا ہے، جو اسے جانے گا وہ پائے گا اور جو نہ جانے گا وہ کھوئے گا۔"

گاندھی جی ہندوستانی کے لئے اُردو اور ناگری دونوں لکھاوٹوں کو ضروری سمجھتے تھے۔ راشٹر بھاشا کی حیثیت

سے ہندوستانی کو دو لکھاوٹوں میں اپنانے کے بارے میں گاندھی جی ۱۹۰۹ء کے ہند سوراج میں لکھتے ہیں :

" ہر ایک پڑھے لکھے ہندوستانی کو اپنی بھاشا، ہندو کو سنسکرت، مسلمان کو عربی، پارسی کو فارسی اور سب کو ہندی جاننی چاہیے۔ کچھ ہندوؤں کو عربی اور کچھ مسلمانوں اور پارسیوں کو سنسکرت سیکھنی چاہیے۔ اُتر اور پچھم میں رہنے والے ہندوستانی کو تامل سیکھنی چاہیے۔ مگر سارے ہندوستان کے لئے تو ہندی ہی ہونی چاہیے۔ اسے اُردو میں لکھا جائے یا ناگری میں۔ ہندو مسلمانوں کے وچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لئے بہت سے ہندوستانیوں کے لئے دونوں لکھاوٹوں کا جاننا ضروری ہے۔"

گاندھی جی نے ایک سے زائد مرتبہ "ہندی ہندوستانی" اور "ہندی" کے لفظ بھی استعمال کئے ہیں اور اس سے اُردو والوں کے دل میں اکثر شکوک بھی اُبھرے کہ گاندھی جی ہندوستانی کی آڑ میں ہندی کی حمایت کر کے اُسے سارے ہندوستانیوں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی نے ہندی، اُردو اور ہندوستانی ان تینوں الفاظ کو مرادفات کے طور پر استعمال کیا ہے اور اپنے اس خیال کو اور ان شبدوں کے بارے میں اپنے وچاروں کو بار بار دُہرایا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں :

" اُتری ہندوستان میں جس بھاشا کو وہاں کے لوگ بولتے ہیں اُسے آپ چاہے اُردو کہیں، چاہے ہندی بات ایک ہی ہے۔ اُردو لکھاوٹ میں لکھ کر اسے اُردو کے نام سے پہچانیے اور ان ہی فقروں کو ناگری میں لکھ کر اُسے ہندی کہہ لیجیے۔"

ایک اور موقع پر اسی بات کو اس طرح کہتے ہیں :

" ہندی بھاشا کی پھیلاوٹ کا تھوڑا سا خیال کرنا ضروری ہے۔ میں کئی بار بیان کر چکا ہوں کہ ہندی بھاشا وہ بھاشا ہے جس کو اُتر میں ہندو مسلمان بولتے ہیں اور جو ناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔"

زبان سے متعلق اس بنیادی حقیقت کو انہوں نے مختلف مواقع پر معمولی سے لفظی ہیر پھیر کے ساتھ بار بار دُہرایا ہے۔ ان کے ذہن میں واضح طور پر ہندی، اُردو اور ہندوستانی ایک ہی زبان کے مختلف نام ہیں اور بنیادی فرق اگر کچھ ہے تو وہ رسم الخط کا ہے۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۳۵ء کو اندور میں گاندھی جی نے اسی مسئلے پر یوں روشنی ڈالی ہے :

" ہندی اس بھاشا کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان قدرتی طور پر بغیر کوشش کے بولتے ہیں۔ ہندوستانی اور اُردو میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جانے پر وہ ہندی اور عربی میں لکھی جانے پر اُردو کہی جاتی ہے۔"

جدید ہندی جس کا آغاز ۱۹۰۳ء میں ہوا، ایک عجیب و غریب مصنوعی زبان ہے جو بعض سنسکرت کے شبدوں سے اپنا ذخیرۂ الفاظ بڑھاتی ہے اور اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ خود ہندی کے علاقے میں وہ ابلاغ و ترسیل میں ناکام رہتی ہے۔ سنسکرت پراکرتوں کے رُوپ میں عوامی روزمرہ کا بہت بڑا جُز ہے لیکن موجودہ ہندی کا سارا رُجحان "تدبھو" کی بجائے تت سم الفاظ ہیں جو جدید ہند آریائی زبانوں کے پراکرتی رجحان کے بعد قدیم ہندوستان کی تہذیبی و لسانی یادگار کے طور پر کتابوں اور چند پنڈتوں اور ویدانت کے عالموں تک محدود ہیں اور جن کا استعمال تصنع اور بناوٹ سے زیادہ نہیں۔ گاندھی جی اس رُجحان کے بارے میں لکھتے ہیں :

" کچھ لکھنے والوں کے بارے میں میرے دوست کی شکایت بالکل صحیح ہے جو ایسی ہندی لکھتے ہیں،

جس کو اکثر بھارت کے بھی بہت ہی کم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جانسن کی بھاشا کی طرح یہ کوشش ضرور ہی ناکام ہونے والی ہے۔"

اسی طرح ۲۴ر جون ۱۹۳۶ء کے ہریجن سیوک میں لکھتے ہیں:

"سیدھے سادے چالو شبدوں کی جگہ سنسکرت شبد رکھنے یا شبدوں کو سنسکرت کا رُوپ دینے کا بناوٹی طریقہ بے شک بُرا ہے، اِس سے تو بھاشا کی سہج مٹھاس ہی چلی جاتی ہے۔"

گاندھی جی قومی زبان کی حیثیت سے ہندوستانی کو اپنا کر درحقیقت ہندی اور اُردو دونوں کو اپنا جائز مقام دلانا چاہتے تھے۔ وہ اِن دونوں اسالیب کو اتحاد اور میل کی تمام خصوصیات سے مملو دیکھنا چاہتے تھے جس کے میل سے ایک انسان عظیم انسان اور ایک تہذیب عظیم تہذیب اور ایک زبان عظیم زبان بن جاتی ہے اور اِس لحاظ سے وہ ہندی اور اُردو کو ہندوستانی کی پالنے والی بھاشائیں سمجھتے تھے۔ ۲۷ر فروری ۱۹۴۵ء میں وردھا میں گاندھی جی نے اِن دو زبانوں کے اتحاد اور میل کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

"یہ زمانہ ہندی کا اور اُردو کا ہے۔ وہ دو ندیاں ہیں۔ اور اِن میں سے ہندوستانی کی تیسری ندی ظاہر ہونے والی ہے۔"

اسی موقع پر آگے چل کر گاندھی جی نے کہا:

"اگر ہندی اور اُردو مل جائیں تو گنگا جمنا سے بڑی سرسوتی ہگلی کی طرح بن جائے گی۔ ہگلی تو گندی ہے، میں اس کا پانی نہیں پیتا۔ لیکن اگر یہ ہگلی بن گئی تو یہ بڑی خوبصورت ہوگی۔"

گاندھی جی نے ہندوستانی کی لڑائی میں پنڈتوں اور مولویوں دونوں سے دشمنی مول لی تھی۔ ٹنڈن جی شروع ہی سے ہندی کے طرفداروں میں سے تھے۔ اِس سلسلے میں گاندھی جی اور پرشوتم داس ٹنڈن میں اِس مسئلے پر بحثیں بھی ہوئیں اور خط و کتابت بھی۔ ایک خط میں گاندھی جی، پرشوتم داس ٹنڈن کو لکھتے ہیں:

"راشٹر بھاشا کی میری تشریح میں ہندی اور اُردو لپی اور دونوں شیلی کا گیان آتا ہے۔ ایسا ہونے ہی سے دونوں کا ملاپ ہو سکے گا۔"

گاندھی جی نے جہاں ایک مشترکہ زبان ہندوستانی کو راشٹر بھاشا کی حیثیت سے پسند کیا، وہیں پر اِس زبان کے لئے دو رسم الخط اپنانے پر بھی زور دیا اور اسے عین قوم پرستی سمجھا۔ رسم الخط کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات مذکورۂ بالا سطور میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ ایک اور موقع پر گاندھی جی لکھتے ہیں:

"ہماری قوم پرستی اگر دونوں رسم الخط کے سیکھنے سے گھبراتی ہے تو وہ بہت ہی ادنیٰ قسم کی قوم پرستی ہے۔"

عادت کے مسئلہ پر گاندھی جی کا خیال تھا کہ آخر میں وہی لکھاوٹ عام ہوگی جسے زیادہ سے زیادہ لوگ پسند کریں گے اور جو اپنی طاقت پر اپنے آپ کو منوائے گی۔ حالات کے پیشِ نظر اس کا قوی امکان تھا کہ ناگری لکھاوٹ زیادہ سے زیادہ استعمال ہوتی اور اس طرح گاندھی جی کی ملی جلی زبان کے لئے ایک ہی لکھاوٹ یعنی دیوناگری کو اپنا لیا جاتا۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو کو اپنی مادری زبان کی حیثیت سے سیکھنے والوں پر وہ ظلم نہیں ہوتا اور علاقائی حیثیت سے اُسے وہ مقام ملتا جس کی وہ مستحق ہے۔ لیکن آزادی کے بعد قومی اسمبلی میں قومی زبان کی حیثیت سے ہندوستانی دیوناگری لکھاوٹ میں ہندی کے مقابلے میں صرف ایک ووٹ سے قومی زبان بننے

(باقی صفحہ ۹۱ پر دیکھئے)

یونس اگاسکر



# گاندھی جی کے عمرانی نظریات

موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنی زندگی کو ایک پیغام بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ ذاتی طور پر ایک روحانیت پرست مذہبی آدمی تھے لیکن عملی زندگی میں ایک عظیم سیاسی و سماجی مصلح و مفکر بھی تھے کیونکہ اُن کا مذہبی شعور اصلاً عارفانہ نہ تھا کہ صرف مشاہدۂ حق کی گفتگو تک محدود رہ جاتا، بلکہ پیغمبرانہ تھا جس نے انہیں اجتماعی زندگی کو تلاشِ حق کا میدان بنا کر انسانوں کے ہمہ جہتی ارتقار اور وِکاس کے لئے جد و جہد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ اُن کی زندگی اور نظریات کا عمرانیات خصوصاً اور ہندوستانی عمرانیات کے تناظر میں جائزہ لینا نہ صرف مفید و اہم بلکہ ضروری کام ہے جس پر افسوس کہ بہت کم توجہ دی گئی ہے اور اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ گاندھی جی کے اجتماعی خیالات و نظریات کو ربط و ترتیب کے ساتھ پیش کرنے اور اُن کا اُصولی جائزہ لینے میں بڑی دقت پیش آتی ہے کیونکہ وہ منظم مفکر (discip — lined thinker) نہ تھے اور اُن کے خیالات میں وہ منطقی ربط نہیں پایا جاتا جو باقاعدہ مفکروں کے نظامِ فکر میں ہوتا ہے۔ خاص طور پر سماجی و اجتماعی نظریات کا جائزہ لیتے وقت یہ حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اِس لحاظ سے اُن کے اجتماعی نظریات کی منظم تفسیر و تشریح کر کے ان کی افادیت وغیر افادیت پر بحث کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ گاندھی جی کے بعض بنیادی خیالات کا ہندوستانی عمرانیات کے تناظر میں جائزہ لے کر ہندوستانی معاشرے پر اُن کے اطلاق پر بحث کروں۔

گاندھی جی چونکہ ایک باعمل مفکر تھے اس لئے اُن کی تحریروں کے ساتھ ساتھ اُن کا عمل اور رہن سہن بھی اُن کے خیالات کے سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ اکثر ایک سنسکرت مقولہ دُہرایا کرتے تھے "سَتیت نستی پرو دھرم" یعنی سچائی سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں ہے۔ اپنی عمر کے ابتدائی دور ہی سے وہ سچائی اور حق پرستی کو انسانیت کا سب سے بڑا آدرش سمجھتے آئے تھے اور آگے چل کر حق ہی کو خدا تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن گاندھی جی کا یہ تصورِ حق نرا تجریدی (abstract) نہ تھا۔ وہ اِسے روزمرہ کی زندگی میں برتتے رہتے تھے اور اپنے ہر عمل کو تلاشِ حق کا وسیلہ سمجھتے تھے چنانچہ عام انسانوں کی مصیبتوں اور تکلیفوں کو وہ دنیا کی سب سے بڑی سچائی تسلیم کرتے تھے اور ان کا حل تلاش کرنا اُن کے نزدیک ہر طالبِ حق کا فرض تھا۔ ان کے خیال میں "ہندوستان ہندوستانیوں کا ہے"۔ حق پر مبنی ہے جب کہ انگریزوں کی حکومت ناحق پر۔ اِسی لئے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اِسی طرح

عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دلانا اُن کے لئے حق کی تلاش کا ایک راستہ تھا۔

دراصل گاندھی جی ساری اجتماعی زندگی کو تلاشِ حق کا میدان بنانا چاہتے تھے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی راہِ حقیقت اور راہِ نجات دکھانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تعمیری کارکنوں کی متعدد انجمنوں کے ذریعے ایک ایسے مثالی سماج کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی جو حق یعنی ستیہ کے اصولوں پر مبنی ہو۔ مقابلے کی جگہ تعاون کو اپنائے اور تشدد و استحصال سے پاک ہو اور اس سماج میں ناحق (Injustice) سے لڑنے کے لئے انہوں نے ستیہ گرہ کا ہتھیار پیش کیا تھا جس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ گویا گاندھی جی کے نزدیک ستیہ یا حق کا مطلب Justice تھا جسے وہ زندگی کے ہر شعبے میں رائج کرنا چاہتے تھے[لہ]۔ خاص طور پر ہندوستانی سماج میں جہاں دورخا پن (double standard) ایک ملک گیر خصوصیت ہے اور ہر قسم کی بے انصافیاں دین و اخلاق، تہذیب و معاشرت اور سیاست و حکومت کے نام پر جائز قرار دی جاتی ہیں، جہاں اہنسا کے گن گائے جاتے ہیں اور انسانوں کو زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ رواداری (tolerance) کا درس دیا جاتا ہے اور بسوں کے ایسے روٹ تلاش کئے جاتے ہیں جو بعض 'بدنام' علاقوں سے ہٹ کر ہوں، جہاں بہ قول ای۔ ایم فاسٹر زمین و آسمان ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں، گاندھی جی کے ستیہ پر مبنی سماج کے قیام کی کوشش کو ایک مستحسن اقدام ہی کہنا پڑے گا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ گاندھی جی کی دلچسپی سماجی و سیاسی مسائل سے بلاواسطہ نہیں تھی بلکہ اُن کی مذہبی لگن اور روحانیت کا نتیجہ تھی۔ ایک اچھے سماج یا صالح ریاست کی تعمیر اُن کے لئے بجائے خود مقصد نہیں بلکہ وسیلہ ہے، آخری مقصد کے حاصل کرنے کا جسے وہ عرفانِ الٰہی اور نجات (موکش) کہتے ہیں۔ ان کا سماجی آدرش بھی یہی تھا کہ ہر فرد کو واجبی راحت کے ساتھ اپنی شخصیت کی پوری نشوونما کے لئے اظہارِ ذات کے لئے، معرفتِ نفس اور عرفانِ الٰہی کے لئے پوری آزادی اور پورا موقع حاصل ہو اور اُن کے نزدیک اس آدرش کو ضمانت اُسی سماج میں ہو سکتی ہے جس کی بنا ر کامل ستیہ اور اہنسا پر رکھی گئی ہو جس میں نا اتفاقی، استحصال یا تشدد کا شائبہ تک نہ ہو۔ لیکن اس مثالی سماج کا کوئی واضح اور مکمل تصور گاندھی جی نے نہیں پیش کیا ہے اور ان سے اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی، کیونکہ وہ سماجی یا سیاسی فلسفی سے زیادہ اخلاقی اور روحانی مجدد تھے۔ اس کے باوجود مختلف اوقات میں انہوں نے اپنے مثالی سماج کا جو خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اُس پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ گاندھی جی اُسے اہنسا کی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے اور سوائے روحانی اقتدار کے اُسے ہر قسم کے دنیوی اقتدار سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے اس مثالی سماج میں نہ تو ریاست قائم ہو سکتی تھی اور نہ پولیس، عدالتیں، وزارت اور سیاسی پارٹیاں وجود میں آ سکتی تھیں اور نہ ہی کسی قسم کی اونچ نیچ دار مشینری یا دولت کی غیر مساوی تقسیم جگہ پا سکتی تھی اور اس سماج کی تشکیل کا

---

لہ Gandhiji's idea of Satya extends to the whole field of human activity and human relationship including politics and inter-national resations.

He always abhorred double standards. R.R.Diwakar. Gandhiji's Basic Ideas and some Modern Problems, (P. 47.)

اُن کے نزدیک ایک ہی صحیح اور مبنی برحق راستہ تھا، عدم تشدّد یا اہنسا۔ ان کے اپنے الفاظ میں :

A non-violent revolution is not a programme of 'seizure of power', but it is a programme of transformation of relationship.

– Tendulkar, D.G: Mahatma, vol. VII, p. 29.

مہاتما گاندھی کے مثالی سماج اور اُس کی تشکیل پر غور کرتے ہوئے ہم عدم تشدّد یا اہنسا تک آپہنچے ہیں۔ اب لیے آثار کی سماج کے امکانات پر روشنی ڈالنے سے پہلے اہنسا کے نظریے کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہنسا ایک سنسکرت لفظ ہے جس کے لفظی معنی ہیں 'مارنا' تکلیف دینا اور آہنسا کا مفہوم ہے عدم تشدّد یا تکلیف نہ پہنچانا لیے گویا حیوانی ردِعمل کے دو رُوپ ہیں۔ گاندھی جی نے اِن میں سے موخرالذکر کو انسان کو اصلی فطرت مانا ہے۔ اُن کے نزدیک ہر انسان فطری طور پر اہنسا وادی ہوتا ہے اور اہنسا ہی سب سے عظیم دھرم ہے (اہنسا پرمو دھرم)۔ اگرچہ اہنسا کے ظاہری معنی عدم تشدّد کے ہیں لیکن اس کا صحیح مفہوم محبت اور بھائی چارہ ہے۔ عدم تشدّد کے منفی معنی محبت اور ایکتا کے مثبت مفہوم کو پیش کرتے ہیں جس کی تکمیل ایک اہنسا وادی اپنی جان قربان کرکے کرتا ہے۔ گاندھی جی کے نزدیک ستیہ اور اہنسا کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ستیہ پر مبنی سماج اہنسا کے سہارے ہی قائم رہ سکتا ہے۔ اہنسا کے مفہوم کو گاندھی جی نے اپنی تحریروں میں اس طرح برتا ہے کہ اِس کے متعدد گوشے منوّر ہوگئے ہیں مثلاً اہنسا میں محبت و اخوت کے ساتھ دلیری، وفاداری، حق پرستی اور روزی کے لئے محنت (bread-labour) کا اصول بھی شامل ہے۔ اُن کے نزدیک بغیر جسمانی محنت کے اپنی روزی حاصل کرنا ہنسا کی زندگی گذارنے کے برابر ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مثالی سماج میں جسے وہ رام راج کے دلکش نام سے پکارتے ہیں، ڈاکٹروں، وکیلوں، مدرسوں اور تاجروں کو بھنگیوں، بڑھئیوں اور خاکروبوں کے برابر معاوضہ دینا چاہتے ہیں تاکہ معاشرے سے اونچ نیچ کا فرق مٹ جائے اور ایک غیرطبقہ واری معاشرہ (Classless-society) وجود میں آئے جس میں تشدد یا conflict راہ نہ پاسکے اور سارے انسان ایک دوسرے کی بھلائی کے لئے کام کرسکیں ۲۔ گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ روزی کے لئے محنت (bread labour) کا نظریہ سماج میں ایک خاموش انقلاب لے آئے گا اور انسان کی فتحِ عظیم اِس میں مضمر ہے کہ وہ تنازع للبقا کی جگہ خدمتِ باہمی کو رائج کردے اور سماج میں وحشی قانون کے بجائے انسانی قانون کا عمل دخل ہوجائے۔ اِس طرح سماجی ومعاشی نابرابری کا خاتمہ ہوکر ستیہ گرہ اور تعمیری پروگرام کی منازل آسان ہوجائیں گی۔

اب اِس سے قبل کہ ہم ستیہ گرہ اور تعمیری پروگرام پر روشنی ڈالیں۔ ضروری ہے کہ ستیہ اور اہنسا کی بنیادوں پر قائم ہونے والے اس رام راج کے امکانات کا جائزہ لیا جائے اور ہندوستانی عمرانیات کو اِس سلسلے میں پیشِ نظر رکھا جائے۔

---

لہ "ہنسا کے معنی ہیں کسی جان کو غصے یا ذاتی غرض سے قصداً دکھ پہنچانا یا مار ڈالنا۔ اِس سے باز رہنا اہنسا کہلاتا ہے"۔ مہاتما گاندھی، ینگ انڈیا ــــ بہ حوالہ گاندھی اور نہرو کی راہ، سید عابد حسین، ص: ۲۷۔

۲۔ Mathur J.S: "The Gandhian Approach To A Classless Society" from gleanings From Gandhian Thought,

میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ گاندھی جی اجتماعی زندگی کو تلاشِ حق کا میدان بنانا چاہتے تھے اور انفرادی ارتقار کے پردے میں ساری انسانیت کا سمہ جہتی وکاس اُن کا نصب العین تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے محبت اور عدم تشدد کا راستہ ناگزیر تھا، کیونکہ ان کے اپنے الفاظ میں "محبت بے حق کے اندھی ہے اور حق بے محبت کے کھوکھلا"۔ اس لحاظ سے گاندھی جی جس سماجی آیئڈیل کو اپنا مطمحِ نظر بنائے ہوئے تھے وہ دراصل عدل یعنی Justice ہے کیونکہ بغیر عدل کے کوئی معاشرہ صالح بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتا۔ ستیہ[۱] کو مرکزہ ( Nucleus ) مان کر گاندھی جی نے جس معاشرے کے خدوخال ہمارے سامنے پیش کئے ہیں اُس میں مساوات، حریت، عدمِ ملکیت، روزی کے لئے محنت، دولت و صنعت کا عدم ارتکاز اور ستیہ گرہ ایسی خصوصیتیں ہیں کہ گاندھی جی کے نظریۂ حق کو انارکی نظریہ کا روحانی رُوپ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ گاندھی جی کا رام راج دراصل کامل نراج ہے جس میں انسانی فطرت کے قانون کے سوا اور کسی قانون کی کارفرمائی نہ ہو، محبت کی طاقت کے سوا اور کسی طاقت سے کام نہ لیا جائے۔ مثالی سماج میں سیاسی قوت کا وجود نہیں ہوتا اس لئے کہ سرے سے ریاست ہی نہیں ہوتی[۲]۔ مزید تفصیل میں جانا اس مضمون کے حدود سے تجاوز کر جانے کے مترادف ہوگا، اس لئے محترم جینتو جہ بندو پادھیائے کی بیان کردہ تشریح کو دُہرانے پر اکتفا کرتا ہوں۔

"Coming back now to the Sanskrit proverb, 'Satyat nasti paro dharma', it is not difficult to see the sense in which Gandhi regarded it (truth) as the basis of his social and political thought. Truth in the value sense means immanent justice, and 'dharma' or religion means the pursuit or realization of Justice through human action."

Social and Poli. thought of Gandhi p. 22.

یہ حقیقت شبہے سے بالاتر ہے کہ گاندھی جی اپنی سماجی زندگی کے ابتدائی دَور ہی میں رسکن اور ٹالسٹائی جیسے انارکیوں سے متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے "قدرتی عدل" کا تصور انہیں سے لیا ہے جسے بعد میں گیتا اور اُپنشدوں کا سہارا لیکر ستیہ کے رُوپ میں ڈھال لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو نظریۂ عدل کا میل گیتا سے بٹھانے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ اس کے تین سبب ہیں۔ اوّل تو یہ کہ گاندھی جی بنیادی طور پر مذہبی اور رُوحانیت پرست انسان تھے، اس لئے اپنے ضمیر کو مطمئن کئے بغیر کسی نظریے کو نہیں اپنا سکتے تھے۔ دوم یہ کہ وہ اپنے دَور کے ذہنی طبقے کو مطمئن کرنا چاہتے

---

۱؎ شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ میں ۔۔۔ "انسانی سوسائٹی کے نظامِ عدل کا انحصار اسی پر ہے۔ اسی سے اجتماعِ انسانی کی سیاستِ عالیہ چل سکتی ہے"۔ (ہمعات، فارسی) بحوالہ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفۂ عمرانیات و معاشیات، از بشیر احمد لدھیانوی، ص ۲۰۰

۲؎ یہ وہی خیالات ہیں جو Winstanley، Godwin، Prowdhon، Ruskin، Kropotkin اور Tolstoy جیسے مستند انارکیوں نے گاندھی جی سے پہلے اپنی تحریروں میں ظاہر کئے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے:
George Woodcock: Anarchism, Penguin Books, 1962.

تھے اور سوم یہ کہ ایک "عملی تصوّر پرست" ( Practical idealist ) ہونے کی وجہ سے وہ اس راز کو اچھی طرح جان چکے تھے کہ ہندوستان کے مذہب پسند عوام کو ذہن سے زیادہ جذبات کے سہارے عملی اقدام پر آمادہ کیا جا سکتا ہے اور ہندوستان کے روایتی سماج میں عدل کا شعور اسی وقت بیدار ہوگا جب کہ دماغ کی بجائے دل کا راستہ اختیار کیا جائے۔ انہوں نے خود اس کا اقرار ان الفاظ میں کیا ہے:

I have come to this fundamental conclusion that if you want something greally important to be done, you must not merely satisfy reason, you must move the heart also"---- (Young India)

اب اس حقیقت کو ہندوستانی عمرانیات کا کوئی طالب علم نہیں جھٹلا سکتا کہ ہمارے سماج میں کرم اور تناسخ کی تعلیمات کی وجہ معاشرتی ہمدردی اور سماجی عدل کا جذبہ تقریباً مفقود ہو چکا تھا، کیونکہ یہ خیال دماغوں میں جڑ پکڑ چکا تھا کہ ہر انسان اپنے کرموں کا پھل بھگتتا ہے اور اس کی حالت کو سدھارنے کی کوشش یا اس کے مرتبے کو بڑھانے کی کوشش گویا قدرت کے کارخانے میں دخل دینے کے برابر ہے۔ ایسے میں اگر گاندھی جی نے ستیہ پر مبنی رام راج برپا کرنے کا نظریہ پیش کیا جس میں سماجی عدل کا دور دورہ ہو تو وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے جس کے لئے وہ ہمارے احترام کے مستحق ہیں۔ لیکن سماجی عدل کے قائم کرنے کے لئے عدم تشدّد کو ایک ناقابلِ ترک راستہ بتا کر گاندھی جی نے اپنے سارے سماجی نظریات کے مستحکم قلعے کے ستونوں میں خود ہی رخنے ڈال دیئے ہیں مگر عدم تشدّد کی عسیر العمل اور کبھی کبھی ناممکن العمل پالیسی پر غور کرنے سے پہلے سماجی عدل کے دیگر چار پہلوؤں حریت (Freedom) مساوات (Equality) عدم ملکیّت (Non-Possession) اور سرودئے (Equal development of all) پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔

گاندھی جی کے دل میں انسانی آزادی اور انسانیت کے احترام کا بیج اسی وقت پڑ چکا تھا جب انہیں افریقہ میں طرح طرح کی ذلتوں اور رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ آگے چل کر یہ بیج ایک تناور درخت میں تبدیل ہو گیا اور اس میں بربھریہ سے لے کر عدم ریاست تک انفرادی و کلی آزادی کی نت نئی شاخیں پھوٹتی چلی گئیں گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ انسان کی مکمل ذہنی و اخلاقی یا روحانی ارتقار کے لئے ضروری ہے کہ ہر فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور اس کی زیادہ سے زیادہ عزت کی جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ آزادی و احترام کا تصوّر کلی (Universal) ہونا چاہیئے، ورنہ انفرادی و اجتماعی آزادی میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے گا (اور آج ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے) لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ رام راج میں صرف اکثریت کا حکم چلے گا بلکہ اس میں اقلیت کو اختلاف کرنے کا پورا حق حاصل ہوگا کیونکہ ضمیر کی آواز کے مقابلے میں اکثریت کی رائے کوئی وزن نہیں رکھتی۔

"Under democracy, individual liberty of opinion is jealously gaurded. I, therefore, believe that the minority has a perfact right to act differently from the majority."

(Young India)

لیکن گاندھی جی انسانی ضمیر کو اتنا بیدار بنانا چاہتے تھے کہ ہر فرد اپنے ذاتی اقدار کے commitments سے سارے معاشرے کو commit کر سکے اور اس طرح اس کا کوئی عمل سماج کے اقدار میں خلل انداز نہ ہو سکے اور اقلیت و اکثریت کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہو۔ یہاں گاندھی جی آزادی کے تصور کے لحاظ سے الحادی وجودیوں (atheistic – existe...) سے کافی قریب نظر آتے ہیں کیوں کہ آگے چل کر انہوں نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ ہر انسان ... ے داری کے ساتھ ساتھ اجتماعی ذمے داری قبول کرنے پر مجبور ہے اگر وہ تصورِ آزادی کو اپنا لے کیونکہ ... دی آزادی کے حصول کے لئے اسے ماحول کے مطابق ایک ضابطۂ اخلاق بنا کر اس پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔ اس ... الحادی وجودیوں کے امام سارتر (Sartre) کے الفاظ کو پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

What is at the very heart and centre of the existentialism, is the onsolute character of the free comitment by which every man realizes himself in realizing a type of humanity.

I cannot make liberty my aim unless I make that of others equally my aim.

Walter Kaufman (ed.) Existentialism From Dostovesky To Sartre pp. 304—7.

اب اس تصور کو ہندوستانی عمرانیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری نسلی و تاریخی روایات میں ایسی لامذہبی حریت Secular freedom کا کہیں ذکر تک نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے آزادی کا گاندھیائی نظریہ ایک انقلابی دین ہے کیونکہ ہندوستانی سماج میں فرد کا مقام و مرتبہ اور اس کی آزادیٔ فکر و عمل پیدائش، ذات، یا مذہب کی بنیاد پر ٹھہرائی جاتی تھی۔ اس میں شبہہ نہیں، کرم کی تھیوری میں ایک قسم کی شخصی آزادی کا پہلو ضرور موجود تھا، جیسے ڈاکٹر رادھا کرشنن نے تاش کے پتوں کے استعارے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے جنہیں انسان انتخاب نہیں کرتا لیکن کھیلتا اپنی مرضی سے ہے، مگر قدیم مذہبی رہنماؤں اور مدرسینِ اخلاق نے کرم کی ایسی بری تفسیریں کیں کہ عوام نے اسے قسمت پرستی Fatalism کے روپ میں اپنا لیا۔ مسلمان جب یہاں آئے تو وہ بھی اسی رنگ میں رنگے گئے۔ انیسویں صدی میں سماجی بیداری کے ساتھ انفرادی آزادی کا تصور پیدا ہوا۔ مگر اس کی حیثیت بیرونی ہی رہی جسے غیر ملکی طاقت سے درخواست کر کے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ گاندھی جی کے آنے سے حالات نے پلٹا کھایا لیکن اب بھی ہمیں بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ یہاں پر اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ گاندھی جی کا پیش کردہ یہ نظریہ کہ آزادی کا بیرونی استعمال روحانی و اخلاقی طاقت کے ذیل میں آنا چاہیئے، نہ کہ جسمانی قوت کے۔ گاندھی جی سے پہلے Godwin، Kropotkin، Tolstoy، Emerson اور Thoreau کے یہاں بھی پایا جاتا ہے صرف Proudhon، Max sterner اور Bakunin جو تشدد کو جائز قرار دیتے ہیں، اس سے مستثنیٰ ہیں[1]

---

[1] دیکھئے "انارکزم"۔ از جارج ووڈکاک (انگریزی)

گاندھی جی کے خیال میں آزادی عدم تشدد کے بغیر ناممکن الحصول شے ہے اور صحیح عدم تشدد صرف ایسے ہی سماج میں پایا جاسکتا ہے جہاں نہ تو کسی قسم کی مشینیں ہوں اور نہ ہی محنت کا استحصال۔ یہاں گاندھی جی کے خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ قطع نظر اس سے کہ عدم تشدد کا وجود مشینوں کے ہونے یا نہ ہونے سے نہیں ہے، عدم تشدد کے حصول کے لئے ہندوستان یا دنیا کے کسی ملک کو تہذیبی ارتقا کی دیہی منزل پر روک لینا ایک غیر عقلی اور غیر سائنسی بات ہوگی کیونکہ دیہی سماج انسانی تہذیب کے ارتقا کی ایک منزل ہے جسے شاہ ولی اللہ نے ارتفاقِ دوم سے تعبیر کیا ہے[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دیہی کلچر میں جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں وہ بہت ہی ناقص اور نامکمل ہیں اور پچھلے سو ڈیڑھ سو سال سے ہماری زرعی تہذیب میں کوئی 'انقلاب' تو آیا ہی نہیں، اس لئے گاندھی جی کے نظریات پر عمل کر کے دیہی کلچر کو ارتفاقِ دوم ہی پر روک کے رکھنا سراسر نقصان دہ ثابت ہوگا۔

جہاں تک مساوات کا تعلق ہے گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ مکمل مساوات اُس آئیڈیل سماج میں خود بخود پیدا ہو جائے گی جسے وہ اوّل درجے کا مثالی سماج (first order ideal Society) کہتے ہیں، کیونکہ اس سماج میں وہ تمام ذرائع ختم ہوجائیں گے جو سماجی نابرابری اور عدمِ مساوات کو جنم دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص جسمانی محنت کئے بغیر روزی نہیں پائے گا اور ہر شخص کو 'روزی کے لئے محنت' (bread labour) کرنی پڑے گی۔ خاص طور پر ہندوستان میں جہاں پیشے کے اعتبار سے اونچ نیچ کی جاتی ہے 'روزی کے لئے محنت' کا اصول تمام انسانوں کو یکساں سطح پر لے آئے گا۔ اسی طرح وہ برنارڈ شا کی طرح پیشے اور کام کے فرق کو نظر انداز کر کے ڈاکٹروں، معلموں، بھنگیوں اور خاکروبوں کو اُن کی محنت کا یکساں معاوضہ دیئے جانے کے حامی تھے۔ اسی طرح سادگی اور غربت کو جو مثالی سماج کی بنیادی خصوصیات ہوں گی، سماجی مساوات کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ وہ سوشلسٹوں کی طرح دولت کی مساوی تقسیم کے بجائے غربت کی مساوی تقسیم پر زور دیتے تھے۔ گاندھی جی کے نظریۂ مساوات کی بنیادی کمزوری یہی ہے کہ انہوں نے انسان کی معاشی جبلت کو قطعی نظر انداز کیا ہے جس نے کہ انسانی تہذیب کے ارتقا میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ جب تک انسان کی بنیادی ضرورتیں پوری نہ ہوں، اُس کے لئے روحانی سکون یا لطف حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں، کیونکہ "بیماروں اور بھوکوں کو کبیر کے دوہوں سے کسی طرح نہیں بہلایا جا سکتا" اور یہ کہ "بھوکے کے سامنے بھگوان بھی روٹی کے علاوہ کسی اور شکل میں آنے کی ہمت نہیں کر سکتا" لیکن عملی طور پر وہ اسی کے قائل نظر آتے ہیں کہ معاشی و تہذیبی اقدار کو روحانی اقدار کا تابع ہونا چاہیئے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے ورن آشرم کو روحانی ارتقا کے لئے ضروری سمجھ کر اپنے مثالی سماج کی چو پہلو تقسیم قبول کی ہے جو سراسر غیر سائنسی اور غیر فطری تقسیمِ کار ہے۔ قدرت اپنی فیاضیوں میں غیر جانب دار ہے — وہ

---

[1] ارتفاق کا مادہ رِفق ہے جس کے معنی نرمی یا نرمی سے کام لینے کے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے فائدے کی جتنی چیزیں ہیں . . . انسان کو انہیں رام کر کے نرمی کے ساتھ کام میں لانا پڑتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک انسانی تمدن چار ارتفاقات سے گزرتا ہے جو علی الترتیب وحشی (aboriginal)، قصباتی (rural)، شہری یا قومی (urban or national) اور بین الاقوامی (international) کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کا فلسفۂ عمرانیات و معاشیات از بشیر احمد لدھیانوی ص ۲۵ و تم جا۔

پرچون فروش کے بیٹے میں سائنسی تحقیق کا دماغ پیدا کرتی ہے تو پروفیسر کے بیٹے کو نکما اور نکھٹو بناتی ہے۔ موچیوں کی اولاد میں دھرم
اور ویدانت کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے تو مذہبی دانشوروں کے بیٹوں میں کھیل کود اور تماشے کا رجحان ودیعت کرتی ہے
یہاں تک کہ نائی کی اولاد کو راجہ بنا دیتی ہے تو حاکموں کے وارثوں کو تصوّف کی طرف مائل کر دیتی ہے' اس لئے اگر فطری ذوق و
شوق اور قدرتی رجحان و صلاحیت کا لحاظ نہ رکھ کر محض موروثی پیشے میں ہر شخص کو جوت دیا جائے تو اس کا نتیجہ معاشی زوال
اور ناکارکردگی کی صورت میں نمودار ہوگا۔ ہندوستان میں ہم یہی دیکھ رہے ہیں کہ بے مذاق و بے مزا پیشوں اور مشاغل
سے وابستگی کی بنا پر لاکھوں کی زندگیاں کرب اور کاہلی میں گذر رہی ہیں اور عمر بھر کے لئے وہ اس دنیا میں Misfits
ہو کر رہ گئے ہیں۔ غالباً گاندھی جی کو بھی اس خامی کا احساس تھا، کیونکہ انہوں نے ورنوں کی تقسیم دورِ قدیم کی طرح
متصلب (rigid) نہیں مانا ہے۔ "بے شک میں نے یہ کہا ہے کہ ورن کی بنا نسبت پر قائم ہے لیکن اسی کے ساتھ
میں نے یہ بھی کہا ہے کہ مثلاً ایک شودر کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ویش بن جائے"۔ لیکن ہندوستان کے صنعتیا دے
(industrialization) کے بعد ورن آشرم کی تقسیم ناقابلِ عمل ہو جائے گی اس لئے اُسے قبول کرنا گھڑی
کی سوئیوں کو الٹا چلانے کے مترادف ہوگا۔ دراصل گاندھی جی اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ ہندوستان میں مذہبی،
جغرافیائی، معاشی، نسلی اور تہذیبی عناصر نے ہندوستانی قوم کو ایک ایسے "ہوچ پوچ کلچر" کا حامل بنا دیا ہے کہ چار
ورنوں کی تقسیم ایسی اونچ نیچ اور اختلاف کو ختم کرنے کے بجائے اور بڑھا دے گی۔ دراصل اس کا حل تیز رفتار صنعتیاؤ
اور صحیح تعلیم و تربیت ہے۔ ذات پات اور فرقہ پرستی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں گاندھی جی سے زیادہ پنڈت
نہرو کی راہ پر چلنے کی ضرورت ہے۔ ذات پات کی طرح گاندھی جی نے فرقہ پرستی کو بھی مذہبی غلط فہمیوں کا نتیجہ سمجھ کر تبدیلیٔ
قلب و ذہن اور مذہبی رواداری کو اُس کا حل بتایا ہے[1] لیکن ہندوستانی عمرانیات کی روشنی میں اس پر غور کیا جائے
تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی وجوہات تاریخی زمانۂ گذشتہ سے لے کر آج تک سیاسی، معاشی اور تہذیبی زیادہ رہی ہیں مذہبی
کم۔ لہٰذا اسے سیکولر نقطۂ نظر سے سوچنے کی ضرورت ہے نہ کہ مذہبی زاویئے سے جو بعض اوقات ایسی اختلافات کو
اور نمایاں کر دیتا ہے۔

رام راج کی حسین عمارت کا تیسرا اہم ستون عدمِ ملکیت ہے جسے عدمِ تشدد ہی کا ایک حصہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ یہ کہنا
زیادہ صحیح ہوگا کہ اس عمارت کے چاروں ستونوں میں عدمِ تشدد نے سمنٹ کا کام کیا ہے' اس لئے اس ساری بحث
میں عدمِ تشدد کا بار بار تذکرہ ناگزیر ہے۔ عدمِ ملکیت یا اپری گرہ کا تصوّر ویداتی فلسفے میں بھی پایا جاتا ہے اور گاندھی
جی کے خیالات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نجی ملکیت کو وہ دورِ اوّل کے عیسائی راہبوں کی طرح "چوری" سمجھتے ہیں۔
لیکن وہ اس امکان کو تسلیم کرتے ہیں کہ مثالی سماج میں کسی کے پاس اُس کی ضرورت سے زیادہ املاک جمع ہو جائیں
اور اس کے جواز کے لئے [illegible] (Trusteeship) کا نظریہ پیش کرتے ہیں کہ انسان اپنے پاس ضرورت سے
زیادہ املاک [illegible] کی حیثیت سے دوسروں کے فائدے کے لئے رکھے گا اور اس کی موت کے بعد وہ جائداد قومی

---

[1] ہندو مسلم نااتفاقی سے [illegible] کے الفاظ ملاحظہ ہوں:
It is like the war of the Roses. Out of this will rise a mighty nation. Tendulkar: Mahatma Vol. II, 235

ملکیت سمجھی جائے گی۔ لیکن یہ امکان اُسی وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ مکمّل مثالی سماج تشکیل نہ پا جائے۔ رام راج کے حصول کے بعد 'امانت' کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ لیکن گاندھی جی اس حقیقت کو بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کا رام راج کا خواب کسی ایسے آنے والے زمانے میں جس کی مدّت کا تصوّر کیا جا سکے، شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اس لئے انہوں نے خالص اہنسا تمک سماج یا رام راج کی جگہ آزاد ہندوستان کے لئے ایک غیر مذہبی جمہوری ریاست کا نقشہ سوچا تھا۔ جو ایک حد تک اہنسا کی پابند ہو اور جس میں عدم ملکیت کے بجائے امانت کا طریقہ رائج ہو اور کامل نراجی سماج کے لئے عبوری نظام کا کام انجام دے۔ اِس عبوری نظام کو 'سوراج' یا 'دوم درجے کا مثالی سماج' کے ناموں سے گاندھی جی نے یاد کیا ہے۔ لیکن اس پر غور کرنے سے پہلے سرودے کے نظریے پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جس کے بغیر رام راج کا تصوّر نامکمل ہے۔

جیریمی بینتھم (Jeremy Bentham) نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ سماجی خوش حالی کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا بیش از بیش فائدہ ہونا چاہیئے۔ گاندھی جی نے فرد کی مکمّل آزادی کے تصوّر سے اس کا میل بٹھا کر سرودے کا سماجی نصب العین ترتیب دیا تاکہ ایک سماجی نظام برپا کیا جائے جس میں ہر فرد کو مساوی طور پر ترقی کرنے کی مکمل آزادی ہو اور کسی کو کسی کے استحصال کا موقع نہ ملے۔ یہ سچّائی اور اہنسا پر مبنی ایک ایسا سماج ہوگا جس میں ذات پات نہ ہوگی، اونچ نیچ کا فرق نہ کیا جائے گا اور فرد یا جماعت کو پُورا پُورا وکاس کرنے کا موقع حاصل ہوگا[1] گویا سرودے گاندھی کے سماجی آئیڈیل کی آخری منزل ہے جسے پانے کے بعد رام راج کا خواب پُورا ہوگا لیکن جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے گاندھی جی اپنے اس خواب کو مستقبل بعید میں بھی شرمندۂ تعبیر ہوتا نہیں دیکھ رہے تھے اِس لئے انہوں نے حالات سے مصالحت کر کے ایک عبوری نظام قبول کر لیا، جو جزوی طور پر تشدّد اور ناحق پر مبنی تھا اور اس کے قیام کے لئے آخر دم تک کوشش کرتے رہے۔

مگر گاندھی جی کی کوشش کو صنعتی انقلاب نے ناکام بنا دیا جس کے وہ کٹّر مخالف رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مشینوں کا محتاج بننا بلند خیالی اور سادہ زندگی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اُن کے نزدیک ایک فطری دیہی سماج جو جبری محنت، دستی صنعت اور مبادلۂ اشیار (Barter) کے طریقے کو اپنائے، سب سے بہتر سماج ہے اور دوم درجے کا سماج وہ ہے جس میں فرد اور اس کا گاؤں مل کر حکومت بناتے ہیں۔ ہر گاؤں ایک خود کفیل معاشی واحدہ (unit) ہوتا ہے، ریاست ہوتی ہے لیکن وہ سب سے کم حکومت کرتی ہے۔ ووٹ دینے کا حق انہیں کو حاصل ہوتا ہے جو ہاتھ سے محنت کر کے ملک کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں، سرمایہ دار دولت کے امین ہوتے ہیں۔ اقلیت اکثریت کے دباؤ سے آزاد ہوتی ہے۔ اہنسا کے ذریعے سماجی عدل قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور ستیہ گرہ سے ہر قسم کی غلط کاریوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اب گاندھی جی کے تصوّراتی سماجوں کی عدم تشکیل کی وجوہات پر غور کرنے سے پہلے ستیہ گرہ اور تعمیری پروگرام پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

مہاتما گاندھی نے اپنے اوّل و دوم درجے کے مثالی سماجوں میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے رُوحانی طاقت کا ستیہ گرہ کے رُوپ میں استعمال سکھایا ہے۔ ستیہ گرہ گاندھی جی کے نزدیک ایک ایسا موثر ہتھیار ہے جس سے ایک

---

[1] ہندوستانی سماجیات از ڈاکٹر جعفر حسن، ص: ۱۶۲۔

فرد دوسرے فرد کو، ایک طبقہ دوسرے طبقے کو اور ایک قوم دوسری قوم کو بے انصافی اور استحصال سے باز رکھ سکتی ہے۔ ستیہ گرہ کا مقصد غلط کاروں کا خاتمہ نہیں بلکہ ان کی اصلاح ہے۔ گاندھی جی نے اس ہتھیار کو اس طرح ڈھالا ہے کہ اس سے ہر قسم کی ناانصافی کے خلاف لڑنے کے ساتھ ساتھ نفسانی وغیر سماجی خواہشات کو دبانے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ گاندھی جی نے سلبی احتجاج (Passive resistence) کا خیال انارکیوں سے لیا ہے لیکن ستیہ گرہ کی تکنیک کے ساتھ برت رکھ سماجی ناانصافی کے خلاف ایک ایسا آلۂ تحفظ ایجاد کیا جس کی مثال سماجی نظریات کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ خود انارکیوں میں گاڈون سے لے کر میکس اسٹرنر تک کسی کے یہاں اس قسم کی کوئی تکنیک نہیں ملتی، بقول آر، آر، دواکر:

He has been able to add a signizicant chaptex to social dynamics, a chapter which has opened new averuos of approach to the solution of human conflicts in a more civilized and way than attempted hither to any where in the world.

Diwakar R. R. : Gandhiji's Basic Ideas and Some Modern Problems p. 24

اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے کہ ستیہ گرہ کے عملی پہلوؤں پر بحث کی جائے۔

گاندھی جی کا تعمیری پروگرام بھی دراصل دیہی تعمیرِ نو کا پروگرام ہے اور گاندھی جی اس پروگرام کے ذریعہ درجہ دوم کا مثالی سماج قائم کرنا چاہتے ہیں جو اوّل درجے کے مثالی سماج کی تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہو۔ اسی لئے انہوں نے تعمیری پروگرام میں حسبِ ذیل دفعات شامل کی ہیں جو مکمل نراجی سماج سے انحراف کرنے کے باوجود اس طرف اشارے کرتی نظر آتی ہیں:

(۱) فرقہ وارانہ ہم آہنگی (۲) چھوت چھات کا خاتمہ (۳) نشہ بندی (۴) کھادی، دیہی صنعت کی ترقی اور گاؤں صفائی (۵) بنیادی تعلیم اور تعلیمِ بالغاں (۶) عورتوں کے مساویانہ حقوق (۷) قومی زبان اور صوبائی زبانوں کی ترقی (۸) معاشی مساوات (۹) کسانوں، مزدوروں اور آدی باسیوں کے حقوق (۱۰) کوڑھیوں کی سیوا (۱۱) ودھارتھیوں کی مدد اور (۱۲) مویشی سیوا۔[۱]

اس پروگرام پر ایک نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ انارکی طریقے پر حکومت و ریاست کی جگہ عوامی ادارں (papular institition) کو مروّج کرنے کی ایک تدریجی کوشش ہے لیکن عمرانی اصولوں پر جانچا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ پروگرام صرف ارتقاقِ دوم کے دیہی تمدن پر منطبق کیا جا سکتا ہے اور آج کا ہندوستان کھادی کے دور سے یقیناً آگے نکل چکا ہے اب اسے واپس نہیں لوٹایا جا سکتا۔ ہاں تعمیری پروگرام میں تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں اور کی جا چکی ہیں۔

---

[۱] بحوالۂ ہندوستانی سماجیات از ڈاکٹر جعفر حسن، ص: ۱۶۱

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے گاندھی جی کے ان تمام تصوّرات کی تکمیل دراصل ستیہ اور جو کوشش [illegible] ہے جسے صرف اہنسا ہی کے حصول کے لئے اپنایا جا سکتا ہے۔ اہنسا کی معجز نمائی پر گاندھی جی کو اس قدر بھروسہ تھا کہ وہ اُسے نہ صرف افراد کی اصلاح و تہذیب بلکہ اجتماعی زندگی میں ظلم و جبر کے مقابلے میں لئے، آزادی کی جدوجہد کے لئے، ملک کے نظم و نسق کے لئے، یہاں تک کہ بیرونی طاقت کی مدافعت کے لئے بھی کافی سمجھتے تھے۔ گاندھی جی کے خیال میں انسانیت موجودہ تہذیبی و تمدنی سطح تک اہنسا ہی کی بدولت پہنچ پائی ہے اور اہنسا ہی کی مدد سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ کیونکہ سارے سماجی رشتوں (حتیٰ کہ میاں بیوی کے تعلقات بھی) پر اہنسا محیط ہے اور اس کے بغیر سماجی زندگی کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عمرانی نقطۂ نظر سے غور کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ عدم تشدّد کو ایک ناقابلِ ترک اصول بنا کر گاندھی جی نے قدما میں Heraclitus، کوٹلیہ، ابن خلدون اور میکیاویلی سے اور جدید عمرانیوں میں Bagehot، Glumpowicz اور Sumner جیسے theorists سے اختلاف کیا ہے جو تصادم و تشدّد کو سماجی ارتقا کا جزوِ لاینفک قرار دیتے ہیں۔ افسوس گاندھی جی نے سماجی تصادم (Social Conflict) پر اتنا کم تعمق کیا ہے کہ اُن کا نظریۂ عدم تشدّد قطعی غیر سائنسی اور ناقابلِ عمل ہو کر رہ گیا ہے اور نتیجے میں اُن کے سارے نظریاتی ڈھانچے کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں۔ کیونکہ گاندھی جی میک ڈوگل اور فرائڈ کے پیش کردہ اِس نظریے سے بھی مستثنیٰ نظر آتے ہیں کہ انسانی عمل (رویّہ) بعض قوی جبلتوں اور بدنی دواعی (biologieal urges) کا نتیجہ ہوتا ہے، شعورِ عقلی کا نہیں۔

اس کے علاوہ گاندھی جی نے اپنے مثالی سماج میں فرد کے اخلاقی و رُوحانی ارتقا پر بے انتہا زور دیا ہے اور دیگر انارکیوں کی طرح اس حقیقت کو بھول گئے کہ اخلاقی ارتقا انسانی سماج کے پہلودار ارتقار کا ایک حصّہ ہے جسے جولین ہکسلے نے (fourth dimension) کا نام دیا ہے۔ نیز مادی ترقی کو نظر انداز کر کے سارے ہندوستان کو ارتقاقِ دوم کی منزل پر روکنا چاہا جو قانونِ قدرت سے لڑنے کے برابر ہے اور اس میں کامیابی کا امکان معلوم۔ مشین کی مخالفت بھی اسی قبیل کی چیز قرار دی جا سکتی ہے۔

تیسرا کمزور پہلو یہ ہے کہ گاندھی جی نے ہندوستان کی تہذیبی متوازیت (Cultural parallelism) کو ختم کرنے یا کم کرنے کی کوشش نہیں کی جس کے ہوتے ہوئے دیہاتوں کو واحدوں (units) میں بانٹنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دیہی سماج کا سنسکرتیاوا (Sanskrilization) اور شہری سماج کا مغربیاوا (westernization) ہندوستان کو دو مخالف سمتوں میں کھینچ رہے ہیں جس کی وجہ سے ایک قسم کا تہذیبی آلسیہ (cultural lag) پیدا ہو گیا ہے جسے رُوحانی ارتقا اور روزی کے لئے محنت کے تصوّر سے دُور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ بنیادی خامیاں نہ ہوتیں تو گاندھی کا درجۂ دوم کا مثالی سماج کا خواب ایک حقیقت میں بدل چکا ہوتا اور غالباً ہم اِس تہذیبی انتشار اور باہمی تصادم سے دوچار ہی نہ ہوتے، جن کا آج شکار بن رہے ہیں۔ ▲

ماخذات

(۱) اخلاقی سماجیات: ڈاکٹر جعفر حسن۔ انجمن ترقی اُردو، ہند (۲) ہندوستانی سماجیات: ڈاکٹر جعفر حسن ایضاً
(۳) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفۂ عمرانیات و معاشیات: بشیر احمد لدھیانوی۔ بیت الحکمت۔ لاہور



(باقی صفحہ ۱۰۵ پر دیکھئے)



# گاندھی جی کا تصوّرِ حیات

بیسویں صدی عیسوی تعمیری و تخریبی واقعات کی بنا پر ناقابلِ فراموش رہے گی۔ اس صدی میں ایک طرف دو عالمگیر جنگیں لڑی گئیں تو دوسری طرف کئی چھوٹے بڑے ملکوں اور براعظموں نے اپنے گلے سے غلامی کا طوق نکال پھینکا۔ بربریت، تخریب کاری اور انسانیت سوز مظالم ڈھانے کی ترغیب دینے والے لیڈر اسی دور میں پیدا ہوئے اور کروڑوں انسانوں کو آزادی کا ازلی حق دلانے والے مصلحینِ اقوام نے بھی جنم لیا۔

اس بحرانی دور میں اہلِ ہند عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھے۔ دراصل یہ وقفہ ہندوستانیوں کے لئے نہایت صبر آزما تھا۔ صحیح معنی میں ہندوستانی اپنے "براہیم" کے منتظر تھے جو اپنی مظلوم، محکوم اور ناگفتہ بہ حالت میں پڑی ہوئی قوم کے لئے شمعِ ہدایت روشن کرتا اور غیر ملکی سامراج کو ختم کرکے سوراج کا تصوّر پیش کرتا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ناسازگار حالات خواہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی قوموں کے دلوں کو پژمردہ اور بے حس بنا دیتے ہیں۔ حق بات سوچنے اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے کی قوت صلب ہو جاتی ہے۔ یہی حال ہم ہندوستانیوں کا برطانوی تسلط کے بعد ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے رعب، دبدبے اور شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور ہندو چونکہ ایک زمانے سے محکوم رہے تھے اس لئے سامراجیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے قاصر رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مصیبتوں اور آفتوں کا پہاڑ مسلمانوں اور ہندوؤں پر یکساں ٹوٹا۔ انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار پوری قوت کے ساتھ بڑھتا گیا اور مغلوب قومیں مغلوب تر ہوتی گئیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس سالوں میں یہاں کے مختلف ذی شعور لوگوں کے دلوں میں خیال آیا کہ کیوں نہ ہم سب متحد ہو کر اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ نکالیں۔ آہستہ آہستہ کوششیں شروع ہوئیں۔ ہندوستان کا ہر فرد اپنے اپنے طور پر اس مقصد کے حصول کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ لیکن ان سب کو کامیابی کی منزل تک لیجانے کے لئے کسی ایسے طاقت ور اور باعمل رہنما کی ضرورت تھی جو ہر قسم کی انسانی خوبیوں سے آراستہ ہو اور نہ صرف ہم کو ہمارے نصب العین کے حصول کا راستہ دکھائے بلکہ ہمارے سامنے باعمل زندگی گذارنے کا ایک ایسا دستورِ حیات پیش کرے جو روزمرّہ زندگی میں پیش آنے والے مرحلوں اور دشواریوں میں ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکے۔ ہماری خوش قسمتی سے گاندھی جی کی شکل میں بہت جلد ہم کو ایسا رہنما اور مصلحِ قوم مل گیا۔

گاندھی جی کی زندگی مختلف ادوار پر منقسم ہے۔ ابتدائی زندگی میں انہوں نے انسان پر ہونے والے شرمناک مظالم کا

مشاہدہ کیا۔ سنِ شعور کو پہنچنے پر انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ میں جھانک کر دیکھا اور خود کو نفرت، حسد، بغض، ذات پات اور بھید بھاؤ جیسی آلائشوں سے پاک کیا۔ جب انہیں اپنے دل و دماغ کی صفائی کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو انہوں نے اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ منعطف کی جو طرح طرح کی مصیبتوں میں گھرے ہوئے تھے۔

گاندھی جی مذہبِ انسانیت کے پیغمبر بن کر ہندوستان میں اُبھرے۔ اُن کی تعلیمات کا دارومدار انسانیت کی بلندی اور سرفرازی تھا۔ اُنہوں نے بلا تفریقِ مذہب و ملّت ہندوستانیوں کو برطانوی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے گُروں سے رُوشناس کرایا۔ ان گُروں میں عدم تشدد "Non-violence" کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ آزادی کا نعرہ لگانے کی ترغیب دینے کے علاوہ گاندھی جی کے دل کی گہرائیوں میں یہ بات بھی جاگزین ہو گئی تھی کہ ہندوستانیوں کا محض آزادی حاصل کر لینا ہی اُن کے مقاصد کی معراج نہیں ہے بلکہ وہ ان تمام بُرائیوں اور شر انگیزیوں کا قلع قمع کر دینا چاہتے تھے، جس کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں میں انسانیت نیست و نابود ہو چکی تھی۔ اِس طرح ہندوستانیوں کو آزادی دلانے کے علاوہ گاندھی جی کی ایک اور سوغات اُن کا انمٹ تصورِ حیات ہے جس پر گامزن رہ کر انسان اُن اعلیٰ بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے جس کی طرف ہر مذہب و ملّت کے پیغمبروں اور اوتاروں نے نشان دہی کی ہے۔

زندگی اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کی تکمیل دُوسرے کے بغیر ادھوری ہی نہیں بلکہ غیر ممکن بھی ہے۔ مذہب سے انسانی زندگی کا خمیر بنتا ہے اور انسانی زندگی کے اندر حیات و ممات کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل بھی ہوتی ہے۔ انہیں حقائق کے پیشِ نظر مفکرین و مبلغین مذاہب نے مذہب کو زندگی کے لئے ایک اعلیٰ ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ گاندھی جی نے بھی ایک فلسفی مفکر اور مصلحِ قوم کی حیثیت سے ہمارے سامنے ایک تصورِ حیات پیش کیا ہے جس کا تانا بانا مندرجۂ ذیل اصولوں سے تیار کیا گیا ہے۔

**انسان:** دنیا کی تمام مخلوقات میں انسان کا مرتبہ نہایت اعلیٰ اور افضل ہے اِس لئے اسلام میں اُسے اشرف المخلوقات کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ انسان مادی چیزوں کے حصُول کی خاطر پستی و تنزّل کی طرف بڑھ گیا ہے۔ گاندھی جی کی حساس طبیعت نے انسان کی ان برائیوں کو تاڑ لیا۔ اس لئے اُنہوں نے انسان کو اُس کی عظمت و بلندی کے احساس سے روشناس کرانے کی انتھک کوشش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ "انسان خدا کی اس مخلوق میں سے ہے جسے اپنے خالق کو پہچاننے کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے اس لئے اس کی روزمرہ زندگی کا مطمحِ نظر صرف مادی خوشی اور دیگر اشیاء کی حصول یابی ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حیات کا اعلیٰ و ارفع مقصد اپنے خالق سے قریب سے قریب تر ہونا ہے"۔ گاندھی جی کا یہ نظریہ اسلامی تعلیمات سے بہت نزدیک ہے۔ اِس اصول کی بنیاد پر بہت سے اصول وضع کیے گئے ہیں۔ انسان اپنے خالق کو پہچاننے کی کوشش میں یہ اچھی طرح جان جائے گا کہ رنگ و نسل، ذات پات اُونچ نیچ اور اِس قسم کی کئی چیزیں بے بُنیاد ہیں۔

**حُسنِ اخلاق:** حُسنِ اخلاق کا تعلق دلوں کی صحت و صفائی سے ہے۔ ہمارے دل جس قدر پاک و صاف ہوں گے، ہمارے خیالات اتنے ہی نکھرے ہوئے اور جذبات سُتھرے رہیں گے۔ حسنِ اخلاق کامیاب زندگی گذارنے کا ایک ایسا راستہ ڈھونڈ نکالتا ہے جس کے باعث ہر فرد صرف اپنی بھلائی اور بہبودی کو مدِ نظر نہیں رکھتا، بلکہ وہ اوروں کا خیال کرنا بھی سیکھ جاتا ہے اور اجتماعی طور پر سوچنے کا عادی بن جاتا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی کے نزدیک ایک باکردار آدمی اپنے آپ کو کسی بھی ذمے دار کام کے لائق بنا سکتا ہے اور یہی شخص ہزاروں، لاکھوں بھٹکے ہوئے انسانوں

کو راہِ راست پر لا سکتا ہے۔

**ادب "Discipline"**:۔ ادب کی اہمیت و افادیت اظہر من الشمس ہے۔ یہاں پر ادب کے نہایت وسیع معنی مُراد ہیں۔ بزرگوں اور اُستادوں کے ساتھ ادب سے پیش آنا ہی اس کے دائرے میں نہیں ہے بلکہ ادب - Dis-cipline ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دخیل ہے۔ ہمارے حرکات و سکنات اور ہماری ہر نقل و حرکت میں اس کا اہتمام ضروری ہے۔ گاندھی جی نے "ادب" کا جو تصوّر پیش کیا ہے اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ "اس کی تربیت جبری نہیں ہونی چاہیئے"۔ ادبی تربیت کی پہلی درس گاہ گھر اور دوسری سماجی ماحول ہے۔ گھریلو زندگی اور سماجی ماحول میں ادب کا عنصر پوری طرح رچ بس جائے تو ہماری ہر آنے والی نسل اِس زیور سے از خود آراستہ ہو جائے گی اور ہمارا نظامِ حیات 'ادب' کی زیب و زینت سے اِس حد تک سنور جائے گا کہ یہ چیز ہماری زندگی کا جزوِ لاینفک بن جائے گی۔ آج ادب کی عدم موجودگی ہمارے لئے سوہانِ رُوح بن گئی ہے۔

**سچائی**:۔ "سادہ زندگی اور بلند خیالی" گاندھی جی کا اوّلین فلسفہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تعلیمات میں جدیدیت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا پسند کرتے تھے اِس لئے اُن کے اِس اندازِ نظر نے ایسی باتوں میں رُوح پھونکدی ہے جسے ہم معمولی سمجھ کر فراموش کر جاتے ہیں۔ سچّائی کے پرچار سے مذہبی کتابیں پٹی پڑی ہیں اور یہ چیز ہر مذہب کے بنیادی تصوّرات میں شامل ہے لیکن اس چیز کو گاندھی جی نے انوکھے پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ وہ 'سچّائی' کو اپنی حیات کا سنگِ بنیاد گردانتے ہیں۔ 'برہماچاریہ' اور 'اہمسا' اِسی سچائی سے ایک وقفے کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ جب کبھی کام کرنے کا جذبہ اُبھرے تو اس جذبے میں صداقت کا عنصر کس حد تک کارفرما ہے یہ دیکھنا ضروری ہے، ورنہ کامیابی ہرگز ممکن نہیں۔ گاندھی جی کے نزدیک سچّی اور صاف بات کا اظہار اُن شرمناک اور سوچی ہوئی باتوں سے بدرجہا بہتر ہے جن کا اظہار ہی باعثِ ننگ ہو۔

**صحت و صفائی**:۔ صفائے قلب کے لئے صحت و صفائی لازم و ملزوم ہے اور اس کا دار و مدار بڑی حد تک ہمارے ماحول پر ہے اور ماحول کی شائستگی و نفاست کا دار و مدار ہمارے رہنے سہنے کے طریقوں اور پہننے اوڑھنے کے رواجوں پر ہے۔ اس ضمن میں ہماری ادنیٰ سی کوشش اور دلچسپی ہمیں بے انتہا قلبی سکون اور صحت بخش سکتی ہے۔ گاندھی جی نے حفظانِ صحت کے اصولوں اور صفائی کے پرچار کے لئے عملی ثبوت پیش کیا۔ اچھوتوں کے گھروں اور گندی سڑکوں کو خود صاف کیا۔ اُن کے اِن جرارت مندانہ اقدام کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور دیکھتے دیکھتے عوام میں حفظانِ صحت اور صفائی کا جذبہ اُبھر آیا لیکن ہنوز اس جذبے میں وہ صداقت پیدا نہیں ہوئی جس کے گاندھی جی خواہاں تھے۔

**آپسی رنجش**:۔ کینہ پروری، بغض، حسد اور رنجش انسان کے فطری تقاضے ہیں اور اُسی کے باعث بنی نوعِ انسان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ہر مذہب نے آپسی بیر رکھنے کی بڑی شدّ و مد کے ساتھ مخالفت کی ہے۔ آپسی رنجش گاندھی جی کے نزدیک انسانیت کے نام پر ایک بدترین داغ ہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ لوگوں کو اس سے دُور رہنے کی تلقین کی۔ وہ ہر حال میں اِس بدنما داغ کو دھو ڈالنا چاہتے تھے لیکن وہ اپنے اس خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے۔

**مُسکراہٹ زندگی ہے**:۔ کسی مفکر کا قول ہے کہ "کوئی شخص اس وقت تک پوری طرح ملبوس نہیں ہے جب تک کہ وہ مُسکراہٹ کے جامے سے مزیّن نہ ہو"۔ گاندھی جی کے چہرے پر مسکراہٹ کی پاکیزہ لہریں ہمیشہ رواں دواں رہتی تھیں۔ اِس مُسکراہٹ نے اُن میں ایک نامعلوم سی کشش پیدا کر دی تھی، جس سے ہر کس و ناکس متاثر ہوئے بغیر

نذر بنا تھا۔ گاندھی جی کی یہ مسکراہٹ ہمارے لئے بھی ایک عملی سبق تھی اور ہمیں بتاتی تھی کہ کس طرح پُرخطر زندگی کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔

## عدم تشدّد :-

عدم تشدّد کا فلسفہ گاندھی جی کے بنیادی تصورات میں سے ہے۔ اس فلسفے میں جائز حقوق کے حاصل کرنے کا سیدھا راستہ دکھایا گیا ہے، کُشت و خون، مار دھاڑ اور توڑ پھوڑ کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ ہندوستانی جب اس فلسفے کی ناقابلِ بیاں قوتوں سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے سختی کے ساتھ اِس فلسفے کی پیروی کی جس کے نتیجے میں انہیں اپنا نصب العین حاصل ہوا۔

## غلطی کا اقرار :-

کسی نے کہا ہے "To err is human" گاندھی جی اِس قول کے معترف ہیں اور وہ انسان کو مافوق الفطرت طاقتوں کا سرچشمہ قرار نہیں دیتے بلکہ وہ اسے سڑنے گلنے والے گوشت پوست سے بنا ہوا پُتلا سمجھتے ہیں اس لئے اس سے غلطی کا سرزد ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ غلطی کرنا انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ غلطی کے امکان و احساس سے آگاہی اور اس کا بلا خوف و خطر اقرار انسان کو انسان سے بالاتر بنا دیتا ہے۔ اِس عمل سے انسان کی روحانی طاقتوں کو تقویت پہنچتی ہے اور ضمیر کو پاکیزگی میسّر آتی ہے۔ گاندھی جی نے اعترافِ گناہ کو صفائیِ قلب کے ایسے سوہان سے تشبیہہ دی ہے، جو اس کی سطح کو ہر بار صیقل کرتا چلا جاتا ہے۔

## خاموشی :

گاندھی جی کے اِس تصوّر کا محرک ایک عجیب و غریب واقعہ تھا۔ اُنہوں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ صداقت کے متلاشی کو خاموشی اختیار کرنی ضروری ہے۔ وہ خاموشی کے دیگر اصلاحی فوائد سے بھی آگاہ تھے۔ لیکن وہ اس کو اپنانے سے اس وقت تک قاصر رہے جب تک اُن کی ملاقات جنوبی افریقہ کی مشہور خانقاہ "ٹراپسٹ" کے پادری سے نہ ہوئی۔ ٹراپسٹ کا جائزہ لیتے ہوئے گاندھی جی نے دیکھا کہ اس کی حدود میں راہِ حق کے متلاشی خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ گاندھی جی نے اس کا سبب دریافت کیا تو انہیں وہاں کے روحانی رہنما نے بتایا: "انسان نہایت حقیر و کمزور ہے اور بسا اوقات ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر ہم اس ملکوتی آواز کو سُننا چاہیں جو ہماری ذات سے ہر لمحہ وابستہ ہے تو ہمارا خاموش رہنا ضروری ہے۔" پادری کی اِس توضیح میں گاندھی جی کو وہی چیز نظر آئی جسے وہ ایک زمانے سے تلاش کر رہے تھے۔ چنانچہ گاندھی جی نے خاموشی کے برت رکھنے شروع کئے اور اپنے اندر خاموشی کا تریاق جذب کر لیا۔ جس کی بنا پر وہ روحانیت اور سچائی کے بھیدوں کو پا سکے۔ اسی خاموشی نے اُن کے نفس کو صبر، ضبط، حلم اور قناعت جیسی خوبیوں سے سنوارا۔ اِسی مفاد کے پیشِ نظر گاندھی جی خاموشی کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔

## غصّہ :

غصّہ ایک ایسی بُرائی ہے جو انسان میں پائی جانے والی تمام خوبیوں کو آنِ واحد میں ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ گاندھی جی نے غصّے کو ایسا پاگل پن بتایا ہے جو تعمیری کاموں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ فطری طور پر ہم غصّے اور تنافر کے جذبات سے پوری طرح عاری نہیں ہو سکتے لیکن ذرا سی کوشش کے بعد ضبط و تحمّل کے ذریعے ہم اِس خرابی سے نجات پا سکتے ہیں۔

## بھید بھاؤ :

آج سے چند سال پہلے ہندوستان بھید بھاؤ، ذات پات، اونچ نیچ جیسے گندے اور گھٹیا قسم کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ گاندھی جی کے قومی یکجہتی کے خواب کی تعبیر اِن آلائشوں کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں تھی، لہٰذا انہوں نے اِن

برائیوں کی بیخ کنی کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ہندوستان میں اُن قوموں کو اُبھرنے کا موقع ملا جو پیشہ ورانہ تفریق اور ذات پات کے بھیدوں کے مہلک امراض کا شکار تھیں۔ گاندھی جی کی اس تحریک میں سارے ملک کا مفاد مضمر ہے لیکن آج بھی اس حقیقت سے چشم پوشی کی جا رہی ہے۔

## عورت اور اُس کے حقوق:

عورت کو گاندھی جی ایثار و قربانی کا مجسمہ تصور کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں ہر عورت سیتا اور ساوتری کا اوتار ہوتی ہے۔ عصمت و عفت کے علاوہ وہ کردار کو عورت کا بہترین زیور قرار دیتے ہیں اور عورت کو زندگی کے میدان میں وہی مقام عطا کرتے ہیں جو آدمی کو حاصل ہے۔ گاندھی جی نے عورت کو وہ تمام حقوق دئیے جن کی وہ حقدار ہے اور ۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء کی تقریر میں یہاں تک کہا کہ،

"I should treat the doughters and sons on a footing of Perfect equality."

## بُزدلی:-

گاندھی جی ہندوستانی عورت کی سب سے بڑی کمزوری "بُزدلی" کے سخت شاکی ہیں۔ اُنہوں نے عورتوں کو ہمت سے کام لینے اور اپنی عزت کے تحفظ میں جان کی بازی تک لگانے کی ہدایت کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے عورتوں کو مشکلات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے اور ہنگامی حالات میں صبر و استقلال سے کام لینے کی ترغیب دی اور بُزدلی کو بدترین گناہ قرار دیا۔

## خوشترین زندگی کے چند اُصول:-

زندگی کی خوش حالی اور بُرخروئی کا راز راست گوئی کے اپنانے اور اہنسا کے برتنے میں ہے۔ بدترین حالات میں صاف گوئی سے کام لینا ایک بڑی قوت ہے۔ اہنسا انسانیت کے اعلیٰ اقدار کے نزدیک لے جاتی ہے اور ہمیں جبر و تشدد، ظلم و استبداد سے دُور رکھتی ہے۔ جو لوگ قومی خدمت کرنا چاہیں، اُن کے لئے تجرد کی زندگی گذارنا بڑی حد تک ضروری ہے۔ گھریلو ذمہ داریوں میں پھنس کر قومی خدمت کا تصور کچھ بے معنی سا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قومی خدمت کا صحیح جذبہ اس قسم کی صدہا قربانیوں پر مبنی ہے۔ انواع و اقسام کے مرغن کھانوں اور زبان کے چٹخاروں کے خلاف بھی گاندھی جی نے آواز بلند کی ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لئے ضروری غذا کے استعمال کی پُرزور تائید کرتے ہیں۔ منشیات سے پرہیز کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ مال و اسباب، دھن دولت اور عیش و آرام کی تمام چیزوں کے اکٹھا کرنے سے منع کرتے ہیں اور ان کی غیر ضروری فراہمی کو چوری کرنے کے برابر خیال کرتے ہیں۔ گاندھی جی کا یہ تصور بظاہر بہت خوش آئند لگتا ہے لیکن عملی طور پر یہ چیز بہت مشکل ہے۔ ان کے یہاں سرمایہ داری، ایسی چوری ہے جسے ہم دوسروں کی محنت اور خون پسینے کے عوض اکٹھا کرتے ہیں۔ مال و اسباب سے بے تعلقی انسان کو زندگی کی لامتناہی خوشیوں کے پوشیدہ خزانوں کا پتہ دیتی ہے۔ گاندھی جی نے جس فقر و قناعت کی تلقین کی ہے اُس کی اولین شرط یہ ہے کہ ہمیں سختی سے صرف اُن اشیاء کو اپنی سمجھنا چاہئے جو ہمارے جسمانی تقاضوں کے لئے اشد ضروری ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ہر لمحہ اپنی زندگی کو سادگی پسند بنائے رہنا چاہئے۔

یہ اور اس قسم کی بیسیوں خوبیاں ہیں جو گاندھی جی کے تصورِ حیات میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ گاندھی جی کے تصورِ حیات کی تشکیل ہند اسلامی فلسفے کے حسین امتزاج سے ہوئی ہے اس لئے گاندھی جی کے ان پیغامات میں ہمہ گیری پیدا

(باقی صفحہ ۱۰۵ پر دیکھئے)

حامد اللہ ندوی



# گاندھی جی اور تین مشرقی زبانیں

## عربی، فارسی، اردو

(۱)

ہمارا ملک ایک بڑا ملک ہے۔ اس میں سیکڑوں تہذیبی گروہ بستے ہیں جو اکثر حالات میں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ انہیں متحد کرنا اور ایک مرکز پر لانا کوئی آسان کام نہیں۔ جب تک ملوکیت کا زور تھا، مختلف فرماں رواؤں نے اپنی اپنی قوت کے بل پر انہیں متحد کرنے کی کوشش کی۔ کچھ کامیاب ہوئے، کچھ ناکام رہے۔ اشوک، سمدر گپت، چندر گپت ثانی، علاؤ الدین خلجی، اکبر اور عالمگیر کے نام اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں۔

انگریزوں کی آمد کے بعد یہ صورتِ حال باقی نہ رہی۔ غلامی کے نئے طریقوں نے زور آزمائی کے پرانے طریقوں کو بیکار کر دیا تو نئی تعلیم، نیا طرزِ فکر اور نئے سیاسی رجحانات نے اپنی خوشی سے متحد ہونے کے کچھ راستے سجھائے اور قوت کی بجائے اخوت، ظلم کی بجائے رواداری اور مطلق العنانی کی بجائے جمہوریت اور مساوات کی بنیادوں پر تمام ہندستانیوں کو ایک مقصد کے تحت جمع کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ایک کے بعد ایک رہنما سامنے آیا۔ ان رہنماؤں میں کچھ مشہور ہوئے، کچھ مقبول ہوئے اور کچھ محبوب بنے، مگر ہر دلعزیزی ایک اور صرف ایک کے حصے میں آئی، اور وہ گاندھی جی کی ذات تھی۔

گاندھی جی ہندوستان کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اُن کی نرمی، محبت، دلجوئی اور حسنِ سلوک نے ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے کو ان کا گرویدہ کر دیا۔ ایک مسلمان سخت جان تھا۔ ایک دن اپنا خون دے کر انہوں نے اس کے دل سے غبار کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دھو دیا۔ اب مسلمانوں کے سر بھی گاندھی جی کے نام پر بہ صد احترام جھک جاتے ہیں۔

(۲)

گاندھی جی اور مسلمانوں کے تعلق کا غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ گو مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اُن کا ساتھ دینے میں دیر کی ہو، انفرادی طور پر وہ ہمیشہ ہی ان کے ساتھ رہے ہیں اور قدم قدم پر اُن کے ساتھ تعاون کیا ہے، یہاں تک کہ ہندوستان سے دُور، بہت دُور جنوبی افریقہ میں جب گاندھی جی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تو اس وقت بھی مسلمانوں نے ان کے دست و بازو بن کر کام کیا اور اُن کے مشن کو ہر طرح آگے بڑھایا۔ مسلمانوں سے قریب رہنے کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ گاندھی جی اسلامی تعلیم، مسلمانوں کے ثقافتی پس منظر اور ان کے مخصوص لسانی تقاضوں

سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئے۔ خود گاندھی جی نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جگہ جگہ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اسلامی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے گاندھی جی نے "تلاشِ حق" میں ایک جگہ نٹال کے عبداللہ سیٹھ کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ "انہیں اس بات پر فخر تھا کہ ان کا مذہب اسلام ہے اور اس مذہب کے فلسفے پر تقریر کرنے کا انہیں بڑا شوق تھا۔ وہ عربی نہیں جانتے تھے مگر قرآن مجید کی تفسیر اور عام اسلامی امور میں خاصا دخل رکھتے تھے۔ مثالیں انہیں کثرت سے یاد تھیں اور جب چاہتے تھے ان سے کام لیتے تھے۔ ان کی صحبت میں مجھے اسلام سے اچھی خاصی عملی واقفیت ہو گئی۔ جب ہم دونوں میں بے تکلفی ہو گئی تو ہم اکثر مذہبی مسئلوں پر بحث کیا کرتے تھے۔"[1]

آگے چل کر ایک اور جگہ لکھا ہے "عبداللہ سیٹھ برابر مجھے اسلام کے مطالعے کی ترغیب دیتے رہے اور ہمیشہ اس کی کوئی نہ کوئی خوبی بیان کرتے تھے۔"[2]

عبداللہ سیٹھ اور بعض دوسرے مسلمان دوستوں کی ترغیب نے آخر انہیں قرآن مجید، سیرتِ نبوی اور سیرتِ خلفاء وغیرہ کے مطالعے کی طرف راغب کر ہی دیا۔ چنانچہ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ "میں نے سیل کا ترجمۂ قرآن خرید کر اس کا مطالعہ شروع کیا اور اسلام کے متعلق اور کتابیں بھی مہیا کیں۔"[3]

"میں نے ارونگ کی کتاب حضرت محمدؐ اور ان کے خلفاء کی سیرت اور کارلائل کا مقالہ 'پیغمبرِ اسلام کی مدح میں' پڑھا۔ ان کتابوں کی بدولت میری نظر میں آنحضرتؐ کی عظمت اور زیادہ ہو گئی۔"[4] "اور جب میں یروڈا جیل میں تھا تو میں نے مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ بھی پڑھی تھی۔ میں نے اسوۂ صحابہ بھی پڑھی ہے۔"[5]

گاندھی جی اس مطالعے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہیں قرآن مجید کی متعدد آیات، رسول اللہ کے بیسیوں اقوال اور خلفائے راشدین کے بہت سے واقعات یاد سے ہو گئے تھے۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں نہایت بے تکلفی کے ساتھ وقتاً فوقتاً ان کے حوالے دیا کرتے تھے۔ منوبہن گاندھی نے اپنی نواکھالی کی یادداشت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بار گاندھی جی نے "چہل قدمی کے موقع پر کرنل جیون سنہا جی کو پیغمبرِ اسلام کے چند بہت خوبصورت اقوال سنائے وہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ ساری انسانیت کے لئے مفید تھے، یہاں نقل کرنے کے لائق ہیں۔" اس کے بعد سولہ اقوال نقل کئے ہیں، جن میں چند یہ ہیں:

1. "Rush to the rescue of every human being, be he a Muslim or not, if he is oppressed.

3. He who has control over his mind, his feelings etc., is the greatest of conquerors.

5. A wieked scholer is the worst man on earth and an unletterd good man the best.

7. God smiles upon the person who pities His creatures."[6]

---

[1] تلاشِ حق، جلد اوّل، ص: ۱۳۹ ۔ [2] ایضاً، ص: ۲۱۰ ۔ [3] ایضاً، ص: ۲۱۰، [4] ایضاً، ص: ۲۴۱ ۔

[5] The Hindu Muslim Unity Ed. by A.T. Hingorani p. 90.

[6] The lonely Pilgrim by Manubahen Gandhi, pp. 189–90

ایک اور موقع پر کاٹھیاواڑ کے ایک سیاسی اجتماع میں ریاست کے مالی نظام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُنہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مثال دی اور فرمایا۔ "حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کروڑوں روپے بطور لگان وصول کرتے تھے، پھر بھی اُن کا ذاتی رہن سہن فقیروں کا سا تھا۔ اُنہوں نے ایک پائی بھی بیت المال سے نہیں لی۔ وہ اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے کہ رعایا کے ساتھ انصاف ہو اور ان کا یہ اصول تھا کہ دشمن کے ساتھ بھی برا سلوک نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ بھی انصاف برتنا چاہیئے۔"[1]

گاندھی جی نے اس مطالعہ اور تاثر ہی پر بس نہیں کیا بلکہ اُن کی ہمیشہ ہی یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کے قریب رہیں اور ان کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ بعض اوقات اس میں غلو بھی ہو جاتا تھا جس کو ہندو ناپسند کرتے تھے۔ ایک ایسا ہی موقع تھا، جب گاندھی جی کو علانیہ کہنا پڑا۔ "چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ میں اپنے مسلمان دوستوں سے زیادہ سے زیادہ ربط و ضبط رکھنے کی وجہ سے ہندو ذہن کو سمجھنے کے لائق نہیں رہا۔ میں یقیناً اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ ہندو ذہن کو سمجھنے کے لئے ہندوؤں میں رہوں جب کہ میرا رُواں رُواں ہندو ہے۔ میرا ہندومت بڑی حقیر چیز ہوتا، اگر وہ مخالف فضاؤں میں رہ کر پروان نہ چڑھ سکے۔ میرا ضمیر مجھے بتاتا ہے کہ ہندومت کی ضروریات کیا ہیں مگر مسلم ذہن کو سمجھنے کیلئے مجھے سخت جدّ و جہد کرنا ہوگی۔ میں اچھے مسلمانوں کے جس قدر قریب رہوں گا، اتنا ہی مجھے مسلمان اور ان کے کاموں کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ میری یہ بے انتہا کوشش ہے کہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملانے میں سیمنٹ کا کام انجام دوں۔"[2]

تین مشرقی زبانوں عربی، فارسی اور اردو سے گاندھی جی کی عملی دلچسپی بھی مسلمانوں سے قریب ہونے اور اُن کے ذہن کو سمجھنے کی اسی انتھک کوشش کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔

(۴)

گاندھی جی کے عربی جاننے کا سلسلہ اُن کے مطالعۂ قرآن مجید سے شروع ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کا تو خود گاندھی جی نے ایک سے زیادہ بار... اعتراف کیا ہے، چنانچہ مچھیور کے ایک اجتماع میں مسلمانوں کو فسادات سے باز رہنے کی تاکید کرتے ہوئے ایک بار انہوں نے فرمایا تھا۔ "خدارا مجھے بتاؤ اگر قرآن میں اشارۃً بھی کہیں اِس قسم کی گری ہوئی حرکت کرنے کی تلقین کی گئی ہو، میں نے قرآنِ شریف کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔"[3]

گاندھی جی نے مطالعہ کہا تو اس سے مراد محض تلاوت نہ تھی بلکہ بامعنی مطالعہ تھا، کیونکہ گاندھی جی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ قرآن مجید محض بے سمجھے بوجھے پڑھنے یا حفظ کرنے کی چیز نہیں، اس کے معنوں کا جاننا بھی بے انتہا ضروری ہے۔ اسی لئے جب بھی وہ مسلمانوں سے ملے یا اُن کی تعلیمی حالت وغیرہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پوچھ لیتے تھے کہ اُن میں قرآن مجید کے معانی سمجھنے والے کتنے ہیں۔ این کے بوس نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ نواکھالی کے فسادات کے بعد جب گاندھی جی نے متاثرہ علاقوں کا دورہ شروع کیا تو اس سلسلے میں وہ سری رامپور بھی پہنچے، وہاں وہ مولوی ولی اللہ قادری کے گھر تشریف لے گئے اور اس گاؤں کی آبادی وغیرہ کے متعلق تفصیلات معلوم کرنا چاہیں تو

1. Selection from Gandhi by N.K. Bose. P. 11.
2. The Hindu Muslim Unity Ed. by A.T. Hingorani, P. 65
3. The lonely Pilgrim by Manubahen Gandhi, p. 84.

پتہ چلا کہ وہاں ۱۴۵۰ مسلمان اور ۳۰۰۰ ہندو آباد ہیں۔ مسلمانوں میں صرف ایک میٹرکولیٹ ہے اور چار فائنل پاس ہیں، اتنے ہی انگریزی پڑھ سکتے ہیں۔ سب مل کر چالیس پچاس بالغ خواندہ ہوں گے، جب کہ اسکول جانے والے لڑکوں کی تعداد ۱۲۰ ہے۔ تقریباً ایک ہزار قرآن پڑھ سکتے ہیں مگر ان میں صرف دو یا تین ایسے ہیں جو معنی بھی سمجھتے ہیں ... گاندھی جی نے یہ سن کر فرمایا دیکھتے ہو ہندو اور مسلمان دونوں کی حالت کس قدر افسوس ناک ہے اور یہ کس قدر دہشت ناک بات ہے کہ دونوں کے دونوں اپنی اپنی مذہبی کتابوں کے معنی مطلب سے ناواقف ہیں۔"[1]

بوس نے آگے چل کر لکھا ہے کہ سری رامپور ہی میں ایک دوسرے موقع پر گاندھی جی نے مولوی صاحب اور صدر مدرس کی موجودگی میں ایک ایسے حافظ کی کہانی سنائی جنہیں پورا قرآن مجید حفظ تھا مگر وہ کسی آیت کے مفہوم سے واقف نہیں تھے، پھر فرمایا کہ اگر لوگ اپنی اپنی مذہبی کتابوں کے صحیح مفہوم سے ذرا بھی واقف ہوتے تو نواکھالی میں جو کچھ ہوا، وہ کبھی نہ ہوتا۔"[2]

گاندھی جی نہ صرف قرآن مجید پڑھتے اور اس کے معنی مطلب جانتے تھے بلکہ آخر آخر میں تلاوتِ قرآن مجید ان کے عبادتی جلسوں Prayer meetings کا ایک اہم جزو بن گئی تھی۔ پہلے تو یہ تلاوت جلسے کے اختتام پر ہوتی تھی لیکن بعد میں اس کو جلسے کے آغاز میں کر دیا گیا۔[3] " ایک بار ایک عبادتی جلسے سے پہلے گاندھی جی نے حسبِ معمول حاضرین سے پوچھا کہ کسی کو اس عبادتی جلسے میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھنے پر کچھ اعتراض ہے؟ تو ایک نوجوان نے اٹھ کر کہا کہ تلاوتِ قرآن کو اس عبادتی جلسے سے خارج کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے جواب دیا، میں یہ تو نہیں کر سکتا، البتہ پورے جلسے ہی کو برخاست کر سکتا ہوں۔ حاضرین نے کہا کہ وہ اس عبادتی جلسے کو جاری رکھنے کے حق میں ہیں پھر تو معترض بھی خاموش ہو گیا۔"[3]

عبادتی جلسوں کے علاوہ گاندھی جی اپنی تحریروں میں بھی قرآن مجید کے حوالے بہ کثرت دیا کرتے تھے۔ ایک بار علی گڑھ کے ایک مسلمان طالب علم نے خط کر انہیں لکھا "ادھر کچھ دنوں سے عدم تشدد کے بارے میں اپنی بات کو موثر بنانے کے لئے اسلامی تعلیمات اور قرآن مجید کے مبہم حوالے دینے شروع کر دیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے آپ مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے پسندیدہ نظریات کے پھیلانے کا آپ کو جو حق حاصل ہے اس پر تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن کیا آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی اس سے بڑھ کر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ ایک غیر مسلم اپنے مقاصد کے لئے اس کی مذہبی کتاب کو استعمال کرے۔ اسلام کے متعلق آپ کے خوشامدانہ الفاظ کا حاصل کچھ نہیں، کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ غیر مسلم ہیں اور قرآن آپ کے افکار و عقائد کا سرچشمہ نہیں ہو سکتا ... اس لئے یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ آپ آئندہ سے قرآن کے حوالے ہرگز نہ دیا کریں۔"

گاندھی جی نے خود ایک خاص موقع پر اس خط کے مضمون کا انکشاف کیا اور پھر فرمایا کہ "مسلمان ریسرچ اسکالر کا مجھ پر یہ الزام درست ہے کہ میں اپنے مطلب کی بات قرآن میں تلاش کرتا ہوں، ایسا کرنے میں یقیناً کوئی حرج نہیں ہے۔ جب تک کہ میں اصل ( Text ) کے ساتھ ایمانداری برتتا رہوں اور نیک نیتی اور کھلے دل سے اپنے مقصد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہوں۔"[4]

---

1. My days with Gandhi , by N.K. Bose. P. 64.

2. Delhi Dairy by M. K. Gandhi, P. 20 .

3. Ibid P. 38 .

4. The Hindu Muslim unity Ed. by A.T. Hingorani, PP. 122-23.

اس کے علاوہ بھی متعدد واقعات ایسے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی نہ صرف قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے واقف تھے بلکہ اُن کا استعمال بھی حسب ضرورت بڑے سلیقے سے کرتے تھے اور یہ بات بغیر عربی جانے مشکل ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ویسے خود گاندھی جی نے اپنی بعض تحریروں میں تراجم کی مدد سے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کا یہ مطالعہ محض تراجم تک محدود تھا۔ عربی سے وہ واقف نہ تھے کیونکہ ایک جگہ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے،

"Some Muslim friends also feel that I have no right to read Arabic verses from the Koran." [1]

یعنی بعض مسلمان دوست بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ مجھے قرآن کی عربی آیات پڑھنے کا کوئی حق نہیں۔ اس میں صاف طور پر Arabic verses کا لفظ استعمال کیا ہے۔

علاوہ ازیں ایک بار ایک عبادتی جلسے کے آغاز ہی میں سامعین میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہاں قرآنی آیات کا مطلب بیان کریں جو ابھی ابھی پڑھی گئی ہیں۔ گاندھی جی نے اُس کی درخواست منظور کرلی اور اپنی عبادت کے بعد والی تقریر میں اُن آیات کا مطلب بیان فرمایا۔" [2]

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ گاندھی جی نہ صرف یہ کہ قرآن مجید پڑھتے تھے بلکہ اس کے معنی مطلب سے بھی بخوبی واقف تھے اور اس پر اُن کو اتنا عبور تھا کہ اگر کوئی بر وقت سوال کر دے تو بغیر کسی تیاری کے بھی قرآنی آیات کا مطلب بیان کر دیں۔ اِس طرح وہ یقیناً عربی سے بھی واقف تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ عربی دانی قرآن مجید اور اُس کی آیات تک محدود تھی اور ایک عام عربی داں کی طرح عربی زبان میں لکھی ہوئی عام کتابوں کا پڑھنا اور سمجھنا ان کے بس سے باہر

(۴)

عربی کے مقابلے میں فارسی گاندھی جی نسبتاً کم جانتے تھے۔ اُن کی فارسی دانی کے متعلق ان کے حالات زندگی میں دو چار حوالوں سے زیادہ کہیں کچھ نہیں ملتا۔ "تلاشِ حق" میں اُنہوں نے اپنی طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ سنسکرت اور فارسی کے متعلق اپنے بچپن کے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

سنسکرت ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ سنسکرت میں میں سمجھتا تھا کہ سب کچھ حفظ یاد کرنا پڑتا ہے۔ یہ مضمون بھی چوتھے درجے سے شروع ہوتا تھا۔ چھٹے درجے میں پہنچ کر میری ہمت نے جواب دے دیا۔ جو استاد اِس مضمون کو پڑھاتے تھے وہ کام لینے میں بہت سخت تھے اور مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکوں پر بڑا جبر کرتے ہیں۔ سنسکرت اور فارسی کے اُستادوں میں باہم ایک طرح کی رقابت تھی۔ فارسی کے اُستاد لڑکوں کے ساتھ نرمی کرتے تھے۔ لڑکے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ فارسی بہت آسان ہے اور فارسی کے اُستاد بڑے اچھے آدمی ہیں اور طالب علموں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اِس آسانی نے مجھے لبھا لیا اور ایک دن میں فارسی کی جماعت میں جا بیٹھا۔ سنسکرت کے استاد کو اِس سے رنج پہنچا۔ انہوں نے بلا کر کہا، کیا تم بھول گئے کہ تم وشنو باپ کے بیٹے ہو؟ اپنے مذہب کی زبان نہیں پڑھو گے... آؤ، پھر سے سنسکرت کی جماعت میں شریک ہو جاؤ۔ اِس مہربانی نے مجھے شرمندہ کر دیا۔" [3]

---

1. The way To Communal Harmony by M.K. Gandhi, P. 45.

2. Delhi Diary by M.K. Gandhi, P. 247.

۳؎ تلاشِ حق، جلد اوّل، ص: ۴۸ - ۴۷۔

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی زبان کے معاملے میں بھی گاندھی جی کا ذہن بچپن ہی سے صاف تھا اور اُن کے تحت الشعور میں یہ بات پیوست سی ہو گئی تھی کہ فارسی سنسکرت کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ فارسی زبان کے علاوہ بھی گاندھی جی کو ہند و ایران کے تعلقاتِ دیرینہ کی اہمیت کا ہمیشہ ہی احساس رہا۔ بعض اوقات اُنہوں نے اپنے اس احساس کا برملا اظہار بھی کیا ہے، چنانچہ دلّی ڈائری ( Delhi Diary ) میں لکھا ہے کہ ایک عبادتی جلسے کے آخر میں گاندھی جی نے حاضرین کو بتایا:

" اس دن ایران کا سفیر ان سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ سفیر نے اُن سے کہا کہ ہندوستان اور ایران میں زمانہ قدیم سے دوستی چلی آ رہی ہے۔ دونوں ایک ہی آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان ایشیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور ایران ہندوستان کی بڑائی میں اپنی بڑائی محسوس کرتا ہے۔ سفیر کی خواہش تھی کہ ایران و ہند ماضی ہی کی طرح اب بھی دوستی کے بندھن میں بندھے رہیں۔ پھر گاندھی جی نے حاضرین کو یاد دلایا کہ گرودیو ٹیگور ایرانیوں کی دعوت پر ایران تشریف لے گئے تھے اور انہوں نے وہاں جو کچھ دیکھا، اس پر وہ بے حد خوش ہوئے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ " ایرانی ہمارے اپنے آدمی ہیں "

اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے گاندھی جی نے فرمایا کہ ایرانی سفیر فکرمند ہے کہ کہیں ہند و ایران کے یہ پُرانے تعلقات خراب نہ ہو جائیں۔ جب میں نے پوچھا کہ اس طرح سوچنے کی آخر وجہ کیا ہے تو اس نے بتایا کہ بمبئی میں کچھ ایرانیوں کو مارا ستایا گیا ہے۔ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ اِس پاگل پن میں کچھ لوگوں نے ایرانیوں کو بھی مسلمان سمجھ کر گھائل کیا ہوگا۔ مگر ایرانی سفیر نے مجھ سے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ حکومت بمبئی نے اِس فساد کو دبانے کے لئے بروقت کارروائی کی ہے اور وہ مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں کے رویّے سے مطمئن ہے۔ پھر اُس نے اپنی حکومت کی طرف سے ہندوستان کو یہ یقین دلایا ہے کہ باوجودیکہ وہاں کچھ لوگ ہندوستان میں ہونے والے واقعات کی مبالغہ آمیز خبروں کی وجہ سے فساد پھیلانا چاہتے ہیں لیکن حکومت ایران کڑی نظر رکھے ہوئے ہے اور کسی قیمت پر وہ ہندوستان کی دوستی سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی۔ اُس نے بتایا کہ ہندو، مسلمان اور سکھ تاجر اب بھی ایران میں نہایت امن و چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"[1]

فارسی زبان کی طرف گاندھی جی کا یہ دیرینہ میلان اور ہند و ایران کی قدیم رسم و راہ کی اہمیت کا یہ شدید احساس دونوں باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اُنہیں فارسی زبان سے بھی ہمیشہ ہی دلچسپی رہی اور اور زبانوں کی طرح فارسی سیکھنے کی بھی اُنہوں نے اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں ضرور کوشش کی ہوگی۔ بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تھوڑی بہت فارسی ضرور جانتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اُنہوں نے پاکستان کے متعلق اپنی نیک تمنّاؤں کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا:

" مجھے یاد پڑتا ہے کہ سنہ ۱۸۹۶ء میں جب میں دلی یا آگرہ فورٹ، ٹھیک سے یاد نہیں، دیکھنے کے لئے گیا تھا تو میں نے اس کے ایک پھاٹک پر ایک شعر لکھا ہوا پایا، جس کا اگر ترجمہ کیا جائے تو یہ ہوگا:

if There is a paradise on earth
It is here, it is here, it is here.

جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ قلعہ اپنی پوری شان و شوکت کے باوجود بھی کوئی جنّت نہیں تھا، مگر میں دل سے یہ

---

1. Delhi Diary by M.K. Gandhi P. 326.

چاہوں گا کہ وہ شعر ازراہِ انصاف پاکستان کی ہر دہلیز، ہر دروازے پر کندہ ہو۔[1]

گاندھی جی نے اِس میں جس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے وہ فارسی کا حسبِ ذیل مشہور شعر ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

(۵)

یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ گاندھی جی اُردو جانتے تھے اور اتنی اُردو جانتے تھے کہ دُوسروں کو پڑھا بھی سکیں، خود گاندھی جی نے "تلاشِ حق" میں جنوبی افریقہ کے ٹالسٹائی فارم میں کئے ہوئے اپنے تعلیمی تجربات کا ذکر کرتے ہوئے، اپنے اُردو سیکھنے اور پڑھانے کا ذکر اِس طرح کیا ہے:

"میں تامل اور اُردو پڑھاتا تھا۔ تامل میں نے جو کچھ سیکھی، سفر اور جیل میں سیکھی تھی۔ میری ساری کائنات پوپ کی مشہور کتاب معلّمِ تامل تھی۔ اُردو رسم الخط میں نے ایک سفر میں تھوڑا بہت سیکھا تھا اور زبان میں میری معلومات ان عربی فارسی الفاظ تک محدود تھی جو مسلمان دوستوں کی صحبت میں سُنتے تھے۔"

اِسی سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ "مسلمان لڑکوں کو اُردو پڑھانا زیادہ سہل تھا۔ وہ اُردو رسم الخط جانتے تھے۔ میرا کام بس اتنا تھا کہ اُنہیں پڑھنے کا شوق دلاتا رہوں اور ان کا خط دُرست کر دیا کروں۔"[2]

گاندھی جی کو اُردو زبان کا عملی تجربہ کس قدر زیادہ تھا، وہ اُن کے حسبِ ذیل جُملوں سے بھی ظاہر ہے جو انہوں نے اپنے ایک ہندی داں دوست کو اُردو سیکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھے تھے:

"تم تھوڑی سی ہندی جانتے ہو، اُردو میں آسانی سے آگے بڑھ سکتے ہو۔ فارسی رسم خط کا سیکھنا بڑا آسان ہے۔ اِس میں ۳۷ آوازوں کی ترجمانی کے لئے بُنیادی علامتیں بہت تھوڑی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان حروف کو جوڑنا ذرا دقت پیدا کرتا ہے لیکن حروفِ تہجی اور ان کو ملانے کا طریقہ جاننے کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا، بشرطیکہ تم روزانہ ایک گھنٹہ دو۔ اِس کے بعد اگر تم روزانہ آدھ گھنٹہ بھی اس کی مشق کروگے تو چھے ماہ کے اندر اندر اتنی اُردو سیکھ لوگے کہ اپنا کام چلا سکو۔"[3]

گاندھی جی نہ صرف اُردو لکھتے، پڑھتے اور بول لیتے تھے، بلکہ وقت ضرورت اُردو میں تقریر بھی کر لیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اپنے ایک دلچسپ تجربے کا گاندھی جی نے "تلاشِ حق" میں ذکر کیا ہے۔ خلافت کمیٹی کا جلسہ تھا اور حسرت موہانی کا سامنا گاندھی جی کو اپنی بات شمالی ہند کے اُردو داں طبقے کو سمجھانی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"میرے لئے یہ بڑی مشکل تھی کہ اپنا مطلب ہندی یا اُردو کے مناسب الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایسے مجمع میں جو زیادہ تر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر مشتمل تھا، مدلّل تقریر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میں نے کلکتہ کی مسلم لیگ میں اُردو میں تقریر کی تھی، مگر وہاں تو صرف چند الفاظ میں اپنے محبت اور خلوص کا اظہار کر دیا تھا، یہاں صورت دوسری تھی۔ یہاں مجھے ایسے مجمع کو اپنا زاویۂ نظر سمجھانا اور اپنا ہم خیال بنانا تھا جس سے مخالفت نہیں تو تنقید کا اندیشہ

---

1. The Hindu Muslim Unity Ed. by A.T. Hingorani p. 180.

۲۔ "تلاشِ حق"، جلد دوم، ص: ۲۴، ۱۲۳۔

3. Our Language Problem by A.T. Hingorani p. 57.

ضرور تھا، مگر میں نے دل میں سوچا کہ چھینپنے سے کام نہیں چلے گا۔ میں یہاں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ دہلی کے مسلمانوں کی فصیح اور شستہ اُردو میں تقریر کروں، بلکہ اس لئے کہ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اپنے خیالات ظاہر کردوں۔ چنانچہ میں نے یہی کوشش کی اور اس میں مجھے کامیابی ہوئی۔" لہ

تحریر و تقریر کے علاوہ خطوط کے معاملہ میں بھی گاندھی جی کا رویہ بڑا ہمدردانہ تھا۔ وہ اپنے مسلمان دوستوں کو جو صرف اُردو جانتے تھے، اُردو میں لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ خود نہیں تو اپنے اُردو جاننے والے ساتھی سے لکھواتے اور اس پر اُردو میں دستخط کرتے تھے۔ چنانچہ منو بہن گاندھی نے اپنی نواکھالی کی یادداشت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ گاندھی جی نے صبح کی عبادت کے بعد گرم پانی کے ساتھ تھوڑا سا شہد لیا اور اَنناس کا رس نوش فرمایا اور پھر ہُنّر بھائی ( Hunnerbhai ) سے اُردو میں رسول الرحمان Rasul-ur-Rahman انصاری صاحب وغیرہ کے نام خطوط لکھوائے اور ان پر خود ہی اُردو میں دستخط کئے۔

گاندھی جی کا اُردو کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔ سیرۃ النبیؐ اور اُسوۂ صحابہؓ وغیرہ کا ذکر تو آ ہی چکا ہے۔ بعض مقامات پر مولانا آزاد کی تفسیر کا بھی حوالہ دیا ہے۔

اُردو شاعروں میں گاندھی جی کو اقبال بہت پسند تھے۔ اُنہوں نے ایک سے زیادہ موقعوں پر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اقبال اور اُن کے اشعار کے حوالے دیئے ہیں۔ ایک بار انہوں نے فرمایا کہ "میں بھی شاعر اقبال مرحوم کی طرح اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہندو مسلمان جو ایک عرصۂ دراز سے ہمالہ جیسی مضبوط فصیل کے زیر سایہ رہتے ہیں اور گنگ و جمن کا پانی پیتے ہیں، دنیا کو دینے کے لئے ایک بے مثال پیغام رکھتے ہیں۔" تلہ اس سے گاندھی جی کا اشارہ شاید اقبال کی مشہور نظم "ہمالہ" کی طرف ہے جس کا پہلا شعر ہے:

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں	چُومتا ہے جُھک کے پیشانی کو تیری آسماں

ایک اور موقع پر مذہبی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے گاندھی جی نے فرمایا: "سچی مذہبی تعلیم تو یہ ہے کہ ہم سب کو دوست بنائیں اور سب کی خدمت کریں۔ پھر اقبال کا یہ شعر سُنایا:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیَر رکھنا	ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا" کلہ

منو بہن گاندھی نے اپنی نواکھالی کی یادداشت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "جب ہم اپنے دَورے کے سلسلے میں چاند پُور پہنچے تو وہاں گاندھی جی نے عوام سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور اثنائے تقریر میں اقبال کے اشعار سُنا کر اُن سے درخواست کی کہ وہ اِن اشعار کے مطلب کو اپنے اتحاد و اتفاق کے ذریعے سچ کر دکھائیں۔ شعر یہ تھے:

"Religion teaches love, not hate;
Of many creeds we're brothers still;
Indians we're all at any rate;
India is ours, love her we will. ۵

---

۱۔ تلاش حق، جلد دوم، ص ۳۱۲۔

(2) The lonely Pilgrim by Manubahen Gandhi p. 257. — لہ تلاش حق جلد ۲، ص ۳۱۲

(3) The way to communal Harmony by M. K. Gandhi. pp. 9-10.

(4) Ibid. p. 12. (5) The lonely Pilgrim by Manubahen Gandhi p. 264.

یہ ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ یہ اقبال کے کن اشعار کا ترجمہ ہے۔ قیاس یہ ہے کہ یہ بھی ترانۂ ہندی کے اُسی شعر کا آزاد ترجمہ ہے جس کا اُوپر ذکر آچکا ہے۔

ایک اور موقع پر جب گاندھی جی نے اقبال کا "ترانۂ ہندی" سُنا تو خوش ہو کے کہا: "مجھے آج بھی وہ دن یاد ہیں کہ جب جیل میں میرا ایک مسلمان ساتھی اقبال کی نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔ بعد میں یہ نظم آنجہانی سرلا دیوی چودھرانی کی میٹھی اور سُریلی آواز میں سُننے کی مجھے عادت سی ہو گئی تھی۔ اب یہ تیسرا موقع ہے کہ میں اِس نظم کو اتنی میٹھی اور اثر انگیز آواز میں سُن رہا ہوں۔ اِس نظم کے بول بھی اس کے سُروں ہی کی طرح میٹھے ہیں۔" [۱]

(۶)

اُوپر اسلامی ثقافت سے گاندھی جی کی واقفیت اور عربی فارسی اُردو سے ان کی عملی دلچسپی کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اُنہیں اسلام اور اس کے ماننے والوں کے ثقافتی تقاضوں کا اچھی طرح علم تھا۔ گو نظریاتی طور پر انہوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ ایک مستقل تہذیبی گروہ کی حیثیت سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ شاید یہ اُن کی سیاسی مجبوری ہو، لیکن عملی طور پر اُن کی پُوری زندگی مسلمانوں کے انہی تقاضوں کو ہندوؤں سے منوانے اور اُن میں اعتماد بحال کر کے اُنہیں ہندوؤں سے قریب لانے کی ایک مسلسل تھکا دینے والی کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں تھی۔ اِن تین مشرقی زبانوں کو بھی وہ مسلمانوں کے انہی مخصوص تقاضوں کا ایک حصّہ سمجھتے تھے اور ہمیشہ اُن کی تعلیم پر زور دیتے تھے، چنانچہ ایک بار انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا تھا:

"اب میری رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں مقامی زبانوں کے علاوہ ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی، انگریزی کی بھی جگہ ہونی چاہیئے۔ کوئی صاحب اِس لمبی فہرست کو دیکھ کر نہ ڈریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم کے نظام پر زیادہ توجہ کی جائے اور لڑکوں پر سارے مضامین غیر زبانوں کے ذریعے پڑھنے کا بوجھ نہ ڈالا جائے تو ان زبانوں کے حاصل کرنے میں دقت نہ ہوگی، بلکہ ہنستے کھیلتے سیکھ لی جائیں گی۔ اگر کوئی شخص ایک زبان علمی اصول کے مطابق سیکھ لے تو اُسے اور زبانیں آسانی سے آجاتی ہیں۔" [۲]

اصل میں ہندی گجراتی اور سنسکرت کو ہم ایک زبان سمجھ سکتے ہیں اور اِسی طرح عربی فارسی کو بھی۔ اگرچہ فارسی آری، اور عربی سامی خاندانِ السنہ سے ہے لیکن عربی فارسی دونوں میں بڑا قریبی رشتہ ہے اور دونوں کی پُوری نشو و نما اسلام کی ترقی کے طفیل میں ہوئی ہے۔ اُردو کا میں نے ایک الگ زبان کی حیثیت سے ذکر نہیں کیا، کیونکہ اس نے صرف و نحو ہندی کی اختیار کی ہے اور الفاظ زیادہ تر عربی فارسی سے لئے ہیں۔ اس لئے جو شخص اچھی اُردو سیکھنا چاہے اُسے لازم ہے کہ عربی فارسی پڑھے اور جو شخص اچھی ہندی، گجراتی، بنگالی یا مرہٹی سیکھنا چاہے اُسے لازم ہے کہ سنسکرت پڑھے۔" [۳]

اِس رائے میں گاندھی جی نے جو کچھ کہا ہے وہ ان تین مشرقی زبانوں کے متعلق اُنکے عقیدے کو ظاہر کرتا ہے جو بڑی حد تک دُرست ہے۔ صرف اُردو کے معاملے میں وہ صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ لیکن انہوں نے یہ رائے ۱۹۳۰ء سے پہلے دی تھی۔ بعد میں انہوں نے اس کو بھی مان لیا تھا کہ مسلمان ہندوستان بھر میں اُردو بولتے ہیں اور وہ ہر صوبے میں ایک کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں [۳] اور اُردو زبان اور رسم الخط دونوں ضروری ہیں [۴]، اور اپنے ان نظریات پر وہ تا دمِ مرگ قائم رہے۔ غالب نے کہا ہے:

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے　　مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

---

[۱] The way To communal Harmony p. 107　　　　[۲] تلاشِ حق، جلد اول، ص ۳۸۱

[۳] Our Language Problem P. 80　　[۴] Ibid p. 88.

گوری شنکر گپت
ترجمہ: ل م شاہد



# باپو، فرصت کے لمحوں میں

باپو اپنی زندگی کے آخری دنوں تک کوئی نہ کوئی زبان سیکھتے ہی رہے۔

سیوا گرام آشرم میں مریضوں کی سیوا کے بعد صبح کو ساڑھے آٹھ سے ساڑھے نو بجے تک باپو تحریری کام کرتے تھے۔ نواکھالی یاترا کے دوران وہ مستقل مزاجی کے ساتھ بنگلہ بھاشا سیکھنے لگے۔ چند ہی روز بعد انہوں نے بنگلہ میں خط لکھنے اور بات چیت کرنے میں کافی ترقی کرلی تھی۔ بچوں سے وہ بنگلہ میں مذاق کرتے تھے، سب کو خوب ہنساتے تھے۔ بنگلہ کی تعلیم حاصل کرنے میں ان کو کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر نرمل داس سے بھی مدد ملی۔

انہوں نے اردو کی تعلیم یرودا جیل میں منظر علی سوختہ سے حاصل کی تھی۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا۔ "بھائی منظر علی سوختہ ایک قیمتی ساتھی ہی نہیں، بلکہ میرے لئے تو ایک آدرش اردو معلم بھی تھے۔"

یرودا جیل میں انہوں نے جیل کی لائبریری سے اردو کی تمام کتابیں منگوا کر پڑھی تھیں۔ وہ چھ گھنٹے مطالعہ کرتے تھے۔ ایک دن باپو کو اردو لکھتے دیکھ کر سردار پٹیل نے مذاقاً کہا۔ اس میں من لگ گیا تو اردو منشی کا اوتار لینا پڑے گا۔"

۱۹۴۲ء میں آغا خاں محل میں نظر بندی کے زمانے میں اردو کا خوب مطالعہ کرتے تھے۔ بائبل اور قرآن شریف کا بھی مطالعہ کیا۔

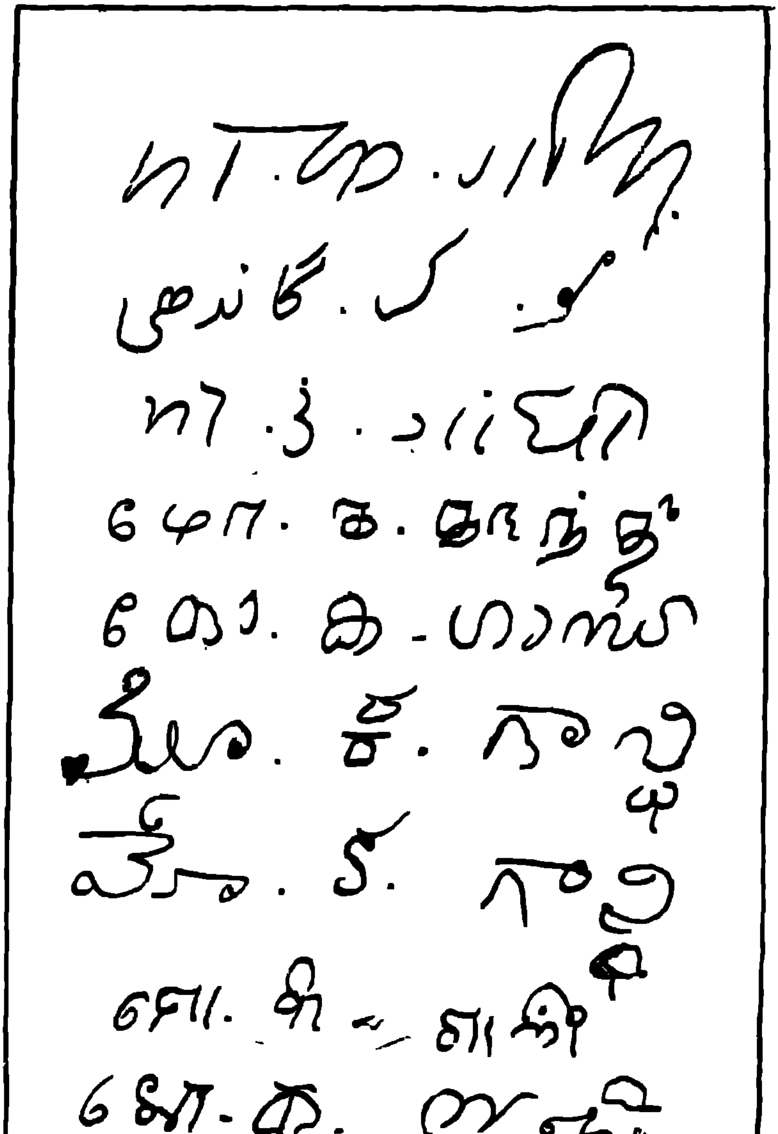
۱۹۴۴ء میں ان کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ اسی بنا پر آغا خاں محل سے انہیں رہائی مل گئی۔ رہائی کے بعد راجہ جی کے اصرار پر باپو نے ایک ماہ آرام لینا قبول کر لیا تھا۔ فرصت کے لمحوں میں انہوں نے اپنا تمل بھاشا کا پرانا علم تازہ کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی ارشنکرن اور ڈاکٹر سوشیلا نائر نے مدد کی تھی۔ جب وہ جنوبی افریقہ میں تھے تو وہاں بھی وہ تمل پڑھتے تھے۔ قانون کی کتابوں کو بخوبی سمجھنے کے لئے انہوں نے لیٹن زبان بھی سیکھی تھی۔ وہ فرانسیسی، سنسکرت اور مراٹھی بھی جانتے تھے۔ انہوں نے مراٹھی کاکا کالیکر سے یرودا جیل میں سیکھی تھی۔

گجراتی تو ان کی اپنی زبان تھی۔

ان کی انگریزی سے متعلق سی۔ ایف۔ انڈریوز نے کہا تھا

"گاندھی جی کی انگریزی ایک تعلیم یافتہ انگریز داں کی انگریزی جیسی صاف اور خوبصورت ہے۔ ایسی انگریزی بھارت ورش میں بہت کم لوگ لکھ سکتے ہیں۔"

باپو اکثر گجراتی، ہندی، بنگلہ اور انگریزی میں خط لکھتے تھے۔ کبھی کبھی اُردو میں بھی لکھتے تھے۔ دستخط تو ان کو چودہ زبانوں میں کرنے کا شوق تھا۔ دستخطوں کے نمونے ذیل میں درج ہیں۔




اپنا تحریری کام خود ہی کرنا اُنہیں خاص طور پر پسند تھا۔ پنسل سے خط وغیرہ لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹے کاغذ پر لکھنے میں انہیں جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یرودا جیل سے لکھے گئے ان کے ہزاروں خط چھوٹے چھوٹے پرزوں ہی پر ملتے ہیں۔ اخباری کاغذ پر بھی وہ خط لکھتے تھے۔ پوسٹ کارڈ لکھ کر وہ اپنی کفایت شعاری کا ثبوت دیتے تھے۔

وہ خط جو ایک طرف لکھے ہوئے آتے تھے، ان خطوط کے سادہ کاغذ کو بھی وہ استعمال کرتے تھے۔ چھٹیوں میں لگی ہوئی پن کو نکال کر حفاظت سے رکھتے تھے۔

وہ اپنے خط میں اپنا دل نکال کر رکھ دیتے تھے۔ جلد بازی میں خط نہ لکھنا اُن کی خاص خوبی تھی۔ بغیر نظر ثانی کئے وہ خط ڈاک میں نہیں ڈالتے تھے۔ ان کو ڈاک کے وقت کا بھی بہت خیال رہتا تھا۔

ایک بار مضمون لکھ کر پھر اس میں کانٹ چھانٹ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی دوسری طاقت اُن سے لکھوا رہی ہے۔ صرف ہندوستانی ہی نہیں بلکہ غیر ملکی اخبار بھی باپو کے خیالات کو جاننے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ اس کے لئے وہ سمندری تار کے پیسے اُن کے پاس پیشگی بھجوا دیا کرتے تھے۔

"وشال بھارت" کے ایڈیٹر شری رام شرما سیواگرام میں جسمانی محنت بھی کرتے تھے اور خوب لکھتے بھی تھے۔ اس پر باپو نے کہا تھا:

"جس اخبار نویس میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہوں اس میں سونے کے ساتھ خوشبو بھی ہوتی ہے۔" ▲

---

## بقیہ "گاندھی جی اور اُن کی خوش مذاقی"

لگانے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اُن کا یہی راسخ عقیدہ اور پکا ایمان تھا کہ دنیا بھر میں تشدد، جنگ و جدال، خون، غارت گری دیکھتے ہوئے بھی اپنے سچے اصولوں سے نہ ہٹے اور نہ اُن کے قدم ڈگمگائے۔ اُن کا توازن ہمیشہ قائم رہا۔ اُن کی بات چیت میں کبھی نہ قنوطیت ہوتی تھی اور نہ یاس، بلکہ اُن کی خوش مذاقی اور مزاح کا شعور اور حس اُن حالات میں اور بھی زیادہ اُجاگر ہوتے رہے۔ لوگوں نے اُن کو ایک بہترین ظریف کے روپ میں مسکراہٹیں بکھیرتے، خوشیاں لٹاتے اور لوگوں کی مشکلات کو حل کرتے ہی دیکھا۔ ▲

## بقیہ "ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور گاندھی جی"

سے رہ گئی اور ہندوستان کی لسانی تقسیم کے بعد ہندوستان کا لسانی مسئلہ اُلجھ کر رہ گیا۔ ایسے میں گاندھی جی کے وہ الفاظ یاد آرہے ہیں کہ "میں ہمیشہ تو تمہارے پاس رہوں گا نہیں مگر تم میرے رخصت ہو جانیکے بعد میرے الفاظ کو یاد کروگے ..... عدم رواداری مذہب کی نفی ہے۔"

مددگار کتابیں:


1. Linguistic Affairs of India by Ram Gopal.
2. The Indian Language Problem.
3. Language: by Ram Manohar Lohia
4. National Problem in India to day.
5. India's National Crisis by S. Mohan Kumarangalam.
6. Language Issue in the Indian Coustituent Assembly 1946-1950. by P.K. Rao.
7. Language Probiems of Developing Nations Ed. by T.A. Fishman, C.A. Ferguson.
8. مشترکہ زبان: مہاتما جی نے کیا سوچا تھا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

خموش سرحدی



# دو گاندھی

سالہا در کعبہ و بُت خانہ مے نالدحیات    تاز بہ بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اور ہمارے یہاں دو گاندھی! دو دانائے راز؟ ایک ہی زمانے میں؟ ــــ دو دیدہ ور ــــ ایک ہی دور میں گو:
این سعادت بزور بازو نیست۔ "گاندھی دنیا بھر کے لئے ایک ہی کافی ہے"۔ یہ تھا جواب، جو سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان نے اخبار نویسوں کو دیا تھا۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ آپ کو "سرحدی گاندھی" کیوں کہتے ہیں؟ اس کے باوجود انہیں سرحدی گاندھی کہا جاتا ہے۔ اور اس دانائے راز کی یہ بات بھی صحیح نکلی کہ "گاندھی ایک ہی کافی ہے"۔ بظاہر دونوں گاندھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان میں ظاہری مماثلت کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ وہ یوں کہ مہاتما گاندھی کا جنم ہندو خاندان میں ہوا اور مذہباً وہ ہندو تھے، جب کہ خان باچا ایک مسلم گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور اس لحاظ سے انہیں مسلمان ہی کہنا چاہیئے۔ عمر کے لحاظ سے بھی نمایاں فرق موجود ہے کیونکہ مہاتما جی کی شتابدی منائی جا رہی ہے اور باچا خان کی ۸۰ ویں سالگرہ ــــ یعنی باچا خان مہاتما جی سے ۲۰ برس چھوٹے ہیں۔ قدوقامت کو لیجیئے، مہاتما گاندھی چھوٹے سے قد کے دُبلے پتلے آدمی اور سرحدی گاندھی تقریباً ساڑھے چھ فٹ کے اونچے لمبے، چوڑے چکلے، ہاڑ کے سُرخ و سفید، قوی ہیکل انسان، جن کے ہاتھ کی ہتھکڑی اور پاؤں کی بیڑی قلمروِ برطانیہ کے کسی زنداں میں نہ مل سکی۔ یہ بھی صحیح کہ مہاتما جی پور بندر کے ایسے نامی گرامی خاندان کے فرد تھے جو تعلیم و تعلّم، نسلی روایات اور خاندانی تہذیب کے زیر اثر جنگجو قبیلہ نہیں تھا اور اس طرح اُن کی پرورش ایسے امن پسند ماحول میں ہوئی جیسا کہ عام طور پر فطری یا طبعی اہنساوادیوں کا ہوا کرتا ہے، جب کہ اس کے قطعی طور پر برعکس سرحدی گاندھی صوبہ سرحد (پختونستان) کے اس پٹھان قبیلے میں پروان چڑھے، جن کی تواریخ خوفناک لڑائیوں اور بھیانک جنگ و جدال کی زندہ کہانی ہے۔ عدم تشدد اور پٹھان قوم کے فطری شجاعت و تہوّر، دو متضاد طاقتیں تھیں، جن کا مشترک تصوّر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ پٹھانوں کے قومی تواریخ میں اوّل و آخر یہ معجزہ محض سرحدی گاندھی کے نام سے منسوب کیا جائے گا، جنہوں نے پٹھان قوم کی فطرت میں عظیم انقلاب پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی اور اُنہیں اہنسا (عدم تشدّد) کی عملی تعلیم دی۔ مہاتما جی تعلیم کے لحاظ سے بیرسٹر تھے جب کہ خان عبدالغفار خان انٹرنس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کے علاوہ دونوں گاندھیوں کے درمیان خوراک اور پوشاک، بودوباش کے طور طریقے، رسوم و روایات غرضیکہ

سب کچھ مختلف تھا۔ تاہم تسلیم کرنا ہوگا کہ مہاتما گاندھی کی عظیم روحانی شخصیت نے خان عبدالغفار کو پوری طاقت سے متاثر کیا اور اس میں مہاتما جی کو کوئی زیادہ کد و کاوش سے کام لینا نہیں پڑا، کیونکہ خان باچا کی ابتدائی تربیت اُن کے شفیق والدین کے ہاتھوں میں ہوئی جو اپنی سچائی، دین داری اور خدا پرستی کے لحاظ سے علاقے بھر میں مشہور تھے اور پھر باچا خان فطری طور پر شریف النفس اور خاموش طبع واقع ہوئے تھے اور ان کی یہی صلاحیت فطری اصولوں کے ردّ و قبول میں انسانِ آزادی بننے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئی۔ چونکہ ہر دو گاندھی مذہب کی بنیادی سچائیوں میں عقیدہ رکھتے تھے اور مذہب یا دھرم کی ہمہ گیر اور انسانیت نواز قدروں کو صدقِ نیت سے صحیح تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے دونوں کے لئے یہی عقیدہ "قدرِ مشترک" کے طور پر کافی تھا اور دونوں کا اس مقام پر باہمی اشتراک قدرتی ــــ مہاتما جی کے نزدیک "جنتا جنار دھن" کی سیوا، خود شناسی اور خدا شناسی کا واحد اور اہم ذریعہ تھی اور خان باچا روحانی عظمتوں کے حصول کے لئے "سچی خدائی خدمت گاری" کی اہمیت کو دل سے تسلیم کرتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ روحانیت کے اُن مقدس راستوں کے راہی اور مسافر تھے۔ جہاں گورو نانک جی اور شاہ شرف رحمۃ اللہ علیہ، گورو ارجن دیو اور میاں میر صاحبؒ مہاتما کبیر اور رویداس جی اور ان کے متعدد ہم سفر اپنے مبارک قدم رکھ چکے ہیں۔ فرقہ وارانہ کشاکشیں اور تعصب و بغض کی آلائشیں ان بزرگوں کے راستے میں حائل نہیں ہو سکیں۔ تقدیسِ آدمیت کے اس ارفع مقام پر ہمیں ہر دو گاندھی ہر لحاظ سے "دو قالب و یک روح" نظر آتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مہاتما گاندھی مئی ۱۹۳۸ء میں صوبہ سرحد تشریف لائے تھے، تو ایک اجتماع میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا تھا۔ "میں تو سچے ہندو، اچھے مسلمان اور خالصہ سکھ کو چاہتا ہوں۔ اگر ہر آدمی اپنے اپنے مذہب کے اصولوں پر صدقِ نیت اور خلوصِ قلب سے عمل کرے تو مجھے وشواس ہے کہ دنیا میں بھی اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ اور نہ ہی مذہبی یا سیاسی لڑائیاں ہوں گی۔ یہ جھگڑے اور باہمی تفرقہ و فساد محض اس لئے ہے کہ مذاہب کو ماننے والے اُن کی بنیادی سچائیوں پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔" اور یہی عقیدہ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان صاحب کا ہے، وہ اپنی بھی زندگی میں صوم و صلوٰۃ کے پابند اور اسوۂ حسنہ کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ غالباً مرحوم علامہ اقبال نے انہیں کے حق میں کہا ہے ؏ "مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"۔

مئی ۱۹۳۸ء میں گاندھی جی کے قیام کا انتظام خان باچا کے گاؤں اتمان زئی میں کیا گیا تھا۔ چونکہ قبل ازیں سرحدی گاندھی اور اُن کے بڑے بھائی شہید ڈاکٹر خان صاحب ۱۹۳۴ء میں ایامِ جلاوطنی کے دوران دو برس تک واردھا میں گاندھی جی کے پاس رہ چکے تھے اور اس زمانے میں انہوں نے گاندھی جی کے طریقۂ کار اور آشرم کے اصولوں کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اس لئے اپنے گاؤں میں انہوں نے تکلف و تصنع کے بغیر گاندھی جی اور ان کے شرکائے سفر کے لئے انتظامات کئے تھے تاکہ انہیں واردھا آشرم سے مختلف صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ گاندھی جی کے پروگرام کے مطابق یہاں وقت پر پرارتھنا سبھائیں لگتی تھیں جن میں کلام پاک کی آیتیں اور گرنتھ کے شبد پڑھے جاتے یہ گاندھی جی کے مخصوص مشاغل تھے جو کم و بیش ہر جگہ پابندیٔ وقت کے ساتھ جاری رکھے جا سکتے تھے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنے روزمرہ کے پروگرام میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ البتہ دور دراز سے آئے ہوئے خدائی خدمت گار جرگوں سے وہ بے وقت بھی مل لیا کرتے تھے۔ اور ان کی خلوص مندانہ ملاقاتوں پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی، شاید اس لئے کہ انہیں پٹھانوں کی فطری صاف گوئی، جفاکشی اور سادگی دل سے عزیز تھی اور وہ جانتے تھے کہ یہ محنت کش لوگ جس وقت اپنی معروفیات سے فراغت پاتے ہیں، گاندھی جی کے درشنوں کو آجاتے ہیں۔ ایک دن گاندھی جی پرارتھنا سبھا کے بعد اپنی تقریر میں فرمایا،

"میں نے کچھ دن پٹھانوں میں رہ کر تجربہ حاصل کیا ہے اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے ہندوستان میں ستیہ اور اہنسا کے اصول کامیاب نہ ہوسکے تو یہ ان اصولوں کی نہیں میری کمزوری ہوگی۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ یہاں پٹھانوں کی دھرتی پر یہ اصول ضرور کامیاب ہوں گے۔ مجھے باچا خان اور اُن کے بہادر خدائی خدمت گاروں پر بھروسہ ہے کہ انہوں نے یہ اصول اپنی روائتی بہادری اور سچے دل سے اپنائے ہیں۔ خدا نے چاہا تو ستیہ اور اہنسا کی آخری فتح اِسی مقدس سرزمین پر ہوگی۔" اسی دورے میں مہاتما جی نے درۂ خیبر کے لنڈی کوتل پہاڑیوں برطانوی سرکار کی حدودِ سلطنت کے آخری بورڈ کے پاس کھڑے ہوکر دیکھا تو فرمایا: "شریف فرنگیوں نے اپنا آخری بورڈ یہاں پر نصب کرکے مغربی تہذیب و شرافت کا ثبوت دیا ہے ورنہ ان کے اثرات اور حکمتِ عملی کے آثار تو وہ سامنے کے بلند ترین کوہِ ہندوکش کے پار بھی پائے جاتے ہیں۔" اس پر انگریز افسر جو وہاں موجود تھے نہایت شرمندہ ہوئے اور دوسرے لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ وہ اس مقام سے آگے قبائلی پٹھانوں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کو دیکھیں لیکن برطانوی سرکار انہیں اجازت دینے پر رضامند نہ ہوئی۔ سرحد کے کچھ فاصلے سے ہزاروں قبائلی پٹھانوں نے گاندھی جی کا سواگت نعرے لگا لگا کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر کیا۔ ان کا مخصوص نعرہ تھا۔ "ملنگ بابا زندہ باد"۔ اِس لئے کہ وہ "مہاتما" لفظ سے ناآشنا تھے۔ مئی ۱۹۳۸ء میں گاندھی جی کو صرف ایک ہفتہ اتمان زئی میں رہنے کی اجازت حکومت ہند نے دی تھی لیکن اسی سال اکتوبر کے مہینے میں انہیں دوبارہ اجازت دی گئی کہ وہ صوبہ سرحد میں پانچ ہفتوں تک قیام اور دورہ کرسکتے ہیں، کیونکہ سابق دورے کے خوشگوار اثرات نے انگریزوں کے اس احساس کی تردید کردی تھی کہ گاندھی جی سے مل کر پٹھانوں میں باغیانہ جوش بھڑک اُٹھے گا اور حکومت کے لئے انتہائی مشکلات کا باعث بن جائیں گے۔ ان کے دوسرے دورے کی اجازت ملتے ہی پورے صوبۂ سرحد میں اُن کے استقبال کی گرم جوشانہ تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن احتمال تھا کہ سردی کے باعث شاید گاندھی جی اپنا دورہ ملتوی کردیں گے۔ اُن کے خاص خاص مشیروں نے انہیں منع بھی کیا کہ صوبۂ سرحد کی یخ بستہ ہواؤں کے موسم میں اُن کا دورۂ سرحد اُن کی صحتِ جسمانی کے لئے مضر ثابت ہوگا۔ لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ وہ مجوزہ تاریخوں کے مطابق ہر جگہ جائیں گے اور وہ التوائے دورہ کے حق میں نہیں ہیں۔ اور واقعی ان کا یہ دورہ صد درجہ کامیاب بھی ہوا۔ لاکھوں سادہ دل انسانوں نے انہیں پشاور، کوہاٹ اور بنوں کے انتہائی ٹھنڈے علاقوں میں محض ایک کھدر کی چادر اور لنگوٹی میں لپٹے دیکھ کر اُن کی روحانی قوت اور خود ضبطی کا اعتراف کیا۔ اِس دورے میں کوہاٹ سے بنوں تک میں بھی اُن کے شریکِ سفر ہونے کی سعادت حاصل کرسکا۔ ضلع کوہاٹ سٹوڈنٹس کانگریس "Student Congress" کے زیرِ اہتمام کچھ فرائض ہمارے ذمے لگا دیئے گئے تھے، اِس لئے چالیس کے قریب طالب علم خدمت گاروں کا یہ دستہ بھی گاندھی جی کے عظیم قافلے کے ساتھ اس وقت تک رہا جب تک وہ بنوں کی حدود سے نکل کر ڈیرہ اسمٰعیل خان کے علاقے میں بخیر و عافیت داخل نہ ہوگئے۔ اِس دورے میں خان عبدالغفار خان خدائی خدمتگاروں، سالاروں کے ہمراہ پورے صوبے میں اُن کے ساتھ رہے اور اس طرح پورے صوبے کے عوام نے دونوں گاندھیوں سے استفادہ کیا۔ انہیں دنوں بنوں کے ہندو اور سکھوں کا ایک وفد مہاتما جی ملا اور عندالملاقات اُن سے پوچھا۔ "مہاتما جی! دلیش کی آزادی میں ہندو سکھ پٹھانوں کا کیا حصّہ ہوگا؟ کیونکہ آبادی کے لحاظ سے اِس صوبے میں ہم تو صرف تین فیصد ہیں۔" مہاتما جی نے ہلکے سے تبسّم کے ساتھ برجستہ فرمایا: "پکھت دلیش (پختون دلیش) کی یہ دھرتی میرے لئے تیرتھ استھان ہے۔ یہاں کے پٹھانوں کا پاک لہو آزادی کے دیوی کے ماتھے

کا بلک (تشتقر) بننے کے لئے بے قرار ہے۔ کاش میرا جسم بھی اسی مٹی سے بنا ہوتا، تاکہ وطن کی دیوی کے ماتھے پر جگمگانے کا فخر حاصل کر سکتا۔" اتنا کہہ کر اُن کی مستقبل بین نگاہیں گہرے تفکر میں کھو گئیں اور ماحول پر گمبھیر خموشی چھا گئی۔ ہندو اور سکھ ہراساں ہو کر چلے گئے۔ لیکن اس کے بعد اس عظیم مفکر کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ میں اُن دنوں ہفتہ وار رائے عام پشاور کا مدیر حصۂ ادب تھا۔ اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس میں مہاتما جی کے اس جواب کی تفصیل پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ میں اس سے زیادہ اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا" اور پھر وہ کہتے بھی کیا؟ جب کہ وہ جانتے تھے کہ اخبار نویسوں کی رسائی مستقبل کے دھندلکے میں پوشیدہ حقائق تک ممکن نہیں۔ استفسار کرنے پر خان باچا نے اس ضمن میں کہا۔ گاندھی جی نے جو کچھ فرمایا ہے میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں تک صحیح ہے لیکن اگر ان کی پیشگوئی صحیح ہے تو خدا ہمیں استقامت دے تاکہ ہم ان کے بھروسے اور اعتقاد کے مطابق آزادیٔ وطن کے لئے قربانیاں دے کر ثابت کر سکیں کہ ہم واقعی خدائی خدمتگار ہیں اور ہمارے دیش کے سب سے بڑے آدمی نے ہم سے ایثار و قربانی کی توقع رکھ کر غلطی نہیں کی۔ اگر خدا کے فضل و کرم سے ہم ثابت قدمی کیساتھ ایسا کر سکے تو ہمیں اپنے لہو پر فخر کرنے کا حق ہوگا۔" آپ نے پٹھانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما جی نے ہم غریب، مفلس، اَن پڑھ پٹھانوں سے متعلق اپنی جو رائے ظاہر کی ہے اس سے ہماری اخلاقی اور خدمتگارانہ ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اب ہمیں اپنے کردار پر زیادہ کڑی اور مسلسل نظر رکھنی ہوگی۔ غالباً بنوں میں مہاتما جی ڈاکٹر عبدالصمد خاں کے یہاں مقیم تھے جب کہ جنوبی وزیرستان کے قبائلی سرداروں نے ڈپٹی کمشنر بنوں سے درخواست کی کہ انہیں گاندھی جی اور باچا خان سے ملنے کی اجازت دی جائے لیکن انگریز حکومت نہیں چاہتی تھی کہ مہاتما جی اور باچا خان کی آواز ان نیم باغی سرکش سرداروں کے کانوں تک پہنچے۔ حالانکہ خود خان باچا نے کئی بار پولیٹیکل ایجنٹ اور متعلقہ افسران سے احتجاجاً کہا کہ انہیں قبائلیوں سے ملنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ قبائل کے جنگجو پٹھانوں کو عدم تشدد کی راہوں پر ڈال سکیں بلکہ آپ نے یہاں تک بھی کہا کہ اگر میں اور مہاتما جی ان کو عدم تشدد کا قائل کر سکے تو اس کا بہت بڑا فائدہ فرنگی سرکار کو ہوگا جو ہر برس ان قبائلیوں کی شورش انگیزی کو دبانے کے لئے کروڑوں روپیے جا طور پر صرف کرتی ہے اور پھر بھی ان کے خلاف حکومت غصہ و نفرت کے جذبات پر قابو نہیں پا سکتی۔" لیکن برطانوی پولٹیکل دماغ اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت نہیں چاہتے تھے کہ دونوں گاندھی قبائلی جرگوں سے ملیں اور انہیں حکومت برطانیہ کے خلاف عدم تشدد کی وہ فاتحانہ تکنیک سکھائیں، جس نے ہندوستان کے طول و عرض میں برطانوی سامراج کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ انہیں سرحدوں پر مہاتما جی نے اپنی دھیمی سی آواز میں قبائلی بہادروں سے کہا تھا کہ وہ محض تشدد کے ذریعے اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اُن کی خون آلود تواریخ شاہد ہے کہ وہ آزادی کے سچے پرستار ہیں۔ انہیں صحیح انقلابی طریقۂ کار اپنانا چاہیئے۔ عدم تشدد بزدلوں کا ہتھیار نہیں، یہ تو سُورماؤں کا ہتھیار ہے اور پٹھان ایک بہادر قوم ہے۔ میں جب کہتا ہوں کہ ستیہ اور اہنسا کو آخری اور عظیم فتح حاصل ہوگی تو اِسی پٹھان دھرتی پر، اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ پٹھان قول کے پکے، سادہ، سچے، بے خوف اور بہادر لوگ ہیں اور عدم تشدد ایسے ہی بہادروں کا حقیقی حربہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ جو مجھے ان قبائلی بھائیوں سے ملنے نہیں دیتے، وہ میری آواز کو اُن تک پہنچنے سے نہیں روک سکیں گے۔" اس مقام پر مجھے اپنے اُستاذ مکرم علامہ سیماب اکبرآبادی رح کی اُس منظوم پیشگوئی کا اعادہ بھی کرنا چاہیے جو انہوں نے اِسی خاک پاک کے سلسلے میں پشاور کے ریڈیائی مشاعرہ

میں کی تھی۔ اپریل ۱۹۴۶ء ہی سے اُستاذی مرحوم و مغفور کی یہ نظم پٹھانوں کے لئے آیت والہام کا درجہ رکھتی ہے لیکن اس کا ایک بند جس میں پیغمبرانہ انداز میں مستقبل کے لئے فرمان جاری کیا گیا ہے، اس کی صحت و جواز کو پٹھان قوم قلب و رُوح کی گہرائیوں سے تسلیم کرتی ہے۔ شاعرِ مستقبل علامہ مرحوم کی متذکرہ نظم کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

خدا کا ہاتھ نکلے گا انہیں جبروت گاہوں سے — نشیدِ امن آئے گی انہی پُرپیچ راہوں سے
مگر یہ راستے سیدھے نہ ہوں گے کج کلاہوں سے — انہیں ہموار کرنا ہے محبت کی نگاہوں سے
محبت کا یہ دعویٰ ہے نشاطِ جاوداں ہوں میں
شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں

مرحوم و مغفور اُستادِ محترم علامہ سیماب اکبرآبادی پیغمبرانہ اعلائے کلمۃ الحق کا چرچا اب ارضِ پختون کے عوام میں ہوگا یا نہیں؟ لیکن تقسیمِ ہند تک تو صوبہ سرحد میں یہ اشعار زبان زدِ خلائق تھے۔ اُن دنوں پشاور کی ادبی تقریبات اور کوہاٹ کے شعری اجتماعات میں تین دن تک میں بھی اپنے شفیق اُستاد کے ساتھ شریک رہا۔ نظم ہذا کے نشر ہونے کے بعد شاہی مہمان خانہ میں، جہاں سیماب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقیم تھے، علماء، فضلاء، صاحبِ ذوق سیاسی اور غیر سیاسی لوگوں کا تانتا بندھ گیا، سیکڑوں لوگوں کو یہ نظم بار بار سُنائی گئی اور یہ فرضِ مقدس میں نے اور جناب عزیز آخر وارثی صاحب کو ادا کرنا پڑا۔ بڑے بڑے آدمی آتے ہم سے نظم سُن کر حضرت مولانا رحمۃ کے ہاتھ چُوم کر چلے جاتے۔ کیا زمانہ تھا اور کیسے لوگ تھے ؎

وہ صُورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں — اب جن کے دیکھنے کو انکھیاں ترستیاں ہیں

سو گئیہ مہاتما گاندھی کی پیش گوئی پُوری ہو چکی اور سرحدی گاندھی اور اُن کی قوم سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں، بفضلِ خداوہ انہیں پُورا کرنے کے لئے حیاتِ مستعار کی کڑی سے کڑی آزمائش میں سُرخرو نکلے۔ لیکن ابھی تک ایک عظیم شاعر کی پیش گوئی باقی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ پٹھان من حیث القوم بارگاہِ شاعر میں بھی فتحیاب و سرخرو ہو کر باریاب ہوگی۔ یقیناً "خدا کا ہاتھ" انہی جبروت گاہوں سے نکلے گا اور نشیدِ امن و سلام انہیں دشوار گذار راہوں سے بلند ہوگی ـــــ بے جا نہ ہوگا اگر یہاں پٹھانوں کی سیاسی بیداری اور اخلاقی طریقہ کار کا مختصر پس منظر بھی بیان کر دیا جائے۔ خان باچا اور مہاتما گاندھی کے مشترکہ دورۂ سرحد کا مقصد ۱۹۳۸ء میں یہ نہیں تھا کہ خدائی خدمتگاروں یا عام پٹھانوں کی تحریک و تنظیم کو مزید توانائی و تقویت حاصل ہو، کیوں کہ پٹھانوں نے ۱۹۲۹ء کے انقلابی دور ہی میں اپنی سیاسی بیداری کے لئے تیزی سے قدم مارنے شروع کر دیئے تھے تاکہ وہ کانگریس کی تحریکِ آزادی کے ساتھ ایک ہی سطح پر تنظیمی سرگرمیوں میں شریک ہو سکیں اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے انہیں نہایت صدق دلی اور مُسلسل محنت سے باقاعدہ کام کرنا پڑا جب کہ انگریز حکومت نہیں چاہتی تھی کہ پٹھان قومی و اجتماعی حیثیت سے سیاسیات میں حِصّہ لیں اور اُن کا اجتماعی شعور عصریت کے سیاسی تقاضوں سے آشنا ہو۔ اس صورت میں اُسے قبائلی بفر اسٹیٹ "Buffer state" اور افغانستان کی سیاسی بیداری کا بھی اندیشہ تھا اور رُوس کی اشتراکیت جس کا اثر افغانستان اور آزاد قبائیل سے دست بردار ہونے کی صورت میں برطانوی حکومت کے لئے مہلک ہو سکتا تھا، بھوت بن کر برطانوی ذہن میں منڈلا رہی تھی۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب رُوس سے ۲۰ــ۱۹۱۹ء کے زمانۂ ہجرت و خلافت کی ہنگامہ آرائیوں اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کی متحرک نظریاتی پالیسی نے صوبہ سرحد و بلوچستان کے خوابیدہ دماغ پٹھانوں کو ذہنی طور پر جھنجوڑ کر رکھدیا تھا، کیونکہ خستہ حال مُہاجرین کے قافلے انہیں راہوں سے ایران و افغانستان کی طرف بڑھتے تھے اس لئے قدرتی تھا کہ پٹھان قوم کے مذہبی جذبات پر اِن عبرتناک مناظر کا شدید اثر ہو۔ نتائج کے خوف سے قطعِ نظر،

سادہ لوح اور بے تعلیم پٹھان اس تمام تر سیاسی شکست و ریخت سے اتنا ضرور سمجھ سکے کہ یہ سب کچھ محض حکومتِ برطانیہ سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ انکے قلب و روح میں ہزاروں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے دردناک مناظر انگریزوں کے اقتدار کے خلاف غصہ و نفرت کے شعلے بھڑکانے کے لئے کافی تھے۔ دوسری طرف اعلیٰحضرت غازی امان اللہ خان مرحوم شاہِ افغانستان بھی، جو مسلمان مہاجروں کے واحد میزبان اور پشت پناہ تھے، یہی چاہتے تھے کہ ہندوستان بھر میں وسیع پیمانے پر انگریزی اقتدار کے خلاف بغاوت کی صورتِ حالات سے استفادہ کیا جائے۔ روس کی نئی اشتراکی حکومت بھی لینن جیسے مدبر کی رہنمائی میں خواہش مند تھی کہ برطانوی طاقت گھریلو مشکلوں میں الجھ کر انقلابِ روس کے مقاصد کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کر سکے۔ لیکن موجودہ صورتِ حال سے کم و بیش یہ دونوں ملک فائدہ نہ اٹھا سکے۔ کیونکہ افغانستان اقتصادی لحاظ ہی سے نہیں بلکہ ہر لحاظ سے کمزور ملک تھا اور فرنگیانہ سازش کے تحت غازی امان اللہ پر کفر و ارتداد کے فتوے لگائے جا رہے تھے اور اس کی حالت روز بروز پتلی ہو رہی تھی۔ مہاجرین کے رہنما مرحوم مولانا عبیداللہ سندھی مہاجرین کے بھیس میں برطانوی جاسوسوں اور مخبروں کی روز افزوں ریشہ دوانیوں سے بدحواسی کے عالم میں مبتلا تھے اور ان سے ہزاروں تباہ حال پناہ گزینوں کی دوبارہ آبادکاری کا مسئلہ حل نہ ہو سکتا تھا۔ ادھر روسی اشتراکیت اپنے ابتدائی مرحلوں میں زارشاہی کی بچی کھچی طاقتوں کے خلاف اپنے ترقی پسندوں کی نئی تنظیم جدید خطوط پر کرنے میں مصروف تھی اور کامریڈ لینن کی بے وقت موت کے باعث اسے بھی مہلک خطروں کا سامنا تھا۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ سامراج کی تخریبی کارروائیوں سے بچنے کے لئے ہندوستان کی برطانیہ دشمن جدوجہد سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ اس نے افغانستان کے وزیرِ خارجہ عبدالہادی خان پریشان (مصنف گل خانۂ پریشان) کے ذریعے مہاجرین کے ایک وفد کو دعوت دی۔ چنانچہ حکومتِ کابل کی رضامندی سے مہاجرین کا ایک وفد روس گیا۔ اس وفد سے مذاکرات کی روشنی میں روس نے عالمِ اسلام سے دوستی استوار کرنے میں بھرپور استفادہ کیا اور روس کے ترکی اور ایران سے وہ شدید اختلافات، جو جنگی حالت پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے، ختم ہو گئے۔ لیکن ہجرت کی بدترین ناکامی نے تحریکِ خلافت کی کمر توڑ کر رکھ دی اور روس و افغانستان مہاجرین کی عدم تنظیم سے ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں سے مسلح بغاوت کا فائدہ اٹھانے میں ناکام ہو گئے۔ تاہم اس تمام تر سیاسی جدوجہد کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کے خلاف نفرت و کدورت کا جذبہ متحدہ طور پر بھڑک اٹھا۔ مہاتما گاندھی نے عوامی شکست کے عبرتناک انجام کے زیرِ اثر کانگریس کے سیاسی مستقبل کے لئے محتاط اور غیر جذباتی حقیقت پسندانہ طریقۂ کار تجویز کرنے میں مدد حاصل کی اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان نے جو رضاکار کے طور پر مہاجرین کی خدمت عملاً کر کے حکومتوں کی مصلحت اندیشیوں اور عوام کی تباہی و بربادی کے دردناک مناظر دیکھ چکے تھے، کربناک حالت میں فیصلہ کیا کہ وہ اپنے صوبے میں اس وقت تک تعمیری طریقے سے پٹھانوں کے اجتماعی فکر و شعور کو حالات کے مطابق بیدار کرنے کی سعی کرتے رہیں گے، جب تک کہ وہ خود تغیر پذیر حالات کا کم و بیش تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا نہ کر لیں۔ چنانچہ ہر دو گاندھی ان حالات سے بقدرِ استعداد متاثر ہوئے۔ لیکن دونوں کے درمیان رفاقت و تعاون کے امکانات اس وقت معرضِ ظہور میں آئے جب کہ خان عبدالغفار خان کو تعمیری کارروائیوں کے جرم میں مقدمہ چلائے بغیر تین برس کے لئے قید کر دیا گیا اور صوبہ سرحد کے پٹھانوں پر پوری شدت سے تباہی نازل کر دی گئی۔ مسلم لیگ نے پٹھانوں کی مدد سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ برطانوی سرکار کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ مجبوراً خان باچا نے اپنے ان ساتھیوں کو، جو انہیں جیل میں صوبہ سرحد کی تباہی و بربادی کے حالات سے باخبر کرنے آئے تھے، اور مسلم لیگ کی اعانت سے مایوس ہو چکے تھے، کانگریس کے رہنماؤں کے پاس بغرضِ استمداد جا

کی ہدایت کی۔ کانگریس کے رہنماؤں نے پٹھانوں کی مدد کرنا اس شرط پر منظور کر لیا کہ وہ جنگ آزادی میں کانگریس کے اصولوں کے مطابق شریک ہونے کا وعدہ کریں۔ چنانچہ یہ وعدہ کر لیا گیا، کیونکہ ہجرت کے روح فرسا خونیں مناظر نے پٹھانوں کو پہلے ہی انگریزوں کی ظالمانہ مکاریوں سے متنفر کر رکھا تھا اور وہ جنگِ آزادی میں شمولیت کے لئے قطعاً بے تاب تھے۔ زندانِ فرنگ سے رہا ہوتے ہی خان بابا جانے کانگریس کے لیڈروں سے بات چیت کی تو انہیں اصولوں کے لحاظ سے کوئی بھی رکاوٹ نظر نہ آئی۔ مہاتما جی نے ان سے عدم تشدد یعنی اہنسا کی بابت پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ عدم تشدد اسلام کے بہترین اصولوں میں سے ایک ہے جس پر رسول اکرم صلعم اپنی مکی زندگی میں برسوں عمل پیرا رہے۔ اسلام امن و سلامتی کا دین ہے اور لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ کا پیام دیتا ہے۔ یہ مذہب قول و فعل سے کسی کی دل آزاری کی اجازت نہیں دیتا اور پھر ہمارے صوبے میں تو عدم تشدد اس لئے بھی ضروری ہے کہ پچھلی کچھ صدیوں میں پٹھان قوم تشدد کی پجاری بن چکی ہے۔ اگر یہ قوم بہت جلد عدم تشدد کو نہ اپنا سکی تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ میرے لئے تو اہنسا کی اہمیت اس لئے بھی کم نہیں ہو سکتی کہ اس وقت میری قوم کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے۔ (دیباچہ "دو خدائی خدمتگار" مصنفہ سورگیہ مہادیو ڈیسائی) چنانچہ مئی اور اکتوبر ۱۹۳۸ء میں مہاتما جی کے دوروں کا مقصد یہ تھا کہ وہ باچا خان کی موجودگی میں پٹھانوں کی تنظیم کا مشاہدہ کر کے تجزیہ کر سکیں کہ پٹھانوں نے عدم تشدد کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں کہاں تک گاندھی جی اور کانگریس کے ساتھ کئے گئے وعدوں کو پورا کیا ہے؛ تاکہ مستقبل میں آزادی کی ہندوستان گیر جدوجہد میں پٹھانوں کے کردار پر بھروسہ کیا جا سکے۔ چنانچہ ان دوروں کے بعد ہر دو گاندھیوں کے اشتراکِ عمل سے کانگریس اور خدائی خدمتگار تنظیموں کے لئے سیاسی و اخلاقی تگ و دو کی حدود متعین کی گئیں اور دونوں جماعتوں کے لئے واردھا کو واحد مرکز قرار دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری ہندوستانی قوم بے باک اور نڈر ہو کر مستقل مزاجی کے ساتھ عدم تشدد کے اصولوں کے مطابق برطانوی ڈپلومیسی سے ٹکرا گئی۔ میں یہاں ہندوستان کی تواریخِ آزادی پر تبصرہ کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتا۔ مجھے تو صرف "دو گاندھیوں" کے ضمن میں کچھ باتوں کا اظہار کرنا ہے جنہوں نے حق و صداقت کی تبلیغ کے لئے بیش بہا قربانیاں دے کر زندگی اور انسان کی حقیقی عظمتوں کو دنیا بھر کی باطل نواز حکومتوں پر واضح کر دیا کہ انسانیت فاتح قوت ہے جسے سازشوں، جعلسازیوں اور تشدد سے شکست نہیں دی جا سکتی۔ سرحدی گاندھی کی بے مثال شخصیت پر سورگیہ مہادیو ڈیسائی نے اپنی تصنیف "دو خدائی خدمتگار" میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "باچا خان سیاسی آدمی نہیں۔ وہ ہر روز باقاعدہ نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں اور سچے مذہب پسند مسلمان واقع ہوئے ہیں لیکن اُن کا اسلام دوسرے دھرموں سے نفرت نہیں سکھاتا، یہی اُن کی عظمت کی واحد علامت ہے کہ وہ گفتار و کردار کی صداقت کے ساتھ ساتھ پُرخلوص مجاہد اور انتھک خدائی خدمتگار بھی ہیں، انہوں نے قلیل مدت میں پٹھانوں جیسی قوم کو عدم تشدد کے دائرۂ اثر میں لانے کی حیرت انگیز کامیابی حاصل کر لی ہے۔ پٹھان بحیثیتِ قوم اُن سے بہت پیار اور محبت کرتے ہیں۔" آنجہانی مہادیو ڈیسائی نے اپنی مختصر سی کتاب میں یہ بھی کہا ہے کہ سرحدی گاندھی نے گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلنا اس لئے پسند نہیں کیا کہ وقت و حالات کی مصلحتیں انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ ان اصولوں کو سیرتِ نبی صلعم کے عین مطابق سمجھتے ہیں اور اُن کا عقیدہ ہے کہ ہر مسلمان کے لئے ان اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ (دو خدائی خدمت گار)۔ یہی وجہ تھی کہ دیش پتا گاندھی نے فرمایا کہ "اگر کبھی ہندوستان میں ستیہ و اہنسا کے اصول ناکامیاب ہوئے تو میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھوں گا۔ لیکن مجھے پورا وشواس ہے کہ پٹھانوں میں ان اصولوں کو ضرور کامیابی ملے گی۔" (دو خدائی خدمتگار)

(باقی صفحہ ۱۲۴ پر دیکھئے)

محمد ایوب واقف



# گاندھی جی، اسلامیات کی روشنی میں

گاندھی جی نے اپنی وفات سے چند روز قبل کہا تھا کہ "اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اُسے یاد کریں تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھے کام کرے"۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ گاندھی جی نے کوئی نئی بات نہیں بتائی، یہ تو ہر وہ شخص کہہ سکتا ہے جسے تھوڑی بہت بھی سوجھ بوجھ حاصل ہے۔ بالکل دُرست! لیکن آپ ذرا غور تو کیجئے کہ گاندھی جی نے کتنے سلیقے سے اپنی وفات کے بعد اپنی دائمی شہرت و مقبولیت کی مثال آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ گاندھی جی کی زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے اور ان کی کارگذاریوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات کھُل کر سامنے آجائے گی کہ زندگی نام ہے ایک مسلسل جہد کا۔ اگر اس جہد کو انسان نے برابر جاری رکھا تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ نہ رہے۔ اور گاندھی جی کی تمام تر کوششوں کا ماحصل بھی یہی ہے۔ لیکن گاندھی جی کے نزدیک ہر جہد کا نام زندگی نہیں ہو سکتا۔ ایسی جہد جو حق و صداقت پر مبنی ہو، اسی کا نام انہوں نے زندگی رکھا اور اسلام کا بھی یہی درس ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ گاندھیزم اور اسلامزم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہاں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ کیا گاندھی جی نے واقعتاً اسلامیات کو اپنے خیالات و افکار کا مرکز بنایا یا غیر شعوری طور پر اسلامی اصولوں سے وہ قریب ہوئے۔ قیاس کہتا ہے کہ گاندھی جی نے بذاتِ خود اسلامیات سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔ چونکہ گاندھی جی نے اپنے فکر کا جو شاندار محل تیار کیا، اُس کی بنیاد اُنہوں نے حق و صداقت اور بھائی چارگی پر رکھی اس لئے غیر شعوری طور پر وہ اسلام سے خود کو جُدا نہ رکھ سکے اور یوں بھی دیکھا جائے تو اسلام مذہبی، تمدّنی، ملکی، سیاسی، تجارتی، قومی، دیوانی اور فوجداری کا ضابطہ ہے۔ کارزارِ حیات کے کسی بھی شعبے میں آپ دیکھیں آپ کو اسلام کے آدرش ملیں گے۔ اس لئے کہ اسلام انسان کے دنیوی اور اخروی فوائد کے ساتھ ساتھ مادی فوائد کی سبیل بھی تلاش کرتا ہے اور ایک انسان تعصّب اور تنگ نظری کو بالائے طاق رکھ کر زندگی گذارنا چاہے تو اسلام بہر صورت اس کی رہبری کرتا ہے۔ یہی صورت گاندھی جی کے خیالات اور افکار کی بھی ہے۔ ان کا دستور العمل قرآن اور اور اسلام کا دستور العمل ہے۔

گاندھی جی کی پوری زندگی قوم و انسانیت کا علَم بلند کرنے میں گذری۔ اُن کی تعلیمات پاکیزہ اور اخلاق و رُوحانیت سے معمور ہوتی تھیں۔ اُن کے خیالات میں بڑی وسعت، نرمی اور ہمدردی ہوتی تھی۔ وہ ایسے انسان تھے جو ظاہر پرستی اور تشدّد کا سر ہمیشہ کچلتے رہے اور اخلاق و روحانیت کا گرگمان کرتے رہے۔ اِس مختصر سے مضمون میں ہم گاندھی جی

کے تمام تر خیالات وافکار کا موازنہ اسلامی اصولوں سے تو نہیں کر سکتے۔ چند بنیادی باتیں جن کی اسلام کے نزدیک بڑی اہمیت ہے اُن کے ذکر تک اِس مضمون کو محدود کریں گے اور ان باتوں کی روشنی میں گاندھی جی اور ان کے خیالات کو دیکھیں گے۔

اسلام کی سب سے بنیادی چیز توحید ہے جس کے بغیر اسلام نامکمل رہتا ہے۔ توحید کا مطلب ایک خدا کی پرستش یعنی خدا ایک ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کو حاجت روا نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لئے قرآن میں کہا گیا ہے: وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ (تمہارا معبود تو وہی خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے) گاندھی جی نے کہا تھا "ایک ایشور میں سمپورن شکتی ہے اس لئے ایک ہی ایشور میں ہمیشہ یقین رکھا جائے۔ اس کے لئے کسی اور طاقت کے سامنے سر جھکایا گیا تو اس ایک مہان شکتی کا اَنادر اور اپمان ہوگا" گاندھی جی کے اس قول کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا ماحصل یہ نکلے گا کہ عبادت و استقامت کا مرکز صرف ایک ہی ذات ہو جو ہمہ داں و ہمہ بیں و ہمہ توانا ہو۔ جس کی طاقت میں ساری کائنات کی طاقت گم ہے جو جملہ صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے اور تمام تر عیوب سے مبرا۔ یہ طاقت ہماری خالق ہے اور ہم اس کی مخلوق اور سرلوب۔ گاندھی جی نے ایک ایشور کا جو نظریہ ہمارے سامنے پیش کیا، اس سے ان کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور نہ رہا تھا کہ انسان کو تمام دنیاوی خوف و ہراس سے نجات مل جائے۔ انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات ملے۔ ایسا اس لئے کہ اس سے انسان کے اندر انسانی شرف و عظمت پیدا ہوتی ہے اور جب ایک ایشور یا ایک خدا میں یقین نہ کرکے بیک وقت کئی طاقتوں سے انسان مرعوب ہوگا، اُن کے سامنے سر جھکائے گا تو انسان کے دل میں خوف و حزن پیدا ہوگا۔ زندگی کی ڈگر پر انسان کے قدم بیباک انداز میں ہرگز نہ اٹھ سکیں گے۔ اس لئے کہ انسان بیک وقت کئی طاقتوں کے سامنے سر جھکائے گا۔ اس کا بُرا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کے دل میں ہر وقت یہ وہم رہے گا کہ اس نے تمام قوتوں کے ساتھ یکساں کردار نہیں پیش کیا ہے۔

اسلام کی دوسری سب سے نمایاں خوبی جو ہے وہ یہ کہ یہ تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر حسنِ عمل، اخلاق اور ہمت کا عظمت و حشمت کا معیار قرار دیتا ہے۔ قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (بے شک تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاکباز ہے) پاکباز سے مُراد یہاں اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہ انسان اپنے اندرون کو تمام تر کدورتوں سے صاف کرے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ایک انسان سماج کے دوسرے انسانوں کو اُسی عزت کا حق دار قرار دے جس کی مانگ وہ اپنے لئے کرتا ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو انسان بہت سارے عیوب سے نجات پا سکتا ہے، اس لئے کہ جہاں انسان کو انسان سے نفرت و عداوت ہوگی، وہاں بہت ساری بُرائیاں پیدا ہوں گی۔ چنانچہ انصاف اور خلوص بہت ضروری ہے۔ گاندھی جی نے اس بات پر ہمیشہ زور دیا اور سماج کے نچلے طبقے سے ہمیشہ انہوں نے انصاف اور حمیت جتائی۔ ان معاملات میں وہ ہندو مذہب کے سخت مخالف تھے اس لئے کہ ہندو مذہب انسان کی طبقاتی تقسیم میں یقین رکھتا ہے۔ یہ مذہب انسان کی اچھائی و بُرائی اور اس کے اعلیٰ کردار کو معیار نہیں بناتا بلکہ انسان کی عظمت کا معیار وہ انسان کے نسلی امتیاز سے کرتا ہے۔ ان معنوں میں ہندو مذہب سے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے اور جو مذہب انصاف پسند نہیں، وہ مذہب ہی کہاں۔ اس کے برعکس اسلام انسانوں کو خانوں میں منقسم نہیں کرتا۔ وہ تمام انسانوں کو چاہے وہ کسی فرقے کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں ایک ہی آدم کی اولاد سمجھتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو اس کی تلقین بھی کرتا ہے قرآن کریم میں اللہ نے خود کہہ دیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (بے شک اللہ نیکی اور انصاف کا

حکم دیتا ہے) آپ اسلام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے، آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے اپنی چودہ سو سالہ زندگی میں اس اصول پر کس پابندی سے عمل کیا ہے۔

گاندھی جی اس مذہب کو تمام مذاہب پر فوقیت دیتے تھے جو انسان کو ترکِ دنیا کا نہیں بلکہ دنیاوی ذمہ داریوں کو نبھانے کا درس دیتا ہے۔ اس لئے کہ انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ ہمہ وقت خدا کی یاد میں مصروف رہے بلکہ اس کے اوپر اور بھی بہت ساری ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک انسان کو سماج کے دوسرے انسانوں کے ساتھ کیا کرنا ہے، ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا ہے، اس کو سمجھنا اور اس کو عملاً برتنا بھی عبادت میں شامل ہے اور جب تک اس نوع کی عبادت نہیں کی جاتی، انسان کو دائمی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ آپ اسلام کے اندر یہ خوبی بھی پائیں گے۔ اسلام روحانیت کے ساتھ ساتھ مادیت کو بھی آگے بڑھاتا ہے۔ مادی فوائد کے لئے انسانی کوششوں کو کسی طرح مذہب کے خلاف نہیں سمجھتا، بلکہ اُسے مذہب کا ایک جزو سمجھتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طریقے سے کیا جائے یعنی ایک انسان اگر دولت حاصل کرتا ہے تو یہ کوئی عیب نہیں لیکن اس دولت کو جوڑ جوڑ کر بند رکھنے کی اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اس کا استعمال ہونا چاہیئے یعنی سماج میں جو لوگ مفلوک الحال ہیں، جن کی زندگی کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے، ان کے مصرف میں اس دولت کو لانا چاہیئے اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو اسلام کے نزدیک کسی طرح درست نہ ہوگا۔ مہاتما گاندھی جی نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ چوری کا مطلب صرف یہ ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی دوسرے کی چیز کو غیر مہذبانہ ڈھنگ سے ہڑپ کر جائیں، بلکہ ضرورت سے زیادہ کوئی بھی چیز رکھنا چاہے وہ اپنی ہی گاڑھی کمائی کیوں نہ ہو، صاف و صریح چوری ہے اور ایسا کرنے والا انسان سماج اور مذہب دونوں کی نظروں میں مجرم ہے اور اس کی خطاؤں کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات آج سے بہت پہلے ہمارے خلفاء، انبیاء اور خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہہ دی تھی کہ جس دولت مند سے غریبوں کا بھلا نہیں ہوتا، وہ دولت مند خدا کے نزدیک بخشش کا خواہش مند نہیں ہو سکتا۔ خدا اپنے اُنہیں بندوں سے خوش ہوتا ہے جو اپنے دوسرے بھائیوں کی دامے، درمے، قدمے، سخنے مدد کرتے ہیں۔ اس طرح ہم نے یہاں بھی دیکھا کہ گاندھی جی کے فکر اور اسلامی فکر میں کتنا قریبی تعلق ہے۔

آخر میں گاندھی جی کے ایک اور نظریے پر روشنی ڈال کر میں اپنی بات کو ختم کروں گا۔ گاندھی جی کا نظریۂ تعلیم بھی ہمارے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کہ گاندھی جی کے نظریۂ تعلیم سے متعلق کچھ کہوں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند دوسرے مفکرین کے خیالات کو دیکھا جائے۔ مشہور شاعر میر علی جزیاخان نے علم کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

علمے کہ دراو عمل نباشد عار است — ہر سجدہ کہ بے فکر بود زنار است
ہر کس کہ بہ علم بے عمل می نازد — عالم نبود اہلِ مشغل دار است

اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ علم بہت بڑی دولت ہے، لیکن اگر اس کا عمل سے کوئی تعلق نہیں تو یہ علم انسان کے لئے علم نہیں رہ جاتا بلکہ بہت بڑی جہالت بن جاتا ہے۔ چنانچہ علم چاہے کسی نوعیت کا ہو، عمل اس کے لئے پہلی شرط ہے یعنی اگر ہم نے کتب بینی کے ذریعے یا اپنے بزرگوں کی صحبتوں کے ذریعے یہ معلوم کیا کہ سچائی دنیا میں بہت بڑی چیز ہے تو اس کو عمل میں لانا لازمی ہے اور اگر ہم نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تو یہ بیکار محض چیز ہوگی۔ علم کے متعلق سقراط کا نظریہ یہ ہے کہ نیکی کرو کہ نیکی ہی علم ہے اور بدی سے بچو کہ بدی جہل ہے۔ سقراط کی

یہ بات بڑی حد تک دُرست ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اِس نظریے کی سخت مخالفت کی ہے مثلاً ارسطو نے سقراط کے نظریۂ علم کی تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ صرف نیکی ہی علم نہیں اور ہر نیک آدمی مردِ صالح نہیں ہوا کرتا۔ یہ بات بھی حقیقت سے کسی طرح عاری نہیں لیکن سقراط کے قول کو بھی غلط قرار نہیں دیا جا سکتا، اِس لئے کہ نیکی ہی نجات کی راہ ہے اور جو چیز انسان کو نجات کے راستے پر لے جائے، وہ ہی حقیقی معنوں میں علم ہے اور اسی نوع کا علم انسان کے اندر عملِ صالح پیدا کرتا ہے۔ انسان شر سے بچتا ہے اور خیر کی طرف راغب ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، انسان خیر کی طرف راغب کیوں ہوتا ہے اور شر سے بچنے کی کوشش کیوں کرتا ہے؟ اس کی اصل وجہ خشیۃ اللہ (یعنی خوفِ خدا) ہے۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ (خدا سے اُس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں) یہاں جس علم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو اچھائی و بُرائی کی تمیز کرائے، اِس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ باطن کی پاکیزگی یعنی نیکی ہی اصل علم ہے۔ اِس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ علم کے منافی۔ ایک بات کو واضح کرتا چلوں کہ علم کی تعریف یہاں عام نقطۂ نظر سے ہٹ کر دیکھنا ہوگی ورنہ بہت ممکن ہے کہ عام سطح پر آ کر اسے ایک لغو بات سمجھ لی جائے اور ایسا سمجھنا کسی طرح غلط بھی نہ ہوگا کیونکہ علم سے مُراد آج کل بیشتر لوگ جو کچھ لیتے ہیں وہ اس نظریے سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔ گاندھی جی کا نظریۂ تعلیم اس سے مختلف تھا۔ اُن کے نزدیک ایک انسان اگر دنیا کی ساری ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ خواہش رکھتا ہے کہ کامیابی و کامرانی اُس کے قدم چُومے تو اُس کے لئے سچے علم کی ضرورت پڑے گی۔ یہاں اس نقطے کو بھی سمجھ لیجئے کہ گاندھی جی کے نزدیک سچا علم کیا تھا۔ دراصل گاندھی جی کے نزدیک علم نام ہے اُن تمام عمدہ باتوں کے جاننے اور سیکھنے کا جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہیں۔ اب یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی نظر میں عمدہ باتیں کیا تھیں؟ گاندھی جی کے اقوالِ زرّیں کا مطالعہ کرنے سے خاص کر اُن اقوال کا جو علم و عمل سے تعلق رکھتے ہیں، یہ پتہ چلتا ہے کہ معرفتِ الٰہی، سچائی و صداقت کو اپنی زندگی کا آلۂ کار بنانا ہی اُن کے خیال میں اچھی باتیں تھیں۔ اِس منزل پر آ کر گاندھی جی سقراط کے ہم خیال بن جاتے ہیں اور اسلام کے نظریۂ علم کے بھی وہ قائل نظر آتے ہیں۔ گاندھی جی کی تمام تر تگ و دو کا مقصد تھا سماج اور سماج کے انسان کی اصلاح۔ سماج کے انسان کی اصلاح وہ ان معنوں میں نہیں کرنا چاہتے تھے کہ موجودہ انسان سائنس اور ٹکنالوجی کے بل بوتے پر خود کو اپنی تقدیر کا معمار سمجھ لے اور یہ سمجھ لے کہ دنیا کی ساری طاقت اُسی کے ہاتھ میں ہے، ہرگز نہیں۔ گاندھی جی اِس طرزِ فکر کے مخالف تھے۔ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تحقیقات و تجربات سے نالاں بھی نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان اِس کائنات کی تمام تر اشیا کی حقیقت سے آشنا ہو اور حتی المقدور اُس سے استفادہ بھی کرے اس لئے کہ اس کائنات کی ہر چیز انسانی تصرّف کے لئے ہے لیکن اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اس کائنات کے معمار کی عظمت اور برتری کو پہلے تسلیم کرے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان صرف مادی ترقیوں ہی کو حاصل کر کے خود کو کامیاب نہ سمجھے بلکہ اپنے کو صحیح معنوں میں کامیاب اُس وقت سمجھے جب اُس کا ہر کام خوفِ خدا سے ہمکنار ہو اور جب انسان خدا کے خوف کے ساتھ کوئی کام کریگا تو وہاں ایمانداری، سچائی، خلوص اور یقین پیدا ہوگا۔ یہی گاندھی جی کا نصب العین تھا اور یہی اسلام کا بھی ضابطۂ حیات ہے۔

یوسف ناظم



(طنزیہ)

# ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!

"میں یہ جانتا ہوں کہ ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو اس بات کا سپنا دیکھتے ہیں کہ یہاں خالی اُردو یا خالی ہندی رہے گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ناپاک سپنا ہے اور ہمیشہ سپنا ہی رہے گا۔"

یہ بات آج سے ٹھیک ۳۱ سال پہلے ۲۹ راکتوبر ۳۸ء کو کہی گئی اور اس کے کہنے والے تھے مہاتما گاندھی۔ مہاتما گاندھی کی بہت سی باتیں ہم بخوبی بھول چکے ہیں اور اس کارنامے پر ہمیں کئی جگہ سے شاباشی مل چکی ہے۔ یہ بات بھی انہیں میں سے ہے۔ بھولنے اور سپنے دیکھنے کا اگر کوئی اولمپک مقابلہ ہو تو سارے گولڈ میڈل ہمیں ہی ملیں گے۔ چاندی بھی ہماری ہی ہوگی۔ سونے اور چاندی کے یہ تمغے ہی اصلی اور قانونی دولت ہوگی جو ہم درآمد کریں گے ورنہ اس وقت تو جو بھی سونا اور چاندی ہمارے ہاں ہے اسمگلنگ کے فن کی دین ہے۔

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ اُردو بھی عجیب و غریب زبان ہے۔ عجیب تو شاید یہ پہلے بھی تھی لیکن غریب تو یہ اب جا کر ہوئی ہے۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ اُردو نہ جاننے والے بھی اُردو لکھنا سیکھیں۔ اُردو لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ سیدھی طرف سے لکھنا پڑتی ہے اور دنیا میں سیدھا چلنا ہمیشہ مشکل کام رہا ہے۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ گاندھی جی ایک ہی جامے کے قائل تھے اور وہ تھا عملی جامہ۔ گاندھی جی نے اپنی اس بات کو بھی عملی جامہ پہنایا اور وہ اس طرح:

"اس لیے سیوا گرام ہی سے میں نے اُردو کی پرچار کا شبھ کام شروع کر دیا ہے اور مجھے اس کا بہت حوصلہ افزا اور جوشیلا جواب ملا ہے۔ پچھلے بدھ وار کو یعنی ۲۵ رفروری کے دن آشرم میں اُردو کی پڑھائی شروع ہوئی۔ چھوٹے بڑے عورت مرد قریب قریب سب ہی اُردو سیکھنے لگے ہیں۔ آدھ آدھ گھنٹے کی دو بیٹھکوں میں وہ اُردو کی شبد مالا سیکھ چکے ہیں۔ اس مضمون کے چھپنے تک وہ اُردو حروف اور ان کے لیے وغیرہ بھی جان چکے ہوں گے یعنی صرف تین گھنٹوں میں وہ لگ بھگ سارے حروف اور ملے ہوئے لفظ سیکھ چکے ہوں گے۔ ہاں آگے پڑھنے کا سوال ذرا ٹیڑھا ہے۔ لیکن محاورے سے یہ مشکل بھی حل ہو جائے گی۔ جہاں چاہ ہوتی ہے وہاں سب آسان معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا اپنے دیش سے پریم اتنا زبردست ہونا چاہیے کہ وہ ہم میں یہ چاہ پیدا کر سکے۔" (ہریجن سیوک - ۸ رمارچ ۴۲ء)

آج سے ۲۷ سال پہلے اُردو نہ جاننے والے اُردو لکھنا سیکھ رہے تھے۔ آج خود اُردو جاننے والوں نے اس بات

کی احتیاط کر رکھی ہے کہ ان کے گھر میں کسی طرف سے اُردو داخل نہ ہونے پائے۔ پہلے آشرم میں اُردو سکھائی جاتی تھی، اب یہ مدرسوں کے اطراف و اکناف میں بھی نہیں پائی جاتی۔ معلوم نہیں گاندھی جی نے کس چاہ کا ذکر کیا تھا۔ اس 'چاہ' کو بھی غالباً فارسی کا کوئی لفظ سمجھ کر 'کنویں' میں بدل دیا گیا اور اُردو زبان کو اس کے ہی بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کی طرح کنویں میں ڈھکیل دیا۔ اچھا ہوا کہ اس زمانے میں زیادہ لوگوں نے اُردو لکھنا نہیں سیکھا، ورنہ آج ان کی تعداد اُن لوگوں سے زیادہ ہی ہوتی جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ (یہ مادری زبان کا محاورہ بھی خوب ہے۔ باپ کی زبان شاید چلتی ہی نہیں ہے)

گاندھی جی اصل میں یہ چاہتے تھے کہ سنسکرت زدہ ہندی اور فارسی آلودہ اُردو کا ایسا مرکب تیار کریں جس میں فرش عام بول چال کے الفاظ ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ زبان ایسی ہو جو آسانی سے حلق کے نیچے اُتر سے۔ اس زبان کو وہ ہندوستانی کہتے تھے اور اس کی تعریف یوں کرتے تھے۔

"ہندوستانی کا مطلب اُردو نہیں بلکہ ہندی اُردو کی وہ خوبصورت ملاوٹ ہے جسے اُتری ہندوستان کے لوگ سمجھ سکیں اور جو ناگری یا اُردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔ یہ پوری راشٹر بھاشا ہے۔ باقی جو کچھ ہے ادھورا ہے۔"

لکھاوٹ کے بارے میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ لکھاوٹ تو وہی باقی رہ جائے گی جسے زیادہ سے زیادہ لوگ اپنائیں گے —— اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ گاندھی جی بہت دُور تک دیکھ سکتے تھے —— لکھاوٹ کے بارے میں، اس زمانے میں بڑے زوروں سے تجویزیں سوچی جاتی تھیں کہ کیوں نہ رومن لکھاوٹ اختیار کر لی جائے —— رومن لکھاوٹ کے بارے میں گاندھی جی ہاں کہہ دیتے تو پتہ نہیں آج ہندی کا حلیہ کیا ہوتا۔ ممکن ہے وہ اور زیادہ قابلِ قبول ہوتی، یا ممکن ہے اس پر 'بدیسی' ہونے کی چھاپ لگ جاتی اور اُسے چھٹی مل جاتی۔ ہندی والوں سے البتہ انہوں نے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ اُردو ادب کو ہندی میں زیادہ سے زیادہ چھاپیں —— خاندان کو وسیع کرنے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ خاندان کے باہر شادیاں کی جائیں۔

گاندھی جی بڑے بھاری نجومی تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں مانتا ہی نہیں کہ سارا ہندوستان راشٹر بھاشا سیکھے گا۔" (ہریجن سیوک، ۲۶ر اپریل ۱۹۴۲ء)

زبان کا مسئلہ ہوتا ہی بڑا مشکل ہے۔ فارسی جاننے والوں نے جب ترکی بولنے والیوں سے معاشقے کا ارادہ کیا تو انہیں بڑی مشکل پیش آئی اور انہوں نے یہ کہہ کر ہتھیار ڈال دیئے :

ع : زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

آدمی کو اس لئے صرف راشٹر بھاشا ہی کی نہیں، جگت بھاشا کی ضرورت ہے لیکن وہ کب وجود میں آئے گی ——؟ بین الاقوامی سطح پر عشق کرنا ایک غریب آدمی کے لئے کس قدر مشکل ہے۔ پولٹیکل اور کلچرل معاملات میں تو خیر مترجم چلتا ہے لیکن 'عشق' میں انٹرپریٹر کی کیا گنجائش ہے۔ یہ مُہم آدمی ہمیشہ تنہا ہی سر کرنا چاہتا ہے —— چاہے اس میں خود اس کا سر کیوں نہ قلم ہو جائے —— تجربہ بتاتا ہے کہ عشق کے معاملات میں صرف زبانی جمع خرچ کام نہیں دیتا۔ اس میں پوشیدہ خط و کتابت بھی کرنی پڑتی ہے۔ لکھنے پڑھنے کے ذکر کے ساتھ ہی 'رسم الخط' کا مرحلہ "معشوق" سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ اس لئے سچ پوچھا جائے تو سب سے اچھی زبان آنکھوں کی زبان ہے۔ اس کی کوئی لغت نہیں ہوتی۔ کوئی تلفظ نہیں ہوتا۔ اس کا املا بھی نہیں ہوتا۔ در پردہ چشمِ یار کا اشارہ ہوا اور آپ

نے جام چڑھا لیا ۔ پولی آنکھیں، سینہ، دل، کلیجے وغیرہ سب کے آر پار ہو جاتی ہیں۔

دُنبالہ سے سُرمہ کے دُھواں ہیں تری آنکھیں		کہہ بیٹھیں نہ کچھ سیفِ زباں ہیں تری آنکھیں

اب ایک لطیفہ سُن لیجئے۔ ایک غائب دماغ فلسفی صاحب کو اچانک ایک دن یہ خیال آیا کہ آج تو اُن کا عقد ہونے والا ہے۔ وہ فوراً پڑھنے کی میز سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عمدہ لباس زیب تن کیا۔ حسبِ مقدور بنے سنورے اور اپنی منگیتر کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر اُنہیں معلوم ہوا کہ اُن کی منگیتر تو شہر چھوڑ کر باہر جا چکی ہے اور اس بات کو ۲۰ سال ہو چکے ہیں۔

لیکن اُردو ابھی شہر چھوڑ کر نہیں گئی ہے اور اب بھی منتظر ہے کہ کوئی لوٹ کر آئے اور اُسے منا لے۔

"..... اس کے یہ معنی نہیں کہ اُردو اور ہندی ایک جداگانہ بولی کی حیثیت سے باقی نہ رہیں۔ ان دونوں کو باقی رہنا چاہیئے اور ترقی کرنی چاہیئے۔" (ہریجن، ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء) ▲

---

## بقیہ "گاندھی جی کے عمرانی نظریات" صفحہ ۴۷


(۴) گاندھی اور نہرو کی راہ : ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۔

(5) Bandyopadhyaya, J. : Social and Political thought of Gandhi.

(6) Audholia and Tripathi (ed.) : Gleanings From Gandhian Thought.

(7) Diwakar, R.R. :

Gandhiji's Basic Ideas and Some Modern Problem.

(8) George Woodcock : Anarchism.


---

## بقیہ "گاندھی جی کا تصورِ حیات"

ہو گئی ہے۔ اپنے پیش کردہ تصورِ حیات پر گاندھی جی نے سختی سے عمل کیا اور ہمیں بتایا کہ غلامی سے چھٹکارا پانے اور زندگی کو شادماں بنانے کا سب سے آسان راستہ کون سا ہے۔

آج گاندھی جی ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن اُن کا پیغام، اُن کا تصورِ حیات اور اُن کی تعلیمات ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جب تک گاندھی جی زندہ تھے، ہم اُنہیں یقین دلاتے تھے کہ ہم ہمیشہ اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے۔ لیکن آج ہماری زبانوں پر گاندھی جی کا نام تو ہے لیکن عملی طور پر ہم اُن کی تعلیمات سے بے توجہی برت رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آزادی کے ۲۲ برس بعد بھی ہم نے ترقی و فلاح کی اُن وسعتوں کو نہیں چھوا ہے، جس کی طرف گاندھی جی نے اشارا کیا تھا۔ ▲

نُور پرکاش



# آتما سے پرماتما تک ...![۱]

مہاتما گاندھی نے اپنے پیچھے کوئی سیاسی تحریک چھوڑی یا نہیں چھوڑی اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ البتہ اتنا سچ ہے کہ فورٹ کے علاقے میں جب لال جھنڈیاں لہرانے لگتی ہیں اور لوگ موسلادھار بارش یا چلچلاتی دھوپ کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنے اپنے کندھوں پر اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے "ہم سے جو ٹکرائے گا مٹی میں مل جائے گا" کے نعرے بلند کرتے ہیں تو باپو کی یاد آجاتی ہے اور اس وقت بھی باپو بہت یاد آتے ہیں جب کوئی سیاسی رہنما کسی پیچھے پر بیٹھ کر بھوک ہڑتال کا اعلان کرتا ہے اور اُس وقت بھی جب کوئی مزدور اپنے سیٹھ کو کام پر نہ آنے کی دھمکی دیتا ہے اور اُس وقت بھی جب کوئی رات کی بے پناہ تاریکی اور سنّاٹے کو دُور کرنے کے لئے اپنے مضبوط بھدّے اور کھردرے ہاتھوں سے گھن... گھن کی آواز کو جنم دیتے ہوئے ریل کی پٹڑی پر ضربیں لگاتا ہے اور اُس وقت بھی جب ہیروشیما پر بم گرائے جاتے ہیں اور اُس وقت بھی جب انسان دوست سینے کو گولی سے چھلنی کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کے اکثر شرفار اور سیاسی تحریکوں کے علمبردار کسی نہ کسی ازم کے قائل ضرور رہے ہیں، لیکن گاندھی جی کی آتما کو مہاتما بننے تک جتنی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں شاید ہی کسی اور کے حصّے میں آئی ہوں گی۔ اِسی لئے باپوجی جب زندہ تھے تو وہ واقعی زندوں میں شمار کئے جاتے تھے اور مرنے کے بعد امر ہو گئے۔ باپوجی کے نام پر موہن داس کرم چند گاندھی کا جسم یاد آتا ہے جس کو نتھورام گوڈسے نے اپنی گولی کا نشانہ بنایا تھا اور اِسی کے ساتھ ساتھ تیس جنوری ۱۹۴۸ء کی وہ شام یاد آجاتی ہے جب باپو کا جسم مر گیا تھا، لیکن وہ اپنے پیچھے بطورِ ورثہ اپنی رُوح چھوڑ گیا، جسے آج تک کوئی قتل نہیں کر سکا۔ یہ صحیح وسالم ہندوستانی رُوح تھی جو آج بھی ہمارے دلوں میں محفوظ ہے !!!۔

باپو کا لاغر جسم دیہاتی نہیں لگتا۔ دیہاتی ہٹے کٹے اور چھیل چھبیلے ہوتے ہیں۔ جتنا کھاتے ہیں اُتنا اپنے جسم پر جما لیتے ہیں اور پھر بیلوں سے کشتی لڑنے میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ کاٹھیاواڑ

---

[۱] میں یہ مضمون لکھ ہی رہا تھا کہ احمد آباد میں جو کہ باپو کی جنم بھومی کہلانے کا دعویدار ہے، فساد کی خبر ملی۔ انسان کی آتما مجروح ہو رہی ہے، مجروح کی جا رہی ہے اور اوپر بیٹھا پرماتما سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ہمارے لئے درد کی راتیں اٹل ہیں۔
(نور پرکاش)

کے ایک چھوٹے سے دیہات پوربندر میں ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً اس لئے کہ وہ اپنے ساتھ جسم نہیں صرف رُوح لائے تھے۔ رُوحوں کا جنم کہیں بھی ہو سکتا ہے پر اُن کی موت کہیں نہیں ہو سکتی۔ امن کا یہ پیغامبر جس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی اور بدن پر ایک دھوتی ہوتی تھی، اپنے پیچھے گنگا جمنی تہذیب کا اثر چھوڑ گیا ہے۔ آتما کو آتما سے ملانے کا اور آتما سے پرماتما سے ملانے کا صحیح راستہ باپو ہی نے بتایا۔ جس کی زندہ مثال ان کا افریقہ کا سفر اور کالے لوگوں کی یکجہتی ہے۔ جہاں کہیں بھی انسان اور انسانیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی، انہوں نے اپنا سر اُٹھایا اور علم بغاوت بلند کیا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ بیرسٹری کے بہترین پیشے کو خیرباد کہہ کر ۱۹۱۵ء میں اپنے دلیش واسیوں کے لیئے اپنے دلیش واپس چلے آئے۔ اپنے ملک والوں کے لئے حقیقی قربانیاں باپو نے دی ہیں اُس کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔

گاندھی جی نے اپنا سفر جاری رکھا۔ اُن کی اِس یاترا کے دوران اُنہیں جیل کی یاترا بھی کرنی پڑی۔ نمک اندولن جو ڈانڈی یاترا کے نام سے مشہور ہے انہیں جیل خانے تک لے گئی۔ ۱۹۳۰ء میں اسی اندولن کے تحت وہ کراچی میں گرفتار کر لئے گئے اور ایروڈا جیل میں قید رکھے گئے۔ اِسی نازک عرصے میں یعنی ۱۹۴۴ء میں اُنکی دھرم پتنی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن یہ اُن کی لگن اور طرح داری تھی کہ وہ اپنے کاموں میں معروف رہے۔ کھرے اور سچے جن سیوک کا سہرا گاندھی جی ہی کے سر ہے۔ اُنہوں نے دلیش کے لئے اپنا سبھی کچھ تیاگ دیا۔ سبھی کچھ قربان کر دیا۔ نہ اپنی ذاتی ترقی کا خیال کیا اور نہ ہی اپنے کُنبے سے لگے رہے۔ گاندھی جی صحیح انسانی خادم تھے۔ انسانیت کے پرستار تھے۔ ایسی تھے لقیب تھے پیغامبر تھے!۔

'ہندوستان چھوڑ دو' کا نعرہ جب بلند ہوا تو باپو جی نے کئی چیزیں چھوڑنے کا عَلم لہرایا۔ اُن کے جسم پر کی دھوتی اِسی تحریک کی دین ہے۔ بدیسی مال کا بائیکاٹ کیا۔ انگریزوں کی تجارت پر ضربیں لگائیں۔ چرخے کو اپنایا اور سُوت کات کات کر کھدر پہننے کی صلاح دی۔ باہر کی ساری چیزوں کو ترک کر دینے کا اعلان کر دیا۔ حریفوں کے سارے وار سہے اور پہلو بدل بدل کر مقابلہ کیا۔ بھوک ہڑتال کی۔ جھنڈیاں لہرائیں۔ نعرے بلند کئے۔ یہ پریم پجاری بھجن گاتا رہا اور آتما کو پگھل پگھل کر پرماتما کی کھوج میں لگا رہا۔ نہ دین چھوڑا اور نہ ہی دُنیا کو ترک کیا۔ نہ صرف اس نے دھرتی کو اپنایا بلکہ آسمان کے مُنہ پر تھوکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اُس کا قلب وسیع تھا۔ اس کی روح کی اڑان اُونچی تھی۔ جہاں وہ حریفوں پر وار کرتا، وہیں بھائی کو بھائی سے ملانے میں کوشاں رہتا۔ آدی واسیوں کو اپنایا۔ ہریجنوں کو سینے سے لگایا۔ کالے اور گورے کے امتیاز کو ختم کیا۔ چھوت کو اچھوت سے ملا دیا۔ براہمنوں کے کنوؤں پر ہریجنوں نے پانی بھرا اور شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ گاندھی جی ہندو نہیں تھے، مسلمان بھی نہیں تھے۔ انہیں مدراسی ہونے کا خبط بھی نہیں تھا۔ وہ جتنے کانگریسی تھے اُتنے ہی کمیونسٹ بھی تھے۔ جب جب اُنہوں نے بھجن گائے، قرآن کو بھی یاد کیا —— آشرم بھی بنائے! نہ ہی انہوں نے اپنی سرزمین کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور نہ ہی اس قسم کی کوئی صلاح ہی دی تھی۔ نہ ہی بنگال کو دو حصّوں میں بانٹنے کا خواب دیکھا تھا اور پنجاب تو اُن کے یہاں ایک ہی تھا۔ بس سبھی انسان اور یہی اٹوٹ انسانی رشتہ ان کا اُصول تھا، ان کا سدّھانت تھا۔ انسانی برادری کا یہ پیغامبر ورثے میں بھائی چارگی، محبّت، خلوص، سچّائی، ایمانداری اور 'اہنسا' کا پیغام چھوڑ گیا ہے۔ ہم اُن کی رُوح کے



(باقی [illegible] ۱۱۰ پہ دیکھئے)

آغا رشید مرزا



# کیا کھویا اور کیا پایا؟

سیاسی لحاظ سے گاندھی جی کی عظمت مُسلّمہ ہے۔ لیکن اُن کا مرتبہ انسانی حیثیت سے اور بھی زیادہ بلند ہے اور وہ ساری دنیا میں اسی عظمت اور بلندی کی وجہ سے یاد کئے جاتے ہیں۔ وہ انسانیت اور امن کے علمبردار تھے۔ آزادی کی جنگ میں بھی وہ ان ہی اُصولوں پر کاربند رہے اور یہ دنیا کی سب سے پہلی جنگ تھی جو بغیر ہتھیاروں کے عدم تشدّد، امن، ایثار اور قُربانی کے بل پر لڑی گئی۔ اس نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور "اہنسا" کا فلسفہ جو محبّت سے نفرت پر فتح حاصل کرنے کا بنیادی خیال پیش کرتا ہے۔ عالمی توجہ کا مرکز بن گیا۔

گاندھی جی کے دل میں قومی جذبے سے پہلے ہی عالمی اُخوت، انسانی ہمدردی اور مساوات کا جذبہ بیدار تھا۔ چنانچہ، اُنہوں نے سب سے پہلے اپنے وطن سے دُور جنوبی افریقہ میں رنگ و نسل کے امتیاز کے خلاف آواز بلند کی۔ وطن میں بھی اُن کا یہ جذبہ سیاسی جذبے پر غالب رہا۔ وہ سیاسی مصروفیات کے باوجود سماجی، معاشرتی اور انسانی فلاح و بہبود کے کاموں کو اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی سچّائی کے اصولوں کو سیاسی مصلحتوں پر قربان نہیں ہونے دیا۔ خواہ اس کے لئے انہیں کیسی ہی قُربانی دینی پڑی یا نقصان اٹھانا پڑا۔ آزادی کی جنگ کے ساتھ ساتھ وہ ایک سماجی انقلاب کے لئے بھی کوشاں تھے، کیونکہ آزادی کی مہم سر کرنے کے لئے وہ اِس انقلاب کو ضروری سمجھتے تھے۔

ہریجن اور اچھوت طبقے کو اوپر اٹھانے کے لئے انہوں نے کارہائے نمایاں کئے۔ وہ خود ہریجن کالونی میں جاتے، اُن سے ملتے، بات چیت کرتے۔ یہاں تک کہ اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے ایک مرتبہ ان کے ساتھ کھانا بھی کھایا۔ مندروں کے دروازے جو سدا اُن پر بند رہے، ہمیشہ کے لئے ان کے واسطے کھلوا دیئے۔ سب سے پہلے جب برلا مندر کے دروازے اُن کے لئے کھولے گئے تو ہزاروں کی تعداد میں اچھوت اور ہریجنوں کا ایک میلہ سا دنوں تک لگا رہا۔

ہندوستان میں ایرین نسل کے عہد سے پڑے ہوئے صدیوں پُرانے اس رواج کو جو برنوں کی چار تقسیم کی صورت میں ہندو سماج اور عام سوسائٹی میں ایک سخت قانون کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس طرح جڑ سے اُکھاڑ پھینک دینے کا عزم اُس قدامت پسند دور میں کوئی معمولی کام نہ تھا اور یہ کام اُن کے نزدیک بہت اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ملک کے تعمیری پروگرام میں جو انہوں نے قوم کے سامنے رکھا۔ اِس بات کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لیک

مرتبہ کہا:

"... یقیناً اس کا مقصد سیاسی اور سماجی اور اقتصادی آزادی ہے اور یہ ایک بڑی قوم کی زندگی کے ہر شعبے میں پُرامن تمدنی انقلاب ہے۔ اِس کے بعد کاسٹ سسٹم اور اس قسم کی دوسری توہم پرستیاں ختم ہو جانی چاہئیں۔ ہندو مسلمانوں کے اختلافات ماضی کی داستاں بن جانے چاہئیں اور انگریز دشمنی بھی ختم ہو جانی چاہیئے ..."

ایک اور جگہ پھر کہا:

"... کاسٹ سسٹم جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں، وقت کے تقاضے کے خلاف ہے۔ اگر ہندوازم اور ہندوستان کو زندہ رہنا ہے اور دن بدن ترقی کرنا ہے تو اسے ختم ہو جانا ہی چاہیئے ..."

اُن کے دل میں انسانی مساوات اور فلاح وبہبود کا یہ جذبہ صرف کسی ایک مذہب اور سماج کی حد تک ہی محدود نہ تھا۔ اُن کی رواداری اور اُن کا خلوص تمام مذاہب، ساری قوموں اور پوری انسانیت کے لئے یکساں تھا۔ اُن کی دعاؤں کے معمول میں جہاں گیتا کا پاٹ اور بھجن ہوتا تھا۔ وہاں انجیل اور قرآن شریف کا ذکر بھی آخر دم تک ہزار مخالفتوں کے باوجود ہوتا رہا۔

تقسیم کے بعد دونوں طرف ملکوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی اور اِن شعلوں نے بڑی تیزی کے ساتھ دلّی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ دلّی جو آزادی کی جنگ میں ایک مشترکہ محاذ بنی ہوئی تھی۔ وہ دلّی جہاں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب نے مل کر ایک ساتھ آزادی کے لئے نعرے بلند کئے تھے اور قربانیاں دی تھیں۔ وہ دلّی جہاں مسلمانوں نے دسہرے کے موقع پر اور ہندوؤں نے محرم کے دنوں میں ایک دوسرے کو پانی اور شربت پلایا تھا، اُسی دلّی میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، ایک دوسرے کا خون پینے لگے اور ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیلنے لگے۔

مجھے یہاں فسادات کی داستان کا اعادہ مقصود نہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ ایسے حالات میں جب کہ قانون، پولیس اور فوج بے اثر نظر آتے تھے اور جواہر لال جیسے قوم پرست لیڈر بھی بے بس، مجبور اور مایوس دکھائی دیتے تھے۔ اُس وقت گاندھی جی کے عزم، اُن کی ہمت، سچائی اور بہادری کے اصولوں ہی نے ایک چٹان کی طرح اُس طوفان کا مقابلہ کیا۔

وہ خود فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرتے اور روزانہ شام کو دہلی ریڈیو سے امن اور محبت کا پیغام عوام تک پہنچاتے۔ اُن کے پیغامات میں اُن کے جذبات و احساسات، اُن کی بے چینی اور اُن کا خلوص نمایاں ہوتا۔ اُن کے اکثر الفاظ اور فقرے اب بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔

"میں تو چاہتا ہوں کہ تم خود ہی جاؤ اور اپنے بھائیوں کو پُرانے قلعے سے اور جہاں جہاں بھی وہ ڈر سے چلے گئے ہیں، جا کر واپس لے آؤ۔ انہیں اپنے گھروں میں تم خود ہی بساؤ۔ میں کہتا ہوں وہ تم سے رُوٹھ گئے ہیں۔ تم نے ان سے جھگڑا کیا ہے۔ تم ہی انہیں منا کر لے آؤ۔ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ تمہارے ہی کام آئیں گے۔"

اور ایک جگہ اقبال کے شعر کا بھی حوالہ دیا۔ اقبال کی تعریف کی اور کہا کہ وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ دیکھو کتنے اچھے اچھے شعر کہتے ہیں۔ پھر اُن کا یہ شعر پڑھا اور اس کا مقصد سمجھایا ؎

مذہب نہیں سکھاتا، آپس میں بیر رکھنا      ہندی ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کبھی گاندھی جی کے منہ سے نکلی ہوئی معمولی سی بات بھی سننے والوں کے لئے ایک فرض کی سی اہمیت رکھتی تھی اور اُسے پورا کرنا فخر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اُس وقت یہ حال تھا کہ ان کی انتھک کوششوں، اپیلوں اور التجاؤں کے باوجود کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اُن کی بے چینی اور ذہنی کرب کی شدّت اور بڑھ گئی۔ حالات اُن کی برداشت سے باہر ہو گئے اور وہ برت رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی رُوحانی اذیت اور احساس کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ سردار پٹیل سے کہے:

"۔۔۔ میں چین میں نہیں، دلّی میں ہوں۔ میری آنکھیں اور میرے کان ابھی سلامت ہیں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر اعتبار نہ کروں اور مجھ سے کہو کہ دلی کے مسلمانوں کو شکایت کی کوئی وجہ نہیں ہے تو نہ میں تمہیں قائل کر سکتا ہوں اور نہ تم مجھے۔ ہندو اور سکھ میرے بھائی ہیں۔ وہ میرے جسم کا حصّہ ہیں۔ اگر وہ اس وقت طیش کی وجہ سے اندھے ہو گئے ہیں تو میں اُن پر الزام نہیں لگاؤں گا لیکن خود مجھے تکلیف اُٹھا کر کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ مجھے اُمید ہے کہ میرے برت سے ہندوؤں اور سکھوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ حقیقت کو دیکھ سکیں گے۔۔۔۔" (ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد)

گاندھی جی کے برت رکھنے کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی اور بڑی تیزی سے اُس کا اثر خواص و عوام کی ذہنیت پر ہونے لگا۔ لوگوں میں انسانیت عود کر آئی اور وہ لوگ جو امن میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے، انہوں نے بھی اپنی غلطی کا احساس کیا۔ کیونکہ کوئی بھی گاندھی جی کو کھو دینا نہیں چاہتا تھا۔ قانون، سرکاری عملہ اور سوشل ادارے جو بے حس و حرکت نظر آتے تھے، مشین کی طرح کام کرنے لگے۔ برت توڑنے کے لئے گاندھی جی نے جو شرطیں رکھی تھیں، وہ بجلی کی طرح تیزی سے پوری ہونے لگیں اور انہوں نے ذمہ دار لوگوں کے اطمینان دلانے پر برت توڑ دیا۔ پھر بھی وہ خاموش نہ بیٹھے اور اپنی پرارتھنا کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن فرقہ پرست جماعتوں اور متعصّب عناصر کو اُن کے امن بحال کرنے کا یہ طریقہ سخت ناگوار اور ناپسند ہوا۔ وہ اپنا غصّہ گاندھی جی کے خلاف پروپیگنڈا کرنے، عوام کو اُن سے بد دل کرنے اور بھڑکانے میں صرف کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ بڑا خطرناک نکلا۔ پرارتھنا میں قرآن شریف پڑھے جانے پر مخالفت اور اعتراض ہونے لگے۔ غصّے کا اظہار ہونے لگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ اُن پر بم بھی پھینکا گیا۔ لیکن گاندھی جی پھر بھی اُن لوگوں کو ایک ناسمجھ بچے ہی کی طرح سمجھتے رہے اور ان کا صبر و ضبط اپنی خاموش زبان میں قوم سے کہتا تھا ؎

میں نے چاہا تجھ سے چھینا ہے تو چلّاتا ہے تُو      مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تُو

(اقبال)

لیکن وہ ایک طوفان تھا جو گاندھی جی کے مخالفوں اور شر پسندوں کو اندھا اور بہرا کر گیا تھا۔ اُن کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں۔ یہاں تک کہ یہ طوفان ایک دن اس روشن چراغ کو بھی ہمیشہ کے لئے گل

کر گئیں، جس کی بدولت سارے ملک میں نہ صرف آزادی کی روشنی پھیلی بلکہ امن اور سچائی کی روشنی بھی پھیل رہی تھی
دنیا کی تاریخ میں یہ محسن کشی کی ایک اور داستان تھی جو خونیں حروف میں لکھی گئی

ع "چوں حرفِ حق بلند شود، دار می شود۔"

گاندھی جی اپنی سیاسی زندگی ہی میں نہیں، ذاتی زندگی میں بھی نظم وضبط، اصول اور قاعدے کے سخت پابند تھے۔ کسی بات کی تلقین کرنے سے پہلے وہ خود اس کی عملی مثال قوم کے سامنے پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سچائی، امن، عدم تشدد، ایثار اور قربانی کا وہ جذبہ جو اُن کی اپنی زندگی کا جزو تھا، پوری جماعت کے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حکومت اور قانون کے انتہائی تشدد پر بھی مجال کیا کہ کسی قومی کارکن کی پیشانی پر بل آجائے اور وہ عدم تشدد امن اور صبر وضبط کے اصولوں کو توڑ سکے۔ ایک مرتبہ ایسا وقت بھی آیا کہ دار وگیر کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جیلیں بھری جانے لگیں۔ انقلابی ہونے کا شبہہ ہونے کی دیر تھی اور کسی خاص وعام کی کوئی تخصیص نہ تھی۔

ع "جسے دیکھا حاکمِ وقت نے، کہا یہ بھی قابلِ دار ہے"

بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ شروع تھا۔ جگہ جگہ کانگریسی والنٹیر مرد اور عورتیں بدیشی کپڑے کا استعمال ترک کرنے اور دیسی کپڑا پہننے کا پرچار کر رہے تھے۔ تمام آنے جانے والوں سے، راہ گیروں سے، موٹر نشینوں سے، پیدل چلنے والوں سے، غریبوں سے، امیروں سے، سرکاری ملازموں سے، تاجروں سے اور مزدوروں سے۔ ان میں سے بہت سے خاموشی سے سُن لیتے۔ ہاں میں ہاں ملاتے، وعدے کرتے اور اپنی راہ لیتے۔ اکثر جوش میں آکر پہنا ہوا کوئی بدیشی کپڑا مثلاً ٹائی یا کوٹ وغیرہ جسم پر سے اُتار کر اُسی وقت پھینک دیتے۔ اُس کو وہیں نذرِ آتش کر دیا جاتا اور جوش و مسرت سے بھرپور "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ فضا میں بلند ہو جاتا۔ پھر بعض ایسے مخالفین بھی نکل آتے کہ تکرار کرنے لگتے۔ لیکن اُن کی ترش روئی اور بدکلامی کا جواب ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر دیا جاتا۔ بدیشی کپڑے کی دکانوں پر والنٹیروں کی جماعتوں نے جن میں نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں، ستیہ گرہ شروع کی اور دکانوں کے سامنے فٹ پاتھ پر اس طرح دراز ہو گئے کہ اُن پر پاؤں رکھے بغیر آنا جانا ناممکن تھا۔ پھر بھلا کس کی ہمت تھی جو اتنی جرأت کرے۔ پولیس آئی، لاٹھی چارج ہوا، چوٹیں لگتی رہیں، جسم سے خون بہتا رہا۔ لیکن سوائے قومی نعروں کے کسی کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

پولیس اور سرکاری افسروں کو دیکھ کر یا اُن کی سخت کارروائی پر بھی یہ مجال نہ تھی کہ اپنی مدافعت کے لئے ہی ہاتھ اُوپر اُٹھ جاتا۔ لیکن انہیں شرمندہ اور خجل کرنے کے لئے دلچسپ گانوں اور طرح طرح کے طنزیہ نعروں کی کمی نہ تھی۔ جہاں کوئی پولیس والا یا کوئی سرکاری افسر نظر آتا، "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے، ٹوڈی بچہ ہائے" کے نعروں کے ساتھ استقبال ہونے لگتا اور کبھی تالیوں کی دھن کے ساتھ پنجابی گانا بھی شروع ہو جاتا۔

سرکار ظالم نئیں رکھنی بھائی ساڈے بھو نے مرنی
نئیں رکھنی بھئی نئیں رکھنی سرکار ظالم نئیں رکھنی

---

نظم وضبط، ایثار، قربانی اور بے لوث و بے غرض کام کرنے کا یہ جذبہ بڑے سے بڑے لیڈر سے لے کر معمولی کارکن اور والنٹیر تک سب میں یکساں تھا۔ اِس بات کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں چند شخصیتیں اُبھر آتی ہیں۔ سب سے پہلے عبد القدیر ولا اخوان کا خیال آتا ہے۔ بہت خاموش طبیعت کے نیک بزرگ۔ تھے اُردو بازار

جامع مسجد پر اسٹیشنری اور کورس کی کتابوں کی دکان تھی۔ کچھ اسکولوں اور کالجوں کو سرپرستی انہیں حاصل تھی جہاں کے طلبا کو اپنی ضرورت کی چیزیں اُن کے ہاں سے خریدنے کی ہدایت تھی۔ چہرے پر لمبی گھنی داڑھی اور سر پر سفیدی نمایاں تھی — گاڑھے کا لمبا کرتہ اور پاجامہ پہنتے تھے۔ دکان پر اکثر نظر آتے اور کبھی دنوں غائب رہتے۔ کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ ایک زبردست کانگریسی کارکن ہیں اور پارٹی کے مقاصد کے لئے ایک خفیہ پریس چلا رہے ہیں۔ اُن کا کہنا تھا "پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی ہر وقت میرے پیچھے رہتی تھی۔ لیکن جب میں گھر سے نکلتا، کبھی سیدھا پریس نہ جاتا۔ دو چار دوسری جگہوں پر ہوتا ہوا جاتا۔ اس میں گھنٹوں لگ جاتے اور وہ لوگ آخر تھک کر میرا پیچھا چھوڑ دیتے۔ اگرچہ اس میں کئی گھنٹے بے کار ضائع ہو جاتے لیکن اس طرح ان لوگوں کو بے وقوف بنا کر پارٹی کا کام وقت پر ہو جاتا۔ بعض وقت کوئی ضروری کام آ پڑتا تو رات بھر لوسٹر وغیرہ چھپوا کر سارے شہر میں اس طرح لگوا دیتے کہ پولیس اور قانون بھی حیرت میں پڑ جاتے۔"

اس طریقے سے وہ خاموشی کے ساتھ وطن کی خدمت کرتے رہے۔ آزادی کا مرحلہ طے ہونے کے بعد انہیں کسی نے دولت اور مرتبے کے پیچھے دوڑتے نہیں دیکھا۔ بلکہ اسی طرح دکان سے دکان ہی پر کام کرتے دیکھا۔ گویا جو کچھ قربانی انہوں نے دی وہ صرف اُن کا ایک فرض تھا جسے انہوں نے ادا کر دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر انصاری کا خیال آتا ہے۔ بڑی پروقار شخصیت تھی۔ بزرگوں کے وقت سے میرے والد صاحب سے تعلقات تھے اور وہ ایک فیملی ڈاکٹر کی طرح اکثر گھر پر آتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کی مصروفیت کی وجہ سے اُن کی کوٹھی پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کمرے میں کسی مریض کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ باہر دوسرے مریضوں کا مجمع منتظر بیٹھا تھا کہ اتنے میں پولیس آئی اور اُن کو حراست میں لے گئی۔ اُن کے ساتھ اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا تھا لیکن وہ اپنی پریکٹس خراب ہونے پر کبھی چیں بجبیں نہ ہوئے۔ اگرچہ وہ ایسے صاحب فن تھے کہ جب بھی جیل سے واپس آتے، مریضوں کا اتنا ہی مجمع لگ جاتا۔ تاہم اس طرح اُن کے پیشے کی شہرت اور تمام پر نہ سہی آمدنی پر تو اثر پڑتا ہی تھا۔ لیکن انہوں نے قوم اور ملک کے کاموں کو ہمیشہ مقدم سمجھا اور اپنے ذاتی مفاد کو بھی ہمیشہ اُس پر قربان کیا۔

ایک اور ہستی رفیع احمد قدوائی کی تھی جن سے میں آزادی کے بعد جب بھی وہ کلکتہ آئے، اکثر ملا ہوں۔ شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ رفیع احمد قدوائی آنریبل منسٹر ہونے پر بھی صرف رفیع احمد قدوائی ہی رہے۔ اُن کے دروازے بغیر کسی تخصیص کے ہر خاص و عام کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ اسی لئے وہ کبھی راج بھون میں نہیں ٹھہرتے تھے تاکہ کسی کو اُن سے ملنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ میں اُن سے اس وقت بھی ملا جب ان کی محفل میں بڑے بڑے تاجروں سے لے کر، مزدور، طالب علم، مصوّر اور آرٹسٹ تک سب ہی موجود ہوتے، لیکن اُن کا اخلاق سب کے ساتھ یکساں ہی دیکھا۔ ضرورت مندوں کے کام اگر وہ خود کر سکتے یا کسی سے کہہ کر کرا سکتے تو اُسی وقت کرا دیتے۔ دوسرے وقت پر کبھی نہ ٹالتے۔ پھر اُن سے بارہا تنہائی میں بھی ملا۔ ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا اور یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ایک منسٹر بھی ہیں۔ ایک مرتبہ اناج اور راشن کی کمی کی بات چھڑ گئی۔ اُن دنوں اناج اور راشن کی کمی کا مسئلہ بہت اہم ہو رہا تھا، جسے اُن سے پہلے کئی منسٹر حل نہ کر پائے تھے، سن کر کہنے لگے۔ اناج اور راشن تو بہت ہو جائے گا۔ لوگوں کے پاس خریدنے کے لئے پیسہ ہی نہ ہوگا اور پھر کچھ روز بعد راشن ختم ہو گیا اور بازار میں اناج ہی اناج ہو گیا۔ لیکن عوام کی قوتِ خرید کے بارے میں اُن کا تجزیہ کتنا درست تھا۔ غریبوں کی اکثریت کے لئے قحط اناج کا نہیں، پیسے کا ہے اور وہ اُس وقت بھی تھا، آج بھی ہے۔

ایک مرتبہ صبح اُن سے ملنے کا وقت مقرّر تھا۔ جب پہنچا تو موجود نہ تھے۔ لیکن ملازم اُن کا پرچہ لیے میرا منتظر تھا لکھا تھا کہ وہ کسی ضروری کام سے باہر جا رہے ہیں اور یہ کہ میں شام کے وقت اُن سے ملاقات کر لوں۔ ملازم نے مجھے بتایا کہ وہ اُسے تاکید کر کے گئے تھے کہ جب تک مجھے پرچہ نہ پہنچا دے کہیں باہر نہ جائے۔ اُن کے اس اخلاق کا میرے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا۔

وہ بہت بلند نظر، سچائی، سادگی اور خلوص کے پیکر تھے معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کے اُصولوں کے سچے پیرو ہیں۔ خود زمین دار ہوتے ہوئے بھی زمین داری ختم کرانے میں پیش پیش رہے۔ کبھی کوئی دولت یا پیسہ جمع نہ کیا اور نہ کبھی اس کی چاہ کی۔ ایک مرتبہ اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ قدوائی صاحب غالباً پندرہ سو رُوپے کے قرضدار ہیں اور اس کی وصولیابی کے لئے کسی نے عدالت میں مقدمہ دائر کیا ہے۔ پھر دُوسرے روز یہ خبر شائع ہوئی کہ کسی نامعلوم شخص نے یہ رُوپیہ عدالت میں داخل کر دیا ہے۔ لیکن انہیں کسی بات کی خبر نہ ہوئی۔ اپنی ذات سے متعلق دنیا سے اُن کی بے خبری اور بے نیازی کا یہی عالم تھا۔ لیکن وطن اور ہم وطنوں کی خدمت کے لیے ان کی دلچسپی اور مستعدی کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ راشن کی دوکانوں اور ڈاکخانوں میں خود عوام کے ساتھ لائن میں کھڑے ہو جاتے اور عوام کی تکالیف اور کام کرنے والوں کی مشکلات کا اندازہ خود کرتے۔ آج کل اس طرح اپنے فرائض کی بجاآوری کے لئے عملی اقدام کی اتنی اہمیت کون سمجھتا ہے اور اب اتنا احساس بھی کہاں نظر آتا ہے۔ یہ ذکر برسبیل تذکرہ میں نے اس لئے کیا کہ

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے — ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صُورت کو بگاڑ

ایک وہ لوگ تھے جنہوں نے مُلک اور قوم کے لئے اپنا سب کچھ قربان کیا اور ایک وہ ہیں کہ دولت اور مرتبے کے پیچھے بے تحاشا دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ آئے دن اخبارات میں اُن پر الزامات شائع ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں سوال اُٹھتے ہیں اور وہ اپنی صفائی میں جواب پیش کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے اُصولوں کے بجائے زندگی کے ہر شعبے میں لُوٹو۔ مارو۔ کھاؤ کے اُصول اپنائے جا رہے ہیں۔ خود غرضی اور لالچ کی عام ذہنیت پختہ ہوتی جا رہی ہے۔ اب کچھ لیڈروں کو برسوں سے مچی ہوئی اس "دھاندلی" کا احساس ہوا ہے۔ دیکھئے شہیدوں کا خُون کب رنگ لاتا ہے اور گاندھی جی کا خواب کب پُورا ہوتا ہے۔

گاندھی جی کا خواب کیا تھا۔ اُنہوں نے کس مقصد کے لئے اپنی آواز بلند کی اور اُس وقت ان کی آواز اور ان کی شخصیت کی کتنی اہم ضرورت تھی۔ اس کا اندازہ نہرو کے اِن الفاظ سے ہوتا ہے۔

"..... ہم ہندوستان کو غُربت، افلاس اور احساسِ کمتری کے پنجے سے کس طرح نکالیں جو اُسے کھائے جا رہا ہے۔ یہ دو چار برس کی بات نہیں، پشتوں سے ہمارے عوام اپنا خُون، اپنے آنسو اور اپنا پسینہ بھینٹ چڑھاتے چلے آ رہے ہیں۔ اس طریقۂ کار نے ہندوستان کو اس کے جسم اور رُوح کی گہرائی تک کھا لیا ہے اور ہماری اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں زہر گھول دیا ہے' بالکل ایسے مرض کی طرح جو پھیپھڑوں کو اندر ہی اندر کھا لیتا ہے اور آہستہ آہستہ موت کی طرف لے جاتا ہے اور تب گاندھی جی اس طرح آئے، جیسے تازہ ہوا کا ایک تیز جھونکا، جس نے ہمیں تازہ دم کر دیا اور ہم سانس لینے اور ہاتھ پاؤں پھیلانے کے قابل ہو گئے اور بالکل روشنی کی ایک تیز دھار کی طرح جس نے تاریکی کو چیر کر رکھ دیا اور ہماری آنکھوں سے سب پردے ہٹا دیئے۔ اُن کی تعلیم کا نچوڑ تھا۔ بہادری، سچائی اور عمل۔ وہ کبھی قسمت یا کسی ایسی چیز سے

جو اُن کی نظر میں بُری ہو، ہار ماننے والے نہ تھے۔ اُن میں مقابلہ کرنے کی زبردست طاقت تھی لیکن امن اور انسانیت کے اصولوں کے ساتھ۔

اُس وقت انگریزی حکومت میں جان لیوا خوف کی ایک حس تھی جو چاروں طرف سے مسلط تھی۔ پولیس کا خوف، فوج کا خوف، قانون کا خوف، مخبری کا خوف، قید و بند کا خوف، زمین دار اور اُس کے کارندے کا خوف، مہاجن کا خوف، بے روزگاری کا خوف، بھوک اور فاقے کا خوف۔ یہ سب خوف تھے جن کے خلاف گاندھی جی کی پُرعزم اور پُرامن آواز بلند ہوئی۔" (ڈسکوری آف انڈیا۔ نہرو)

لیکن افسوس گاندھی جی کا خواب آزادی کے بعد بھی پورا نہ ہوا اور آج اتنا سب کچھ کھو دینے کے بعد بھی جو کچھ ہم نے پایا ہے، نفرت، غصہ، مذہبی تعصب، مایوسی، مستقبل کا خوف، بے روزگاری کا خوف، فرقہ وارانہ فسادات کا خوف اور کم و بیش وہی سب طرح طرح کے خوف ہیں کہ ہم پر مسلط ہیں۔ جن کے خلاف گاندھی جی نے اپنی آواز بلند کی تھی اور اپنی جان کی قربانی دی تھی۔

مُلک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ آج بھی گٹر میں زندگی بسر کر رہا ہے اور کوڑے کے ڈھیر میں اپنا رزق تلاش کر رہا ہے۔ باہر سے آنے والے سیاح کیلے کے پھینکے ہوئے چھلکوں پر انسانوں کو جھپٹتے ہوئے دیکھ کر تعجب سے اب بھی کہتے ہیں کہ اُن کا ملک۔ جو کروڑوں کی دولت امداد کے لئے دے رہا ہے وہ آخر کہاں چلی جاتی ہے اور طنز کرتے ہیں کہ یہ رُوپیہ ان کے ملک میں درختوں میں نہیں لگتا۔ اُن کے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے لیا جاتا ہے۔

دوسری طرف ملک کی آبادی کا وہ حصہ ہے جس میں ذہین اور جینیس پیدا ہوتے ہیں اور وہ زندگی کا ایک بڑا حصہ اعلیٰ تعلیم کی جدوجہد میں ضائع کرنے کے بعد اپنے آپ کو بے سہارا اور مستقبل کے تحفظ سے محروم پاتے ہیں اور یہ محرومی انہیں تخریب کی طرف مائل ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ممکن ہے گاندھی جی زندہ رہتے تو ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ عوام آزادی کا صحیح لطف اُٹھا سکتے۔ ملک میں خوش حالی ہوتی۔ تخریبی عناصر کو اتنی چھوٹ نہ ملتی، اتنی لوٹ مار نہ ہوتی۔ ممکن ہے گاندھی جی غلامی کی زنجیروں کے ساتھ ساتھ فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ فسادات کی اِس لامتناہی زنجیر کو بھی ہمیشہ کے لئے کاٹ دیتے جو مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ممکن ہے وہ ان چھ کروڑ ہاتھوں کو جو آہستہ آہستہ عضوِ معطل ہوتے جا رہے ہیں، ملک کی تعمیر و ترقی میں اور زندگی کے ہر شعبے میں کام کرنے اور زندہ رہنے کا جائز حق دلا دیتے اور ان چھ کروڑ ہاتھوں کی شمولیت اور طاقت ملک کو چار چاند لگا دیتی اور ملک صحیح معنوں میں ایک سچی جمہوریت کی اعلیٰ مثال بن جاتا۔ بلاشبہ گاندھی جی زندہ رہتے تو یہ امکان ایک حقیقت ہوتا، کیونکہ وہ آزادی کی تاریخ کے اس ورق کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔

"۔۔۔۔ ترقی یافتہ، جرأت مند اور بے غرض مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ کانگریس میں شامل تھا اور شانہ بشانہ اس کے لئے کام کر رہا تھا۔۔۔۔

۔۔۔۔ ہمارے لئے یہ ناممکن تھا کہ کانگریس کی کسی ایک فرقے کی جماعت قرار دیں اور اُس کے بنیادی اصولوں کو ختم کر دیں، کیونکہ کانگریس ایک قومی جماعت ہے اور مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اِس سے وابستہ ہے اور ان میں کانگریس کے بڑے بڑے عہدے دار اور ذمے دار ہستیاں بھی ہیں۔"

لیکن فرقہ پرست قومی یک جہتی اور اتحاد کی اس تاریخ کو مٹا دینا چاہتے ہیں اور موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے نفرت اور تعصب سے بھرپور ایک نئی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں، تاکہ سیاسی کھیل میں ہمیشہ اُن کی جیت رہے اور ان کا نام ہو۔ اس مسئلے کا حل اگرچہ ناممکن نہیں، لیکن اتنا آسان بھی نہیں کہ گفتند، نشستند اور برخاستند یا تحقیقاتی کمیشن سے حل ہو جائے۔ اس کی بنیادیں بہت مضبوط اور مضبوط ہو چکی ہیں اور اس کی تاریخ بہت پرانی ہے اس تاریخ کو بدلنا اور ان بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ ملک کے دوسرے مسائل بھی کوئی عقدۂ لاینحل نہیں کہ حل نہ ہو سکیں۔ آخر دوسرے ممالک بھی ہیں جنہوں نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد از سرِ نو زندگی شروع کی اور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ اتنی حیرت انگیز ترقی کی کہ چند ہی برسوں میں نہ صرف بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ بلکہ وہ پس ماندہ ملکوں کو امداد بھی دینے لگے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارا ملک ابھی تک نہ صرف پس ماندہ ہے بلکہ روز بروز ترقی کے بجائے بعض اعتبارات سے گرتا ہی جا رہا ہے۔ اسے اوپر اٹھانا، بلندی کی طرف لے جانا اور ان تمام مسائل اور مشکلات کا حل، اُسی وقت ممکن ہے جب کوئی پیارا ہیرو پیدا ہو اور سچی لگن کے ساتھ میدانِ عمل میں آئے۔ وہ گاندھی جی کی جگہ لے۔ سچائی اور بہادری کے ساتھ اُن کے اصولوں پر چلے اور ڈٹ کر باطل کا مقابلہ کرے۔ قوم کی ذہنیت کو بدل دے۔ ان میں فراخ دلی اور بلند نظری پیدا کر سکے اور یہ حقیقت دلوں میں پیوست کر سکے کہ

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں — غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے — کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

آج سارا ملک بیداری کے بجائے خوابِ غفلت، محبت کے بجائے دشمنی اور تعمیر کے بجائے تخریب میں مبتلا ہے۔ گوڈسے نے تو گاندھی جی کو صرف ایک مرتبہ ہی مارا تھا لیکن ہم انہیں آج بائیس سال سے ہر روز اور مسلسل مارتے چلے آرہے ہیں اور اُن کے چھوڑے ہوئے قیمتی سرمایے کو فنا کر دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ آج وقت ہے کہ حکومت، سیاسی جماعتیں، سوشل ادارے، ذمہ دار ہستیاں اور قوم کا ہر فرد اپنے دلوں کو ٹٹولے۔ حالات کا جائزہ لے اور تجزیہ کرے کہ گاندھی جی کی زندگی کا مقصد کہاں تک پورا ہوا ہے اور سوچے کہ ہم نے اب تک کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ لیکن کاش یہ ممکن ہو سکتا۔

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا — تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

## بقیہ "آتما سے پرماتما تک"

ساتھ اُسی وقت انصاف کر سکیں گے جب اُن کے بتائے ہوئے آدرشوں کو اپنا کر عملی جامہ پہنائیں گے۔ غالباً بھولے ہوئے سبق کو دوہرانے کا اب وقت آ گیا ہے اس لئے کہ ہم اُن کی بتائی ہوئی راہ سے دور ہوتے جا رہے ہیں یعنی اپنے آپ سے اور اپنے ملک ہندوستان سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ انکی لافانی رُوح کو کوئی گوڈسے اپنی گولی کا نشانہ نہیں بنا سکتا۔ شرط اُنکے بتائے ہوئے اصولوں اور بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی ہے۔ باپو صرف ایکبار قتل ہوئے لیکن انکی رُوح اور آواز بار بار زندہ ہو رہی ہے۔ انسانی برادری کی کھوج میں قتل ہونیوالی رُوح کی زندگی کی ضمانت انسان امر ہے اور جبتک انسان زندہ ہے موہن داس کرم چند گاندھی کی مہا آتما زندہ رہیگی اسلئے بھی کہ امر آتما کی موت کبھی نہیں ہوتی۔ اور کہتے ہیں کہ آتما اور پرماتما میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔۔ یہ بھگوان کا ایک انگ ہوتا ہے جو اپنی یاترا کو ختم کر کے اپنی دِشا کی طرف لوٹ جاتا ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آتا۔!!

ارنلڈ جوزف ٹوئینبی
ترجمہ: نادرہ یوسف دلوی



# گاندھی جی — ایک مہاتما

گاندھی جی کا نام مہاتما محض تعظیمی نہیں، وہ ان کے متعلق حقیقت بیان کرتا ہے۔ وہ یقیناً ایک مہاتما تھے۔ ہمارے دور کے لوگوں میں وہ عظیم ترین شخص گذرے ہیں۔ وہ بلا شبہ ہمارے پچھلے دور کی اُن عظیم ہستیوں کے ہمسر تھے جن کی شخصیت کا لاآفاقی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے اور اس خیال سے وہ سب لوگ متفق ہوں گے جو یہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کون تھے اور انہوں نے کیا کیا۔ لیکن اتفاقاً میں انگریز ہوں اور انگریز ہونے کی وجہ سے کیا میں گاندھی جی کی موافقت میں کہنے کا حقدار ہوں ؟

میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کا حق رکھتا ہوں، کیونکہ میرے نزدیک گاندھی جی میرے ملک کے بھی اُتنے ہی محسن تھے جتنے کہ خود اپنے ملک کے۔ گاندھی جی نے انگریزوں کا ہندوستان پر حکومت کرنا ناممکن بنادیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے ہمارے لئے بغیر کسی بغض و عناد اور بے عزتی کے حکومت سے دست بردار ہو جانا بھی ممکن کر دیا۔

اُنہوں نے باہمی خون ریزی کے بغیر یہ ممکن بنادیا کہ ہندوستان کی حکومت برطانیہ کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھ منتقل ہو جائے اور برطانوی و ہندوستانی سیاسی طور سے ایک دوسرے سے علٰحدہ ہونے کے بعد بھی آپس میں دوست بن کر رہیں جس کی بنیاد مساوات، خوش گوار تعلقات اور بھائی چارے کے جذبات پر ہو۔ لیکن ایسے تعلقات اس وقت تک قائم نہیں ہو پاتے جب تک کہ حاکم اور محکوم کا فرق ختم نہ ہو جائے۔ گاندھی جی نے برطانیہ کی بے نظیر خدمت اِس طرح کی کہ انہیں اس جال سے نکال باہر کیا کیونکہ سلطنت حاصل کرنا اِس سے دست بردار ہونے کی بہ نسبت آسان ہے۔

۱۹۱۷ء میں پہلی جنگِ عظیم کے دَوران ولیسٹ منسٹر کی پارلیمنٹ نے ہندوستانیوں کو بتدریج حکومتِ خود اختیاری دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ وعدہ کرتے ہوئے دراصل اس نے انگریز عوام کے احساسات اور خواہشات کی پُرخلوص نمائندگی کی تھی کیونکہ یورپ جس وقت خوفناک مصیبت سے دوچار تھا، اس وقت ہندوستانیوں کی عنایت اور ہمدردانہ ردِ عمل نے ہمارے دلوں کو متاثر کیا۔ اُنہوں نے اپنے غیر ملکی حاکموں کو مصیبت میں دیکھا تو اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے طور پر فرانس میں مقیم برطانوی

فوج کو اپنی خدمات پیش کیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانیوں کا اُس وقت یہ خیال تھا کہ برطانیہ باوجودیکہ حکومت خود اختیاری کا مطالبہ جو ہندوستانیوں نے کیا تھا، پورا نہیں کر رہا ہے لیکن پھر بھی وہ اصولاً آزادی کا علمبردار ہے اور آزادی کی خاطر لڑ رہا ہے۔ اگر وہ اس جنگ میں کامیاب ہو گیا اور ہندوستانیوں کی مدد سے کامیاب ہوا تو اُس کا ضمیر ضرور اسے ہندوستانیوں کو آزادی دینے کی ترغیب دے گا۔

انگریزوں کے دلوں پر ہندوستانیوں کے اس ردِّ عمل کا اثر یقیناً ہوا ہوگا کیونکہ برطانیہ نے ۱۹۱۷ء میں جو فیصلہ کیا تھا، وہ مخلصانہ تھا اور حکومت برطانیہ اس فیصلے پر عمل کرنے کی طرف قدم بڑھاتی بھی، لیکن کسی کو اس وقت بخوشی اختیارات دینا جب کہ وہ اسے لینے کے قابل ہو جائے یہ چیز انسانی فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ ہندوستانیوں کو بتدریج حکومت دینے کا وعدہ پورا کرنے میں انگریزوں نے لیس و پیش کیا۔ یہاں تک کہ ان پر سے ہندوستانیوں کا اعتماد اُٹھ گیا۔ اُس وقت ہندوستان میں انقلابی تشدّد ہوتا اور جوابی تشدّد یا حملہ برطانیہ کی طرف سے اور اس طرح یہاں بہت خون ریزی ہوئی ہوتی تو حالات قابو سے باہر ہو جاتے۔

کہانی کے اِس المیہ رُخ اختیار کرنے کا اندازہ افسردہ تاریخی واقعات کے سلسلے سے ہوتا ہے۔ گاندھی جی نے واقعات کے دھارے کو ایک نیا موڑ دیا اور اِس نئے موڑ نے کہانی کا ایک خوش گوار اختتام کیا۔ اس طرح برطانیہ اور برصغیر کے آپس کے تعلقات تو قائم رہے لیکن بدقسمتی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات قائم نہ رہ سکے۔

اسی وجہ سے برطانوی ہونے کے باوجود میں گاندھی جی کے سلسلے میں شاید غیر واجبی طور سے جانبدار رہوں گا۔ کیا اُن کے سلسلے میں کیا ہوا میرا یہ فیصلہ اُس وقت غیر پسندیدہ ہوتا اگر اتفاقاً جائے پیدائش کی بنا پر میں ایرانی، سوئڈ یا تھومین کہلاتا؟ میرا خیال ہے کہ نہیں، کیونکہ گاندھی جی نے ہندوستان اور برطانیہ کی جو خدمت کی وہ دراصل ساری انسانیت کی خدمت تھی۔ گاندھی جی نے اِس سیاسی تغیر اور سیاسی اختیارات کے تبادلے کے لئے وسیع پیمانے پر بنا خون ریزی اور دشمنی کئے ایک راہ ڈھونڈ نکالی۔

انہوں نے نہ صرف یہ کہ راہ ڈھونڈی بلکہ سیکڑوں اور کروڑوں افراد کو اپنے پیچھے چلنے پر اُکسایا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مابین انہوں نے جو کچھ کیا اُس نے ساری دنیا کے لئے ایک مثال قائم کر دی۔ انہوں نے سیاست کے میدان میں لوگوں کو اخلاقی درس دیا اور وہ بھی اٹومک دور کے بالکل آغاز میں۔

ایک ایسے طریق کار کی دریافت جو ایٹم کی بے پناہ قوت کو انسانی فلاح و بہبود کے کام میں لگا دے، آج کے سائنسی اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ زمانے میں انسان اور اُس کی ذہنی ترقیوں کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اِس کاری ضرب کا فوری مصرف تباہ کن اور جان لیوا آلاتِ جنگ بنانے میں ہوا جو انسان کی ٹیکنالوجی کی ترقی میں موافقت اور انسانی رشتے کی عملداری میں تنزل یا بہ الفاظِ دیگر اخلاقی طور سے تنزل کا اشارہ ہے۔

انسان کی سائنسی اور ٹیکنالوجی ہمت اپنے ہاتھ میں جس قدر زیادہ مادی طاقت رکھتی ہے، اتنا ہی اُس کی

مادی ترقی اور روحانی تنزل کے درمیان کا شگاف بڑھتا جاتا ہے اور اُس کو مادی طاقت کی قیمت بڑھانے اور بُرے اور احمقانہ مقاصد سے اپنے آپ کو تباہ کرنے کا خطرہ زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

آٹومک ہتھیاروں کی ایجاد اور استعمال نے اِس خطرے کو بہت زیادہ سخت بنا دیا ہے اور اِس بات کی فوری ضرورت ہے کہ ایک عظیم اخلاقی اصلاح کے ذریعے انسان اپنے آپ کو خود اپنی ذات سے بچائے رکھے۔ اب انسان کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ تشدّد کا استعمال چھوڑ دے۔ یہ کسی خاص طریقۂ جنگ کے لئے نہیں بلکہ انسانوں کے مابین ہر قسم کے تعلقات کے لئے ضروری ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور انسانی تعلقات سب سے بڑی ناکامی لیکن انسانی رشتے کئی طرح کے ہیں۔ بعض قسم کے انسانی رشتوں میں ہمارا اخلاقی جرم دیگر رشتوں سے نسبتاً کم سخت رہتا ہے۔ جہاں تک ہمارے ذاتی رشتوں کا سوال ہے اس میں ہم بہت کم خراب ہیں، یعنی شوہر اور بیوی کے تعلقات، والدین اور بچوں کے تعلقات، دوست اور دوست کے تعلقات وغیرہ۔ لیکن ان غیر ذاتی تعلقات کے معاملے میں ہم بدترین ثابت ہوتے ہیں جن میں ہمارے ایک دوسرے سے تعلقات براہ راست نہیں بلکہ غیر انسانی صفات سے متصف کرنے والے ادارے کے ذریعے ہوتے ہیں۔ یہ وہ میدان ہے جس میں انسان اپنے بدترین رُوپ میں ہوتا ہے اور اِس گندے میدان میں سب سے زیادہ گندہ علاقہ سیاست کا ہے۔

غلاظت کو صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ گندگی اور رکاوٹوں کو دُور کرنے کے لئے کسی عالی حوصلہ انسان کی ضرورت ہے۔ گندگی سے اپنے ہاتھ آلودہ کرنے کا خطرہ مول لئے بغیر کوئی یہ کام شروع نہیں کر سکتا۔ سیاسی غلاظت اخلاقی غلاظت ہے، وہ غلاظت جو کام کرنے والے کو ڈرا کر روکتی ہے، اخلاقی غلاظت ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی حساس پارسا اور شریف لوگ سیاست میں حصہ لینے سے بچتے ہیں اور اُس اختلاف نے جو کہ فطری ہے۔ بُرائی کا چکر پیدا کر دیا ہے، اس لئے سیاست اُس وقت تک اخلاقی پستی سے نکل نہیں سکتی جب تک کہ شریف ترین افراد اس غیر پسندیدہ کام کی طرف توجہ نہ دیں۔

سیاست کو اخلاقی پستی سے نکالنے کا کام اس وقت زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے جب کہ انسان کا مادی طاقتوں پر اختیار بڑھ جاتا ہے، اِس لئے کہ سیاست وہ میدان ہے جس میں اقتدار بڑے ظالمانہ طریقے سے انسانی رشتوں کے طور طریق پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اٹومک دور میں پچھلے ادوار کی بہ نسبت شریف النفس لوگوں کا سیاست کی دلدل میں داخل ہو کر رُوحانی طور پر خطرے میں مبتلا ہونا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ رُوحانی دین جس کی وجہ سے گاندھی جی نے خود کو آلودہ ہونے سے بچایا، دراصل اُن کا روحانی تحفہ تھی اور بہت کمیاب۔ کیونکہ روحانی غلاظت میں بغیر خود کو متاثر کئے رہنا اور کام کرنا انہیں کا کام ہے۔ میرا خیال ہے کہ باطنی طور سے گاندھی جی نے اُس وقت بھی خود کو سیاست سے بالکل الگ تھلگ رکھا جب کہ ظاہری طور سے ان کی ذات بڑی مستعدی سے سیاست میں مصروف تھی۔

ایک صوفی منش کا طریقۂ سیاست اُس کی رُوح کے امتحان کی کسوٹی ہے اور اس بات پر غور کرنا کہ کس طرح ایک صوفی کا دوسرے سے موازنہ ہو سکتا ہے، ہمیں روشن ضمیری بخشتا ہے۔

گاندھی جی کے دو بڑے ہموطن بدھ اور اشوک سیاست کے تعلق سے نجات نہ پا سکے۔ دونوں شاہی گھرانوں

یعنی سیاست کی روحانی غلاظت میں حکومت کے ولیعہد کی حیثیت سے پیدا ہوئے۔ اِن عظیم افراد نے اُن روحانی رکاوٹوں کے خلاف بغاوت کی جن میں ان کی زندگی شروع ہوئی تھی۔ بدھ سیاست سے پورے طور سے الگ ہو گئے تھے اور انہوں نے باپ کے تخت کا جانشین ہونے کے روایتی قانون کو توڑ دیا تھا۔

بدھ نے خاندانی بندشوں اور سیاسی زنجیروں سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اپنے اور دوسرے حساس لوگوں کے لئے روحانی مسرت حاصل کرنے کی خاطر انہوں نے اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دیا۔ دوسری طرف اشوک ہے جس نے اپنی سیاسی میراث لی اور روایتی سیاسی گناہ یعنی جارحانہ جنگ کی اور جب اسے اپنے اس گناہ کا احساس ہوا تو وہ بہت زیادہ پشیمان ہوا اور اس سے متاثر ہو کر وہ بدھ مت کا پیرو بنا اور اس کی اشاعت بھی کی۔ مگر اس تغیرِ قلب کے باوجود وہ اپنے سیاسی اختیارات سے دست بردار نہ ہوا بلکہ علم کو پھیلانے اور اس طریقۂ حیات کو جسے بدھ نے اپنی روحانی جاں فشانی سے تیار کیا تھا۔ عام کرنے کی غرض سے بدستور اس پر قائم رہا۔

گاندھی جی کی زندگی کی ابتدا، اشوک یا اور بدھ کی طرح نہیں بلکہ عیسیٰؑ و محمدؐ کی طرح ہوئی۔ اِن دو پیغمبروں کی طرح گاندھی جی کی زندگی کسی ایسی سیاسی روش کی پابند نہ تھی جس کو وہ یا تو قبول کرتے یا ترک کرتے۔ اِن کی پیدائش بھی عام جگہ پر ہوئی اس لئے اگر وہ اپنے لئے سیاست سے الگ زندگی منتخب کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔

اِن حالات میں عیسیٰؑ نے اپنے آپ کو سیاست سے دور رکھا۔ انہوں نے سیاسی روش کی مجاہدانہ مہم میں شریک ہونے سے انکار کر دیا، جس کی اُن کے زمانے میں یہودی قوم کو اُمید تھی۔ دوسری طرف محمدؐ نے روحانیت کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما بننے کو بخوشی قبول کیا اور وہ اپنی اس سیاسی کامیابی کی وجہ سے روحانی طور پر اذیت میں مبتلا رہے۔ محمدؐ کی طرح گاندھی جی بھی جان بوجھ کر سیاست کی طرف گئے۔ گاندھی جی نے جب سیاست میں قدم رکھا تو اس وقت وہ اپنے پسندیدہ پیشے یعنی وکالت میں کامیاب تھے۔ سیاست کی طرف جانے کا ارادہ کرنے کا مقصد نہ تو ذاتی اُمنگ تھی اور نہ ہی ایک میدان میں ناکامی کی وجہ سے دوسرے میدان میں اس کی تلافی کی اُمید۔ ذاتی اعتبار سے اُن کا مقصد غیر دلچسپ تھا۔

گاندھی جی کا مقصدِ زندگی کی روحانی غلاظت سے اس کی روحانی سطح کو بلند کرنا یعنی اس کو سیاست کی دلدل سے نکالنا تھا۔ وہ کیچڑ میں چلے اور بتایا کہ کس طرح اسے بھی صاف کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ذاتی طور سے آلودہ ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس سے گاندھی جی کے اپنے روحانی مرتبے اور انسانی خدمت کی عظمت دونوں کا اندازہ ہوتا ہے اور انسانی تاریخ میں ایک نئے موڑ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ▲



ڈاکٹر میمونہ دلوی



# گاندھی جی اور ہندوستانی عورت

ہندوستان کے لئے گاندھی جی کی شخصیت کئی لحاظ سے قابلِ فخر ہے۔ آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے اُنہوں نے ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اس طرح اکٹھا کیا کہ وہ برطانوی سامراج کا برابر مقابلہ کرنے کے بعد آخر ملک کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو کر رہے۔ گویا ہندوستانی سیاست کی لیڈر شپ میں گاندھی جی کی اوّلیت و اہمیت اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ بڑے آدمیوں کا کمال یہ نہیں ہوتا کہ وہ زندگی کے کسی ایک دائرے ہی میں گامزنِ عمل رہیں اور کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کو پہنچیں، بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ تو وہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے دائرے میں جہاں بھی قدم رکھے، کامیابی اُس کے قدم چومے اور جب وہ منزل پر پہنچے تو اکیلا نہ ہو بلکہ اپنے ساتھ آزمودہ کار اور تجربہ کار لوگوں کا ایک قافلہ لے کر پہنچے۔ گاندھی جی کی بڑائی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ اپنے ملک و قوم کو نہ صرف سیاسی غلامی کی زنجیروں سے نکالنا چاہتے تھے بلکہ اخلاقی و روحانی حیثیت سے تعلیمی و ذہنی حیثیت سے اور معاشی و سماجی حیثیت سے بھی اپنے ملک کے ہر فرد کو کامیاب اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے سے ہمیں گاندھی جی کی ہمہ جہت اور پہلودار شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

گاندھی جی جانتے تھے کہ ملک کی ترقی سے مُراد اِس ملک کے ہر باشندے اور ہر فرد کی ذہنی و سماجی ترقی ہے۔ اگر اس ملک کا ہر فرد تعلیم یافتہ ہو، سماجی و معاشی اعتبار سے خود کفیل ہو، ذہنی طور سے سنجیدہ ایمان دار، نیک اور محنتی ہو تو ملک تہذیب و ترقی کی آخری حدوں کو چھو لے گا۔ لیکن فرد کی اس ترقی و تربیت کا ذمہ دار کون ہو؟ مشہور ہے کہ بچے کی پہلی تربیت گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی عورت کی ذہنی تربیت ہی گویا قوم و ملک کی تربیت کی پہلی سیڑھی ہے، اسی لئے گاندھی جی نے تعلیمِ نسواں کی طرف بھی خصوصیت سے توجہ دی اور اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے ہندوستانی عورت کی اصلاح و تربیت میں حصہ لیا۔ To the women کے نام سے جو کتاب چھپ چکی ہے، اس میں گاندھی جی کے وہ مضامین، تقریریں یا خطوں کے جواب درج ہیں جو مختلف اخباروں اور کتابوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہیں بیانات کی روشنی میں ہم دیکھیں گے کہ گاندھی جی کو ہندوستانی عورت سے کیا کیا اُمیدیں وابستہ تھیں اور وہ اسے کس مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔

گاندھی جی کے نزدیک سب سے پہلا اور ضروری کام یہ تھا کہ ہندوستانی عورتوں کی بڑی سے بڑی تعداد کو

ان کی زندگی کی موجودہ مشکلات کے بارے میں صحیح احساس پیدا کرایا جاسکے۔ دیگر ریفارمروں کی طرح گاندھی جی کا خیال یہ نہیں تھا کہ یہ کام عورت کو تعلیم یافتہ بنا کر ہی انجام پاسکتا ہے بلکہ درسی علوم کے بغیر بھی انہیں جینے کا صحیح سلیقہ سکھایا جاسکتا ہے۔ عورت مرد کی زندگی کی ساتھی ہے لہٰذا اس میں مرد کے برابر ہی ذہنی استطاعت موجود ہے۔ عورت کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ مرد کی نازک ترین یا اعلیٰ ترین کارگذاری میں صحیح طور سے حصّہ لے۔ مرد کے ساتھ ساتھ اُسے بھی آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ جس طرح مرد اپنے دائرۂ عمل میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے اِسی طرح عورت بھی اپنے دائرۂ عمل میں نہایت خوش اسلوبی سے اپنا کام انجام دے سکتی ہے۔ عورت کی اپنی برتری کے بارے میں اس قسم کے خیالات خود عورتوں کے ذہن میں اُجاگر کئے جاسکتے ہیں اور اس قسم کی ذہنی تربیت کے لیے لکھنے پڑھنے کی مشق کرانے کی ضرورت نہیں۔ گاندھی جی اس بات کے بھی سخت مخالف تھے کہ ہندوستانی سماج میں ایک جاہل اور کندۂ ناتراش مرد کو عورت کے مقابلے میں زیادہ فخر و عزّت کی زندگی گذارنے کا حق دیا جاتا ہے جب کہ وہ اس کا مطلق اہل نہیں اور نتیجے میں عورت ذِلّت اور خواری کی زندگی بسر کرتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ گاندھی جی عورتوں کے تحصیل علم کے خلاف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آدمی کی ذہنی نشو و نما اور اس کی صلاحیتوں کی جلا ہوتی ہے اور صحیح کام کرنے کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر عورت کو غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے زندگی کی مسرتوں اور اس کے حقوق سے محروم رکھا جائے تو یہ مرد کی سخت ناانصافی ہے۔ عورت کی ذہنی تربیت کرنے کے بعد اسے تعلیم سے واقف کرانا اشد ضروری ہے جس کی مدد سے پھر وہ اپنے آپ کو پہچان لیتی ہے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔ گاندھی جی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شادی شدہ جوڑے میں مرد کو باہر کے کاموں سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے اس کا باہر کی دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا ضروری ہے۔ جبکہ دوسری طرف گھر کی ذمہ داریاں سراسر عورت کے سر ہوتی ہیں۔ چنانچہ گھریلو کام کاج بچوں کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت کے بارے میں عورت کی معلومات کافی وسیع ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ علم کو دو الگ الگ خانوں میں بند کر دیا جائے یا علم کی چند شاخوں کے دروازے ایک پر کھلے ہوں اور دوسرے پر بند۔ بلکہ گاندھی جی کے نزدیک ہمارے علمی ادارے انہیں بنیادوں پر قائم کئے جائیں، تاکہ ہمارے ملک کے انگنت گھروں میں زندگی کا ڈھانچہ صحیح طور پر کھڑا ہوسکے۔

گاندھی جی ہندوستانی زبانوں کی تحصیل کے بارے میں سختی سے ہدایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عورتوں کا انگریزی زبان کا جاننا کچھ ایسا ضروری نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انگریزی کی ضرورت کاروباری سلسلے میں یا سیاسی میدان میں پیش آتی ہے اور ایک عام ہندوستانی عورت کا دخل ان دونوں میدانوں میں نہیں ہونا چاہیئے۔ عورت نوکری کرنے اور کاروباری کاموں میں حصّہ لینے کے لئے پیدا نہیں کی گئی ہے بلکہ عورت کا مقصدِ حیات بہت بلند ہے ہم ریفارمروں کا پہلا کام یہ ہے کہ اُسے ذہنی غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش کریں۔ اُس کے جسمانی تقدس کا سبق اُسے پڑھائیں۔ قومی خدمت کی عظمت کا درس دیں اور انسانیت کی خدمت کے لئے اُسے تیار کریں۔

گاندھی جی بچپن کی شادی کے بھی مخالف ہیں اس رسم کے عام ہونے کی وجہ سے لڑکیاں بہت جلد اسکول سے اُٹھا لی جاتی ہیں اور پھر شوہر اور گھر، بچّے اور خاندان کی ذمہ داریاں اُس کے ننھے سے دماغ پر حاوی ہوجاتی ہیں۔ وہ ذہن جو خود دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف ہو، وہ ننھی اور کمزور سی لڑکی جس نے اپنے گھر کی رسموں اور روایتوں میں جکڑی

ہوئی عورتوں کے سوا اور کچھ دیکھا نہ ہو، جب ایک نئے خاندان کی نیو رکھتی ہے تو اُسی پرانے ڈھانچے پر نئی نسل کی عمارت کھڑی کرتی ہے۔ لڑکیاں اسکول کی دنیا میں نئی نئی بچیوں اور نئی نئی ٹیچروں سے متعارف ہوتی ہیں مختلف مزاج اور مختلف عادتوں کے کرداروں سے میل جول پیدا کر سکتی ہیں اور پھر ان میں وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جو دوسرے کے ساتھ ذہنی اور مزاجی مطابقت پیدا کر سکتا ہے ورنہ ہم کبھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور غیر خاندان کے فرد کو اپنے خاندان میں سمو لینے کا فن نہیں سیکھ سکتے۔

گاندھی جی نے اپنی تحریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستانی مردوں اور عورتوں کو ذہنی اعتبار سے اونچا اُٹھانے کی سخت ضرورت ہے۔ واقعی اس حقیقت پر غور کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ہم شیشوں کے گھروں میں بند ہو کر رہنے کے عادی ہیں۔ باپ سے زیادہ ماں گھر کی ذمہ دار اور بچوں کے کردار پر اثر انداز ہونے والی ہستی ہے۔ ہر نئی نسل زندگی گذارنے کا فن جن لوگوں سے سیکھتی ہے اُن میں بنیادی حصّہ اس کی ماں کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ماں اپنی تمام کمزوریوں اپنے تعصبات اور اپنے روایتی اندازوں کے ساتھ بچوں پر چھا جاتی ہے اور بچے دوسروں کو بھی اُسی عینک سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں جس سے ان کی ماں دیکھتی ہے۔ چنانچہ ہر قسم کے Integeration سے زیادہ اہم اور فوری سوال تو خود اپنے عزیزوں اور دوستوں کے آپس میں مطابقت کا ہے —— اور اسی لئے گاندھی جی نے جس ذہنی تعلیم اور ذہنی کشادگی کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ بہت اہم نکتہ ہے۔

ہمارے ہندوستان میں ہر ذات و ملّت کے لوگوں میں کئی واقعات ایسے بھی نظر آتے ہیں کہ بیوی اپنے شوہر کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہے۔ نہ اُسے کھانے کو پیٹ بھر روٹی ملتی ہے اور نہ تن ڈھانکنے کو بھرپور کپڑے نہ گھر والا عزّت دیتا ہے نہ خاندان کے دیگر ارکان۔ ہر جگہ اُسے دھتکارا جاتا ہے۔ وہ اس طرح جیتی ہے کہ شوہر کی ذات سے اسے کوئی فیض نہیں پہنچتا۔ اگر کچھ ملتا ہے تو بچوں کی تعداد میں اضافہ! جن کی پرورش کا بوجھ اس کے کمزور کندھوں پر پڑتا ہے۔

ایسی ہی ایک عورت کا واقعہ اس کے بھائی نے گاندھی جی کے نام خط لکھ کر بیان کیا تھا اور ساتھ میں یہ بھی کہا تھا کہ ایک ہندو عورت شادی کے بعد اپنے شوہر کے رحم و کرم پر زندہ رہتی ہے اور اس کے پاس شوہر کی غلام بن کر رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ گاندھی جی نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ یہ دراصل مذہب کا قصور نہیں ہے۔ ہزاروں ہندو عورتیں نہایت خوشی اور مسرّت سے زندگی گذار رہی ہیں بلکہ یہ دراصل انسان کے اندر چھپی ہوئی بربرّیت کے اظہار کی ایک مثال ہے۔ گاندھی جی نے اس سلسلے میں ہندوستانی سوسائٹی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ ہندو تہذیب کی غلط روش نے ہمیشہ بیوی پر شوہر کی فوقیت پر زور دیا ہے اور بیوی کے لئے لازمی قرار دیا کہ اگر شوہر کی غلط کاریاں واضح ہوں تب بھی اس کی شخصیت میں اپنے آپ کو ڈھالنے اور سمونے کی کوشش کرے۔ اسی روایت کا غلط نتیجہ یہ نکلا کہ شوہر اپنے جارحانہ سلوک سے بیوی کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔ گاندھی جی کے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ ایسی عورتوں کو اس قسم کی ذہنی تربیت دی جائے کہ وہ اپنے شوہروں کے مظالم کو پبلک میں بے نقاب کر سکیں۔ ایسی کسی مظلوم عورت کے حادثے پر رونے اور آنسو بہانے سے بہتر یہ ہے کہ اس عورت کے بھائی بند اور رشتہ دار اسے اپنی حفاظت میں لے کر یہ سبق

دیں کہ ایسے غلط کار شوہر کے ساتھ رہنا اور اُس کے مظالم کا شکار ہونا اُس کا فرض نہیں ہے۔ قانونی امداد یا طلاق وغیرہ لینے سے بھی اس کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ عورت اپنے پیروں پر آپ کھڑی رہ کر زندگی گذارنے کا فن سیکھے اور اپنے آپ کو اپنی دوسری بہنوں کے لئے اپنی قوم اور اپنے دیس کے لئے وقف کر دے۔

گاندھی جی نے شری مہادیو دیسائی کی بہن کی شادی کے موقع پر جو تقریر کی تھی اُس میں اُنہوں نے شادی شدہ لوگوں کو کئی مشورے دیئے ہیں۔ اس قسم کے مشوروں کا ذکر اور بھی کئی مضامین میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ عین عالمِ جوانی میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ایک پاک اور اہم مشن کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ اسی وقت میں نے اپنے سچے دھرم کو پہچانا اور عہد کیا کہ اپنی بیوی کستوربا سے ازدواجی تعلقات قطع کر لوں۔ ان کا یقین ہے کہ اِسی کے بعد وہ اور کستوربا صبح سے رات گئے تک مختلف قسم کے ذہنی وجسمانی تھکن پیدا کرنے والے کام کرنے کے قابل ہوسکے۔

گاندھی جی نے برہمچاری بننے کے بعد مرد اور عورت دونوں کو جو مشورے دیئے ہیں اُن کی پابندی انسان کو زہد و تقا کے راستے پر ڈال دے لیکن ایک عام انسان کے لئے اپنے تمام فطری وانسانی تقاضوں کے ساتھ ان ہدایتوں پر پوری طرح عمل کرنا مشکل ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر تھوڑی سی نفس کشی کے ساتھ زندگی بسر کی جائے تو انسانی زندگی سے بہت سی مشکلات کا خاتمہ ہوجائے۔

نفس کشی کے ساتھ ساتھ گاندھی جی جس شئے پر زور دیتے ہیں وہ سچائی ہے۔ ان کے نزدیک سچائی اصل ہتھیار ہے جو آدمی کی حفاظت کا بہترین آلہ ہے۔ وہ سچائی ہی کو اپنی زندگی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سچائی کو پہچاننے کے بعد ہی مجھ میں برہمچاریہ اور اہنسائی جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کی یہ نصیحت قابل قدر ہے کہ جو بھی کام کرو اُس میں اپنے آپ سے اور دنیا سے سچائی برتو۔ اپنے خیالات کو چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ اگر اپنے خیالات کا اظہار باعث شرم ہے تو ایسے خیالات کا دل میں پیدا ہونا اور زیادہ شرم کی بات ہے۔

۱۹۳۰ء میں گاندھی جی چند رضاکاروں کو ساتھ لے کر ڈنڈی جاکر نمک کا قانون توڑنا چاہتے تھے۔ اِس تحریک میں حصہ لینے کے لئے کئی عورتوں نے گاندھی جی سے درخواست کی تھی، لیکن ان کے نزدیک ہندوستانی عورتوں کا اس قانون شکنی میں حصہ لینا مناسب نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس مجمع میں عورتوں کی اپنی طاقت کھو کر رہ جائیگی اور برطانوی سامراج کے خلاف صف آرا ہونے کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ اس موقع پر گاندھی جی نے جو اپیل کی تھی وہ کئی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ عورت کے مقدر میں اس نمک سازی کے قانون کو توڑنے سے زیادہ بڑے اور اہم کام انجام دینے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں جب کہ مردوں نے شراب اور بدیسی کپڑوں کی دکانوں پر مظاہرے کئے تھے تو وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس تحریک کے دوران لوگوں نے تشدد سے کام لیا تھا اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے عدم تشدد نہایت ضروری ہے اور عورتیں عدم تشدد سے کام لیتے ہوئے کامیابی کی منزل کو پہنچ سکتی ہیں۔

گاندھی جی کا کہنا تھا کہ منشیات اور بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ قانون کی حدود میں رہ کر کیا جائے۔ ان دونوں چیزوں سے ملک وقوم کو جو نقصانات پہنچتے ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔ جن عورتوں کے خاوند شرابی ہوں ان کی زندگی عذاب بن جاتی ہے، اسی لئے شراب بندی اور دوسری منشیات کے نقصانات کو عورتیں اچھی طرح جان سکتی ہیں۔ اسی طرح بے روزگاری کے عذاب سے بھی ہماری عورتیں واقف ہیں۔ اگر بدیسی کپڑوں کے مقابلہ میں

کھادی کو جگہ دی جائے۔ چرخہ کاتنے اور کپڑا بُننے کا رواج عام ہو جائے تو ہمارے چھوٹے چھوٹے کاریگروں کی زندگی سنور جائے۔ ہماری دیسی صنعتوں کو رواج دینے سے ہمارے ملک سے بے روزگاری بڑی حد تک دُور ہو سکتی ہے۔

ہندوستانی عورتوں کو ان دو کاموں پر توجہ دینے کی ہدایت کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا کہ اگر عورتیں ان میں مہارت حاصل کر لیں تو آزادی کی جنگ میں مردوں سے زیادہ مددگار ثابت ہوں گی۔ عورتوں میں وہ طاقت اور خود اعتمادی پیدا ہو گی جسے وہ آجکل بھول گئی ہیں۔ بدیسی کپڑوں کے تاجر اور خریدار، منشیات کے دکان دار اور گاہک عورتوں کی اپیل سے پگھل جائیں گے۔ اس مظاہرے کا اصل حسن اس طرح قائم رہے گا کہ یہ مظاہرہ مکمل طور پر عورتوں کے ذریعے انجام پائے گا۔ اس سلسلے میں مرد اگر ان کی مدد کرتے ہیں تو عورتوں کی ماتحتی کے اندر رہ کر۔ اس مظاہرے میں تعلیم یافتہ اور جاہل سبھی عورتیں حصّہ لے سکتی ہیں۔ عورتیں خود ایسی فضا پیدا کر سکتی ہیں کہ کھادی مقبول ہو اور ہندوستان کے گاؤں اور دیہاتوں کے اَنگنت گھروں میں کھادی بُننے کی عادت پیدا کی جا سکتی ہے۔

اسی بیان کے دوران گاندھی جی نے ایک بار پھر عورت کی عظمت اور خود اعتمادی کی تعریف کی ہے۔ ۔ ۔ ۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت کو مرد سے کمزور صنف سمجھنا ایک غلطی ہے اور مردوں کی نا انصافی کا ثبوت ہے۔ اگر طاقت سے مراد صرف حیوانی طاقت ہے تو پھر یقیناً عورت مرد سے کم طاقت ہے اور اگر طاقت سے مراد اخلاقی قوت ہے تو پھر عورت مرد سے کئی گُنا زیادہ اعلیٰ و برتر ہے۔ اس میں ایثار کا جذبہ بھی مرد سے زیادہ ہے۔ اس میں قوتِ برداشت بھی بہت ہوتی ہے۔ عورت کے بغیر مرد کا وجود ممکن نہیں اور اگر عدم تشدّد ہماری آزادی کی جنگ کا سب سے بڑا اصول ہے تو پھر مستقبل عورت کے ہاتھ ہے۔

گاندھی کے ان تمام خیالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کرنا مشکل نہیں کہ گاندھی جی عورت کی طاقت اور اُس کی خوبیوں سے واقعی واقف تھے۔ خود اپنی بیوی کستوربا کی ہمّت و جرأت اور ایثار پسندی و خاوند پرستی سے وہ بہت متاثر رہے ہیں اور ان کا یہ خیال غلط نہیں تھا کہ یہ جذبات کم و بیش ہر عورت میں پائے جاتے ہیں۔ بس ان جذبات کو اُبھارنے اور ان کی صحیح پرداخت کرنے کی ضرورت ہے!۔ ▲

---

## • بقیہ دو گاندھی •

۱۹۶۹ء کی تواریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہمارے یہاں گاندھی جی کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے اور بائیس برس بعد گاندھی جی کی شتابدی سے متعلقہ تقریبات کا افتتاح کرنے کے لئے زندہ گاندھی خان عبدالغفار خان تشریف لائے ہیں جو جنگ و فساد، بربریت و تشدّد اور علم و حکمت کے موجودہ ارتقائی دَور میں "مشعلِ ہدایت" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی مشعلِ ہدایت جس سے کفر و باطل کے اِس دَورِ ظلمات میں حق و صداقت، امن و عدمِ تشدّد کی تجلی و تنویر کی تمنّائیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

آئیے ہم سب آزادیٔ وطن کے استحکام، عوامی آسودہ حالی اور مضبوط بھائی چارے کی تبلیغ و اشاعت کے فرائض ادا کر کے اِس فرضِ مقدّس سے سبکدوش ہونے کا عہد کریں جس کے لئے ہم آزادی پسند قوموں کے مستقبل اور بھارت کی آئندہ نسلوں کے رُوبرو ذمہ دار ہیں۔ دو گاندھی اپنی عظمتوں اور قربانیوں کے لحاظ سے ہم سے یہی ارمغانِ خلوص چاہتے ہیں ـــــ امنِ عالم زندہ باد۔ ▲

اوم پرکاش منتری
ترجمہ: ل۔م۔ شاہد



# مہاتما گاندھی اور دِلّی

مہاتما گاندھی پہلی بار ۱۲ر اپریل ۱۹۱۵ء میں دلّی آئے۔ افریقہ سے سودیش لوٹنے کے بعد انہوں نے گوپال کرشن گوکھلے کے ہمراہ دیش کا دورہ کیا۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی سال ایسا گذرا ہو کہ دلّی نے انہیں اپنی طرف نہ کھینچا ہو۔
فروری ۱۹۱۸ء میں گاندھی جی نے دلّی میں لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات کی۔ انہوں نے یہ ملاقات جنوبی افریقہ کے تعلقات کے سلسلے میں کی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں وائسرائے سے ملے۔ کانفرنس میں حصّہ بھی لیا اور وائسرائے کے جلسے میں ہندی میں تقریر کی۔ اسی سال دسمبر میں ان کو کانگریس کانفرنس میں آنا پڑا۔
۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے خلاف بغاوت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وائسرائے نے گاندھی جی کو بات چیت کرنے کو دلّی بُلایا۔ بات چیت ناکام رہی اور گاندھی جی نے ستیہ گرہ کا اعلان کر دیا۔ ۲۸ر دسمبر کو انہیں ہنٹر جانچ کمیٹی کے سلسلے میں دلّی آنا پڑا۔ دسمبر میں سیوادل کی ریلی میں شامل ہوئے۔
۱۹۲۰ء جنوری۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ گاندھی جی تحریک خلافت کے سلسلے میں دلّی آئے اور اس تحریک کو جاری رکھنے کا قصد کیا۔ پہلی جنوری کو دلّی کانفرنس میں حصّہ لیا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں حکیم اجمل خاں کے طبیّہ کالج کا افتتاح کیا۔ گاندھی جی کے استقبال کو سارا شہر اُمڈ پڑا تھا۔ نومبر میں گاندھی جی کل ہند کانگریس کمیٹی کی کانفرنس میں حصّہ لینے آئے ۱۹۲۲ء کی ۲۴ر فروری کو پھر کانگریس کے جلسے میں شامل ہوئے۔
۱۷ر اگست ۱۹۲۴ء کو گاندھی جی کو "ہندو مسلم اتحاد" کے سلسلے میں دلّی آنا پڑا۔ ۱۷ر ستمبر سے ۲۱ دن کا برت شروع ہوا۔ دلی میں "انجمنِ اتحاد" کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۹۲۵ء میں وہ دوبار دلّی آئے اور ۱۹۲۶ء کے مارچ میں کانگریس کانفرنس میں شامل ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں ہری دوار سے دلّی آئے اور ۳۱ر اکتوبر کو وائسرائے کی دعوت پر راجدھانی کا دورہ کیا۔
۱۷ر فروری ۱۹۲۹ء کو پنڈت موتی لعل نہرو کی دعوت پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں حصّہ لینے دلّی پہنچے بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ پر بحث ہوئی۔ گاندھی جی کی تجویز قبول کر لی گئی۔ اُس زمانے میں وہ وِٹھل بھائی پٹیل کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان دنوں وِٹھل بھائی اسمبلی کے اسپیکر تھے۔
۲ر مارچ کو پھر دلّی آئے۔ ۵ر جولائی کو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں حصّہ لیا۔ صحت کی خرابی کی بنا پر جلسے میں تقریر نہیں کر سکے

پہلی نومبر کو دلی پہنچے اور سُریندر دیر سنگھ کے ہاں قیام کیا۔ ۲ر نومبر کو جامعہ ملیہ گئے۔ وہاں ان کو ۵ سو رُوپے کی تھیلی پیش کی گئی۔ گاندھی جی نے جامعہ ملیہ میں تقریر بھی کی تھی۔

"آپ جانتے ہیں مجھے دلی آنا پسند نہیں، حالانکہ ڈاکٹر انصاری میرے بہترین دوست یہاں رہتے ہیں۔ مجھے آپ لوگوں سے ملنا اچھا لگتا ہے کیونکہ آپ سے بڑی اُمیدیں لگائے بیٹھا ہوں۔ کچھ ہندو اور مسلمان بھلے ہی پاگل بن جائیں مگر آپ لوگ کبھی پاگل نہیں بنیں گے۔ یہی سوچ کے میں زندہ ہوں۔"

اس کے بعد گاندھی جی اندر پرست گروکل گئے، جو دلی سے ۱۴ میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ وہاں ان کو ۷۵۰ رُوپے کی تھیلی دی گئی اور پوچھا گیا۔

"سوامی شردھانند جی کے خون کا پرائشچیت آپ کیسے کریں گے؟"

"اس خون کا سچا پرائشچیت ہندو مسلم اتحاد ہے۔" گاندھی جی نے جواب دیا تھا۔ اُسی دن ان کو سپاس نامہ پیش کیا گیا، حالانکہ سرکاری حکام اِس کی مخالفت کر رہے تھے۔ اِسی جلسے میں دس انگریز اور اُن کی بیویاں بھی شریک تھیں۔ سپاس نامے میں لکھا تھا،

"یہ پہلا موقع ہے کہ ایک ایسے شخص کو سپاس نامہ پیش کیا جا رہا ہے جو نہ کسی شاہی خاندان کا نمائندہ ہے اور نہ بادشاہ۔ امن کا پجاری ہونے کے ناطے آپ سب سے بلند و برتر ہے۔"

جنوری ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی لاہور گئے، پھر دلی چلے آئے۔ ۲۱ر فروری کو کانگریس کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں حصہ لیا۔ اس بار گاندھی جی ایک مشن پر دلی آئے تھے۔ بھگت سنگھ اور راج گرو کو پھانسی کی سزا ہو گئی تھی۔ اس سزا کو منسوخ کرانے کے لئے وہ وائسرائے سے ملنے آئے تھے۔ کئی بار وائسرائے سے ملے مگر سزا رد نہیں کروا سکے۔ ۴ر اپریل کو وہ مسلم کانفرنس میں حصہ لینے دلی آئے۔ ۷ر اپریل کو خان عبدالغفار خان بھی دلی آئے۔ یہ دو گاندھیوں کا دلی میں پہلی بار ملن تھا۔

۱۹۳۳ء میں دس دسمبر کو دلی آئے اور برلا ہاؤس میں قیام کیا۔ ہریجن بستیوں کا دورہ کیا۔ ہریجن سیوا سنگھ کی سبھا میں حصہ لیا۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۴ء میں جب وہ دلی آئے تو ہریجن نواس میں ٹھہرے۔ اُن کے ہمراہ ڈاکٹر خان صاحب اور اُن کی بھتیجی بھی تھیں۔ ۱۹۳۷ء میں کل ہند کانگریس کمیٹی کے جلسے میں حصہ لیا۔ ۴ر اگست کو وائسرائے سے ملے۔ ۱۹۳۹ء میں اُن کو وائسرائے سے ملنے دوبارہ آنا پڑا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں کانگریس مجلس عاملہ کی میٹنگ میں حصہ لیا۔ ۷ر مارچ ۱۹۴۲ء کو مہاتما گاندھی کرپس سے ملنے دلی پہنچے۔ اگست میں "بھارت چھوڑ دو" قرارداد کے بعد گاندھی جی نظر بند کر لئے گئے۔ ۱۹۴۵ء میں وہ شملہ کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔

۱۹۴۶ء میں گاندھی جی نے دلی میں ہریجن بستیوں میں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ نئی دلی کی بھنگی بستی میں رہے۔ اور ۳۱ر مارچ ۱۹۴۷ء کو جب وہ ایشیائی کانفرنس میں حصہ لینے دلی آئے تو بھی وہ بھنگی بستی ہی میں ٹھہرے تھے لیکن بعد میں اپنے دورے کے موقع پر برلا ہاؤس میں قیام کیا۔

پاکستان بننے کے بعد جب دلی میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو گاندھی جی نے ۱۳ر جنوری ۱۹۴۸ء کو برلا ہاؤس میں برت شروع کیا۔ ۱۸ر جنوری کو برت ٹوٹا۔ ۲۰ر جنوری کو پرارتھنا سبھا کے وقت اُن پر بم پھینکا گیا، پھر ۳۰ر جنوری کو اُنکی ہتیا کر دی گئی

مس زہرہ گڈالکر



# گاندھی جی ایک شخصیت ایک مطالعہ

صبح کی سپیدی، چاند کی چاندنی، شفق کی گلگوں بہاریں، پھولوں کا حسن، کلیوں شگفتگی اور برفانی پہاڑوں کی خوبصورتی کسی فرد، قوم اور ملک کی جائداد نہیں۔ شیکسپیر، گوئٹے، غالب، حافظ، رومی، اقبال، گاندھی اور کینیڈی بھی کسی ملک اور قوم کی میراث نہیں۔ یہ افراد ساری انسانیت کی پونجی ہیں اور انسانوں کے دل اُن کے ابدی مسکن ہیں۔

مہاتما گاندھی نے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ اُن کی ساری زندگی اُن کے پیغام کی علمبردار ہے۔ اس حقیقت سے انکار کی گنجائش بھی نہیں۔ حیات و کائنات کے اَن گنت پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے اُن کی زندگی ایک مطالعہ ہے اس مطالعے کے دوران وہ کبھی ایک سیدھے سادے ہندوستانی کی طرح ذہن کے پردے پر اُبھرتے ہیں۔ کبھی ایک عظیم مفکر کی طرح فکر کی بلند وادیوں میں پرواز کرتے نظر آتے ہیں اور کبھی ہندوستانی سیاست اور سماج کے وہ رہنما اور رہبر بن کر اُبھرتے ہیں جس نے اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی رجحانات پر مسلسل ضربیں لگائیں، رسوم و روایات کے اُن شکنجوں کو پاش پاش کرنے کی کوشش کی جو فرسودہ ہو چکے تھے اور جن کی گرفت سے چھٹکارا پائے بغیر ایک ترقی یافتہ قوم اور سماج کا تصور ناممکن تھا۔ اُن کا ذہن ترقی پسند اور اُن کی نگاہ وسیع تھی۔ ترقی پسندی اور وسیع النظری نے انہیں ہستی کی اُس معراج پر پہنچا دیا جہاں پہنچ کر انسان صرف ایک معمولی آدمی نہیں رہتا، بلکہ "مہاتما" بن جاتا ہے۔

گاندھی جی کا یقین تھا کہ انسان کا مستقبل نہایت تابناک ہے۔ اسی لئے ہر دور اور زمانے میں وہ آگے بڑھتا رہا ہے۔ اور رہے گا۔ ساتھ ہی ان کی نظریں ان کمزوریوں اور خامیوں سے بھی آشنا تھیں جو مکمل طور پر انسانی ہیں مگر ان سے دل برداشتہ ہو کر وہ انسانی زندگی سے مایوس نہیں ہوتے۔ ان کی شخصیت کا یہی وہ پہلو ہے جو ہمیں زیادہ متاثر کرتا ہے۔ انہوں نے کبھی صوفیوں، رشیوں اور سادھوؤں کی طرح زندگی سے فرار کی ترغیب نہیں دی۔ نہ ہی اُسے دھوکا اور فریب کہا۔ وہ اسے ایک حقیقت گردانتے تھے ایک ایسی حقیقت جو شیرینی و تلخی کا حسین امتزاج ہے۔ یہ شیرینی اور تلخی نیکی اور بدی کی ہے جن سے ہمارا ذہن ہمیشہ نبرد آزما رہتا ہے۔ اس معرکہ میں انسانیت کی کامیابی یقینی ہے مگر اچھی کوشش شرط ہے۔ اُن کے خیال میں انسان کی سب سے بڑی خوبی اس کا انسان ہونا ہے اسی لئے انہوں نے اپنے اور عوام کے درمیان بڑائی کی دیوار حائل نہیں کی بلکہ نڈر ہو کر اقرار کیا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ معجزہ نہیں ایک عام شخص بھی ایسا کر سکتا ہے ایسا بن سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنے میں خود اعتمادی پیدا کرے۔ انکی لاتعداد

تقریروں اور تحریروں میں، اُن کی زندگی کے نجی اور ذاتی پہلوؤں میں ترقی پسندی کے اُس پرتو کی جھلکیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں جس نے انہیں راہی سے راہبر بنا دیا تھا۔ جنوبی افریقہ کے نسلی امتیازات نے انسانیت کے اُس چشمے کی تخلیق کی جس کی ٹھنڈک اور تروتازگی نے کُل کائنات کو انفرادیت سے اجتماعیت، جھوٹ سے سچائی، نفرت سے محبت اور خود غرضی سے قربانی کی طرف رجوع کروا دیا۔ اِسی لئے رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا:

"He stopped at the thresholds of the thousands of the dispossessed, dressed like one of their own. He spoke to them in their own language: here was living truth at last, and not quotations from books..... In direct contact with truth, the crushed forces of the soul rise again; when love came to the door of India that door was opened wide .... At Gandhi's call India blossomed forth to new greatness, just as once before in earlier times, when Buddha proclaimed the truth of fellow-feeling und compassion amoung all living creatures."

گاندھی جی کو صرف ایک عظیم لیڈر کہنا اُن کی شخصیت کی توہین ہے وہ لیڈر سے زیادہ ایک اچھے انسان تھے عظمت اور اچھائی دونوں کا ایک ہی انسان میں یکجا ہونا شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ انہوں نے عوامی مقبولیت کا تاج پہنا۔ عوام میں رہ کر عوام کا بن کر، عوام کے دُکھ درد کو سمجھ کر۔ اُن کے پاس نہ دولت تھی اور نہ طاقت تھی جس کے سہارے وہ شہرت کی بلندیوں تک پہنچ سکیں لیکن ان کے پاس ان دونوں چیزوں سے بڑھ کر ایک انمول اور بیش بہا شے تھی اور وہ ان کی شخصیت تھی۔ ایک ایسی شخصیت جو گفتار و کردار کی ہم آہنگی کی بے نظیر مثال تھی۔ اُن کی انفرادیت یہ تھی کہ انہیں انسانی، رُوحانی اور مذہبی طاقتوں پر مکمل بھروسہ تھا اور اس سے زیادہ ان کی انفرادیت یہ تھی کہ ان طاقتوں کو روزمرہ زندگی میں استعمال کیا۔ انہیں کے بل بوتے پر سماجی مسائل سے نبرد آزمائی کی اور انہیں کو ساتھ لے کر سیاست سے ٹکرا گئے۔ اِسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر فریچس نیلسن نے گاندھی جی کے متعلق کہا تھا:

"A Diogenes in action, a St. Francis in humility, a Socrates in wisdom."

انہوں نے سچائی کے اُسی فلسفے کو اپنایا جس نے حضرت عیسیٰؑ کو سُولی پر چڑھا دیا تھا اور جس کے بدلے میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا۔ سچائی، عدم تشدد اور اہنسا جیسے ہتھیارات سے دنیا کو رُوشناس کر کے گاندھی جی نے تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ سچائی کے جس فلسفے کی اشاعت اور تبلیغ انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں اور زندگی میں کی، وہ کوئی نیا نہیں۔ خود انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا: "یہ پہاڑوں کی طرح پُرانا ہے"۔ لیکن اس فلسفے کو جس رُوپ میں انہوں نے ہمارے سامنے پیش کیا، وہ انوکھا ہے۔ انہوں نے سچائی اور مذہب دونوں کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا۔ سچائی کو مذہب سے الگ اور مذہب کو سچائی سے الگ تصور کرنا بھی اُن کے نزدیک گناہ تھا۔ یہیں ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک مذہب محدود نہیں تھا۔ صرف تفرقہ کا نام نہیں تھا۔ اُن کا مذہب آکاش کی طرح وسیع اور سمندر کی مانند

گہرا تھا۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ خدا کے ہزاروں نام ہیں۔ ایک اُسے رام کے لقب سے جانتا ہے، دوسرا اُسے کرشن پکارتا ہے اور تیسرے کے لئے وہ رحیم ہے۔ جس طرح آدمی اپنی پسندیدہ چیزیں کھاتا ہے اُسی طرح اپنے پسندیدہ ناموں سے خدا کو پکارتا ہے۔ گاندھی جی کی زندگی میں مذہب اہم مقام رکھتا ہے بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہی اُن کی جدوجہد کا محرک بھی تھا۔ دنیا کے تمام مذاہب نے ہمیشہ سچائی کا پرچار کیا ہے۔ اخوت، محبت اور انسان دوستی کے جذبات اُبھارے ہیں۔ گاندھی جی مذہب کے اسی پہلو کے شیدائی تھے اسی لئے ہریجنوں کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

: My Hinduism is not sectarian. It includes all that I know to be best in Islam Christianity, Buddhism and Zoroastrianism.... Truth is my religion and ahimsa is the only way of its realisation.

اسی طرح ایک جلسے میں نڈر ہو کر انہوں نے اعلان کیا تھا:

"If Mohomed came to India to day, he would disown many of his so-called followers and own me as a true Muslim as Jesus would own me as a true Christian."

آج جب کہ ہندوستان مذہبی تعصب کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، نفرت و عداوت کے شعلے گوشے گوشے سے اُٹھ کر اس کی انفرادیت کو خاکستر کرنے پر تلے ہوئے ہیں، سیاست کی پشت پناہی اقلیت اور اکثریت کے مابین اختلافات کی خلیج گہری کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ وطنیت کا سہارا لے کر لوگوں کو رسوا کیا جا رہا ہے، اس کی شدید ضرورت ہے کہ گاندھی جی کے خیالات اور تصورات کی روشنی گھر گھر پہنچے اور سیاسی لیڈروں کے دل و دماغ پر گرد جمی ہے اس گرد کو صاف کر دے جس نے انہیں مذہب کو ان مندروں، مسجدوں اور گرجاؤں کے اندر محدود کرنے پر مجبور کیا ہے جہاں سورج کی روشنی اور تازہ ہوا کا گذر نام کو نہیں۔ آج ہندوستان کو پھر گاندھی کی ضرورت ہے جو بانگِ دہل کہہ سکے:

"Religion is not test of nationality, but a personal matter between man and his God. In the sense of nationality they are Indians first and Indians last, no matter what religion they protess."

سیاست داں مذہب کی اہمیت سے ہمیشہ انکار کرتے رہے ہیں۔ خود خروشچیف نے ایک دفعہ کہا تھا: "ان خلاؤں میں دُور دُور تک کوئی خدا نظر نہیں آتا"۔ لیکن گاندھی جی دنیا کے سیاست دانوں میں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انہوں نے سیاست کو مذہب سے علٰحدہ نہیں کیا۔ وہ سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم سمجھتے تھے اسی لئے ان کے خیال میں وہ ریاست کبھی مکمل نہیں کہلائی جا سکتی تھی جو مذہبی اصولوں پر قائم نہ ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے ان کی مراد وہ مذہبی حکومت ہے جس کو ہندوستان میں قائم کرنے کے لئے ہمارے بھارتیہ جن سنگھ کے لیڈران کوشاں ہیں، یا وہ حکومت ہے کیمونسٹ جس کے خواہاں ہیں؟ نہیں، بالکل نہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی یہ واضح کر دیا ہے کہ مذہب سے ان کی مراد نہ ہندو مذہب سے تھی نہ اسلام سے اور

تو ہی عیسائی مذہب ہے۔ مذہب اُن کے نزدیک عبارت تھا مساوات اور سچائی سے۔ اُنہوں نے ہر مرتبہ اعلان کیا کہ سچائی Truth ہی اُن کا مذہب ہے۔ اس پہلو کو سمجھنے کے بعد ہمارے لئے یہ بات بالکل آسان ہو جاتی ہے کہ مذہبی حکومت سے ان کی مراد ایک ایسی حکومت سے تھی جس کے بنیادی اصول مساوات اور سچائی ہوں۔ جہاں یہ دونوں موجود ہوں وہاں تشدد کا گذر بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ انہیں تین اصولوں پر سیاست کی عظیم عمارت کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی تشدد نے سر اُبھارا ہے آمریت کی نشوونما ہوئی اور جب بھی عدم تشدد کی مشعلیں روشن ہوئیں، زمانہ جمہوریت کی راہوں پر گامزن ہوا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اگر ہندوستان میں کوئی حکومت کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ صرف اُن اُصولوں کے بل پر ہو سکتی ہے جو گاندھی جی نے آج سے کئی سال پہلے ہمارے سامنے پیش کئے تھے۔

گاندھی جی کی عظمت، اُن کی مقبولیت کا راز ان کی سچائی، انسان دوستی اور انسانیت نوازی میں پنہاں ہے۔ گاندھی جی نے جس سماج میں آنکھیں کھولیں وہ بہت بیمار تھا۔ ایک طرف غلامی نے ذہانت و قابلیت پر زنگ چڑھا دیا تھا تو دوسری طرف چھوت اچھوت جیسی بیماریوں نے سماج کی رہی سہی طاقت کو کھرچ کھرچ کر کھوکھلا بنا دیا تھا۔ گاندھی جی نے سماج کی اسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ بیماریاں ہماری اپنی غفلت اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہیں اور اگر اب بھی اس کا احساس نہیں ہوا، اس کا درماں نہیں کیا گیا تو ہندوستان کی نئی نسلیں بزرگوں کو کوستی رہ جائیں گی۔ اگرچہ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ دنیا کے تمام انسان برابر ہیں اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ خدا اپنی ہی مخلوق کو درجات میں بانٹ دے لیکن اس حقیقت کو مان کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کیونکہ ہندوستانی اپنے مذہب پر اندھا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے کبھی آنکھیں کھول کر مذہب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور جب بھی کسی نے سمجھانے کی کوشش کی انہوں نے کان بند کر لئے۔ جب گاندھی جی جیسے مہاتما نے ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی تو ان کی شدت سے مخالفت کی گئی۔ اُن پر فقرے کسے گئے مگر وہ بھی دُھن کے پکے تھے۔ آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ ان کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ یہ دنیا کی ریت ہے اور رہے گی۔ جب بھی حضرت عیسیٰ نے سچ کی آواز بلند کی، اُنہیں سُولی پر چڑھا دیا گیا جب بھی گلیلیو نے حقیقت آشکارا کی، اُسے زنداں میں بند کر دیا گیا۔ جب بھی کسی سقراط نے سچ کا دامن تھاما، اُسے زہر کا پیالہ نصیب ہوا مگر سچ کی نشوونما نہ رُکی ہے اور نہ رُکے گی۔ اسے ہر زمانے اور ہر دَور میں عظیم افراد نے اپنے خون سے سینچا ہے اور سینچتے رہیں گے۔ اسی لئے گاندھی جی شہید کر دئے گئے مگر ان کے قدموں کے نشانات اُس وقت تک ہزاروں بھُولے بھٹکے لوگوں کو راہ بتاتے رہیں گے۔ جب تک دنیا میں ایک بھی نیک آدمی موجود ہوگا۔

ایک فرد کی شخصیت کے بے شمار پہلو ہوں اور ہر پہلو اپنی جگہ پر مکمل اور جامد ہو تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اُن میں سے کونسا زیادہ متاثر کُن ہے۔ ایک ایسی ہی شخصیت گاندھی جی کی تھی۔ وہ بیک وقت ایک سادھو، سیاست داں، لیڈر اور سماجی مصلح رہیں۔ وہ تاریخ کے پہلے لیڈر ہیں جنہوں نے مذہب اور اخلاق کو سیاست کا جزو لاینفک بنایا اور ستیہ گرہ و عدم تشدد جیسی اخلاقی پالیسیوں سے روشناس کروایا۔ زمانے کے تجربات نے یہ امر ثابت کر دیا کہ ان دو طاقتوں کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت نے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ گاندھی جی سیاست کو ایک اخلاقی موڑ دے گئے۔ دوسری طرف انہوں نے مذاہب میں سیاست کو جگہ دے کر اس فرقہ بندی اور تعصب کے خلاف آواز بلند کی جو ہندوستانی سماج کو آہستہ آہستہ کھُرچ رہی تھی۔ سماجی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مگر اہم مسائل بھی ان کی عقابی نظروں سے پوشیدہ نہ رہے۔ ایک طرف انہوں نے بنیادی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا تو دوسری طرف ہندوستانی عورت کو اس کا مقام دلانے کی انتھک کوشش

تی۔ انہوں نے عورت کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ عورت نہ صرف خاندان بلکہ ایک ملک ایک قوم، بلکہ ایک نسل کی معمار ہوتی ہے۔ انہوں نے احساس دلایا کہ عورت مرد کی غلام نہیں بلکہ اس کی بہترین دوست، ہمدرد اور ساتھی ہے۔ عورت میں انسانی خدمت کا جذبہ مرد سے کہیں زیادہ ہے۔ ایسا رہبر ملنے پر عورت نے بھی بے کسی اور بے بسی کا وہ چولا نکال پھینکا جس نے اس کی انفرادیت کو ختم کر دیا تھا اور اپنے آنچل کو پرچم بنا کر زمانے سے قدم ملا کر آگے بڑھنے لگی۔

گاندھی جی کی زندگی ہمیشہ سادہ، نڈر اور اصولی رہی۔ وہ جہاں بھی رہے، سادگی پر جان دیتے رہے۔ کرم چند گاندھی تھے تو بھی وہ سادگی پسند تھے اور جب مہاتما گاندھی بن کر شہرت کے بام عروج پر پہنچے تو بھی سادگی پسند رہے۔ نام، نمود اور شہرت کو حاصل کرنے کے لئے ہمارے لیڈران جس جنون کے شکار رہتے ہیں، اس سے وہ کوسوں دور تھے۔ ان کی روح ہر وقت بے نقاب رہی۔ ان کی زندگی ہمیشہ قوم کے افراد کے لیے آئینہ بنی رہی۔ ہندوستانیوں نے ان کو اپنے اتنے قریب محسوس کیا کہ گاندھی جی کی زندگی کے کسی گوشے سے انہیں اجنبیت کی بو نہ آسکی۔ گاندھی جی نے کبھی عظمت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی لوگوں کو آواز دی کہ ان کے نقش قدم پر چلیں۔ انہوں نے کیا تو صرف یہی کیا کہ اسی راہ پر چل پڑے جسے ان کے دل و دماغ نے صحیح تصور کیا۔ اگر دوسروں نے اسی راستے پر چلنے کی کوشش کی تو خوش ہوئے اور اگر نہیں پسند کیا تو بھی غم و غصہ کو پاس پھٹکنے نہ دیا۔ سچائی، لگن، بے لوث خدمت اور انسان دوستی ان کی شخصیت کے ایسے جواہر پارے ہیں جس پر ایک کائنات قربان کی جا سکتی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی زندگی میں رچ گئے، وہ لہو بن کر ان کی رگوں میں جاری و ساری ہو گئے۔ اسی لئے ایک عرصے تک ہندوستان کو "گاندھی جی کا دیس" کہا جاتا رہا تو کوئی حیرت انگیز امر نہیں۔

جنوبی افریقہ میں ہم قوم افراد کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ ہندو مذہب سے چھوت چھات کی وبا دور کرتے ہوئے دیہات سدھار اور بنیادی تعلیم کی اشاعت کرتے ہوئے اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاتے ہوئے وہ نہ صرف ایک لیڈر بلکہ بھارت کے "باپو" نظر آتے ہیں۔ ایسے انسان کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں اور جب پیدا ہوتے ہیں، دنیا کے لئے ایک نعمت ہوتے ہیں۔ ان کی موت پر جواہر لال نہرو نے غلط کہا تھا کہ روشنی بجھ گئی۔ میں کہتی ہوں روشنی بڑھ گئی، مر کر امر ہو گئی، زندۂ جاوید ہو گئی۔ آج سو سال بعد ہمیں یہ احساس تو ہوا کہ گاندھی جی ہماری تہذیب کا ایسا ورثہ ہیں جن پر آنے والی ہر نسل فخر کرے گی۔ جب وہ زندہ تھے، ہم نے ان کو شہید کر دیا اور جب شہید ہو گئے، ہم ان کو رونے بیٹھ گئے۔ ان کے کھونے کا غم کرنے لگے۔ پر یہ الزام کیوں؟ ہم ہندوستانی تو ہمیشہ سے مردہ پرست رہے ہیں۔

---

مناظر عاشق ہرگانوی



# گاندھی جی کا نظریۂ ایشور پرستی

ایک گریجویٹ ہریجن نوجوان گاندھی جی سے ملنے سیواگرام گاؤں پہنچا۔ اسے Village Reform کے سلسلے میں ان سے کچھ مدد لینی تھی۔ اس نے گاندھی جی سے کہا: "باپو، میں صرف انسانیت پر اعتقاد رکھتا ہوں، ایشور (God) پر مجھے قطعی یقین نہیں ہے۔"

گاندھی جی بولے۔ "ٹھیک ہے انسانیت کو سمجھنا لازمی ہے لیکن وہ "ایشور" کا مقام نہیں لے سکتا۔ اس کے پیچھے حقیقت میں ایشور ضرور ہے مگر ایشور سے متعلق یہ عقیدہ ہماری کند ذہنی یا ذہنی پژمردگی اور مادی صورت حال کی وجہ سے بے حد محدود اور تنگ بنا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری غیر اطمینانی غالباً ایشور سے متعلق جو رائج تصور واعتقاد ہے اُسی سے ہے۔ اس کی ایک عام سی وجہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ ایشور کی بندگی کا دم بھرتے ہیں، اُن کی روزانہ زندگی ہی میں اکثر ایشور کوسوں دُور رہتا ہے ــــ تم خود کو ہی لو۔ اگر تم اپنی صلاحیت، قابلیت، حوصلہ اور اُمنگ کے علاوہ اپنی زندگی میں کوئی نئی طاقت اور ایشور سے متعلق جیتا جاگتا عقیدہ پیدا کر سکو تو تمہاری دلی آرزو پوری ہو کر رہے گی۔ تب تمہاری یہ ساری بے تعلقی اور بے شعوری ختم ہو جائے گی، اس لئے جب تک تم ایشور میں ایسا یقین پیدا نہ کرلو، جو تمہارے باطن کو مطمئن کر سکے اور تم میں رکاوٹوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکے، تب تک تمہارے لئے چاروں طرف نا اُمیدی کا ہی نا اُمیدی ہے ــــ میرا ذاتی مشورہ تو یہ ہے کہ جب تک تم ایشور سے ملاقات نہ کرلو، یہاں آشرم ہی میں رہو۔ یہاں کے کچھ اپنے اصول اور نصب العین ہیں۔ ان سب اصولوں کے وسیلے سے یہاں اجتماعی طاقت یعنی شعور کی تعمیر ہوتی ہے ــ ممکن ہے تمہاری بھی ایشور سے ملاقات ہو جائے اور تم اِسی طرح اعتماد کے ساتھ کہہ سکو کہ "ایشور یہ ہے۔" جیسے کہ تم یہ کہہ رہے ہو کہ ستیہ (Truth) یہ ہے۔"

گاندھی جی کی باتوں کو نوجوان بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ اُس نے تجسس کا اظہار کیا: "تب تو باپو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ستیہ بھی ایک طرح سے جھوٹ ہی کا دوسرا رُخ ہے۔"

"ہاں، یہ کہا جا سکتا ہے۔ قدیم رشیوں نے بھی ایشور کو "نیتی نیتی" کہہ کر بیان کیا ہے۔ ایسی حالت میں صرف ایک ستیہ ہی اِس اُلجھن کو مٹا سکتی ہے اور کُل ملا کر جو کچھ بھی واقعی صحیح ہے وہی ستیہ ہے۔ تمہارا ذہن تجزیہ کر سکتا ہے یہ اچھی بات ہے۔ لیکن بھائی یہاں کئی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی کوئی توضیح کی ہی نہیں جا سکتی۔ میری عقل کے ذریعے

ایشور کا جو تجزیہ ہوگا اس سے مجھے خود ہی طمانیت نہیں مل پائے گی۔ تب میں اس کی تشریح کرنے کی جسارت کیسے کروں؟ ایسی حالت میں تو میں بھگوت بھکتوں کی تقلید کر کے اپنا سکون بنائے رکھتا ہوں۔"

نوجوان نے بات کو پھر آگے بڑھایا۔ "لیکن باپو آپ کی زندگی کا نصب العین مجھے بہت متاثر کرتا ہے کیونکہ اس میں شخصی آزادی کے لئے بھی گنجائش ہے، مگر ایشور کا تصور تو میری نظر میں سنگدلی ہی کو جنم دیتا ہے اور وہ سنگدلی انسان کو جکڑتی ہے۔ اور آزاد وجود میں مانع ثابت ہوتی ہے۔"

نوجوان کی دلیل سن کر گاندھی جی مسکرائے، پھر بولے۔ "اچھا، کیا یہاں آزاد وجود نام کی بھی چیز ہے؟ ذرا بتاؤ تو یہ کیا ہے؟ ہم سب لوگ اُس ایشور کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں۔"

"تو پھر ایشور اور انسان، ستیہ اور ایشور میں کیا تعلق ہے؟"

"میں نے ابھی کہا نا، ستیہ ہی ایشور ہے اور ایشور اور اس کا آئین کوئی الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اِسے سمجھنے کے لئے انسان کو یکسوئی، غور و فکر یا پرارتھنا کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے آپ کو ایشور میں غرق کر دینا پڑتا ہے۔ اِس طرح ہر شخص اپنے اپنے ڈھنگ سے اس کی تشریح کرتا ہے۔ جہاں تک انسان اور ایشور کے درمیانی تعلق کی بات ہے، میری رائے میں انسان صرف اِس لئے انسان نہیں ہے کہ اس کے دو ہاتھ اور دو پیر ہیں۔ چونکہ اس میں خود ایشور موجود رہتا ہے اِس لئے وہ انسان ہے۔"

"لیکن باپو، ابھی جب ایشور کے بارے ہی میں میرا ذہن صاف نہیں ہوا ہے تو انسان کو ایشور کی سکونت مشتہر کرنے والی بات میرے پلے کہاں پڑے گی؟ اس سے تو غلط فہمی ہی بڑھے گی۔"

"بھائی، جب تک ہمیں یہ احساس نہ ہو کہ ہمارا یہ جسم ایشور کی رہائش ہے تب تک ہم انسان کے درجے میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ستیہ ہی کو ایشور سمجھنے یا سوچنے میں کوئی پریشانی یا دشواری کیا ہے؟ تم خود بھی تسلیم کرو گے کہ انسان جھوٹ کا خزانہ (پلندہ؟) نہیں ہے۔"

ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد گاندھی جی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "جو شخص پاک زندگی گذارنا چاہتا ہے اسے مشکلات کا اور کبھی کبھی سخت سے سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اُس وقت ایشور کی پرارتھنا اور اس پر اعتقاد کا جذبہ ہی تمہیں صبر و استغنا عطا کر سکے گا، وہی تمہاری ہمت بڑھا سکے گا۔"

نوجوان نے دوبارہ سوال کیا۔ "کیا آپ اُس ایشور کو جانتے ہیں جس کی پرارتھنا کرتے ہیں؟"

"نہیں بھائی، میں نہیں جانتا۔"

"تو پھر کس کی پرارتھنا کی جائے؟"

"اُس ایشور کی، جو ہمارے لئے معدوم اور غیر محسوس ہے۔ کبھی کبھی اُس کی تلاش میں لوگوں کو جوکھم اُٹھانی پڑتی ہے لیکن اِس سے کیا ہوتا ہے؟ میرا تو کہنا یہ ہے کہ چاہے تمہارا ایشور پر عقیدہ نہ ہو، پھر بھی تمہیں پرارتھنا کرنی چاہیئے یعنی اُس کی تلاش میں لگے رہنا چاہیئے۔ اس کے لئے تمہیں بڑے صبر اور بے حد احترام و اعتقاد کی ضرورت ہے۔ یہ از خود اِس طرح کے سوالوں کا ازالہ کر دے گا۔ بائیبل کا مقولہ ہے کہ "اعتقاد رکھو... اور بس... تم خود الوہیت حاصل کر لو گے۔"

نوجوان نے پوچھا۔ "لیکن باپو جب میں اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہوں تو دل ہی دل میں خیال آتا ہے کہ کیا سچ مچ کوئی

(باقی صفحہ ۱۴۰ پر دیکھیے)

وارثی بریلوی



# ڈانڈی تحریک اور مہاتما گاندھی

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو — ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
(میر تقی میر)

گاندھی صدی کے سلسلے میں متعدد رسائل گاندھی نمبر شائع کر رہے ہیں۔ صدہا مضامین مہاتما گاندھی کی شخصیت اور کردار پر لکھے جائیں گے۔ ذیل میں میں بھی مہاتما گاندھی کی ڈانڈی تحریک پر اے۔ فینر براکوے A. Fenner Brockway کی چند سطور کی مدد سے مختصر مقالہ پیش کر کے مہاتما جی کی نمک قانون شکنی پر تھوڑی بہت روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

جب مردِ آہن مہاتما گاندھی کو یہ معلوم ہوا کہ برٹش گورنمنٹ نے "ڈانڈی" (بمبئی اسٹیٹ) میں نمک کے ذخیروں کا مالک و مختار پولس کو بنا دیا ہے۔ ایک طرف نمک کی قلت کی وجہ سے ہندوستانی عوام بری طرح پریشان ہیں اور دوسری طرف ایک ماہ سے پولس والے نمک کے ذخیروں سے من مانے طریقے پر ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، تو مہاتما گاندھی نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ ہم نمک پر عائد کی گئی پابندیوں کو سمندری پانی سے نمک بنا کر سول نافرمانی civil Disobedience کی شکل میں توڑ دیں گے۔ "ڈانڈی" ایک چھوٹا سا گاؤں سمندر کے کنارے واقع تھا۔ نمک کے ذخیرے اسی چھوٹے سے گاؤں میں پولس کے قبضے میں برٹش گورنمنٹ نے رکھ چھوڑے تھے۔ مہاتما جی کی اس تحریک پر عوام نے لبیک کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں اہلِ دل ڈانڈی میں جمع ہو گئے، جن کو پولس سوائے پانی کے چند قطروں کے کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں دے رہی تھی۔ لیکن پھر بھی ہزاروں دیہاتی قریبی گاؤں سے ڈانڈی میں یہ دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے کہ ہمارا آہنی سربراہِ ملک و ملت مہاتما گاندھی کس طرح نمک پر عائد کی گئی پابندیوں کو سول نافرمانی کے ذریعے ختم کرے گا —— مارچ ۱۹۳۰ء کی ایک صبح کو مہاتما گاندھی اپنے اسّی بچاسی وفادار و جاں نثار ستیہ گرہی ساتھیوں کے ہمراہ احمد آباد سے ڈانڈی تک تین سو میل کا پیدل سفر طے کر کے سول نافرمانی تحریک چلانے اور نمک قانون Salt-Law توڑنے کے لئے ہزاروں چاہنے والوں کے مجمع میں پہنچے۔ پروفیسر ڈاکٹر برجیا دھیش پرشاد لکھتے ہیں:۔

In March 1930 Mahatma Gandhi, in pursuance of his plan

to start the Civil Disobedience Movement, undertook a march on foot from Ahmadabad to the Dandi sea-coast in the Bombay State — a distance of three hundred miles — to break the salt-law. Accompanied by over eighty Satyagrahis he reached the sea-coast, broke the Law, and was arrested.

صبح ساڑھے پانچ بجے مہاتما گاندھی اپنی رفیقۂ حیات اور بیاسی ستیہ گرہی ساتھیوں کے ساتھ سمندر کنارے پہنچے۔ گاندھی جی صرف ایک دھوتی پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے سمندر کنارے لگے ہوئے ذخیروں میں سے نمک کا صرف ایک ٹکڑا اُٹھایا۔ ہاتھ اونچا اُٹھا کر مجمع کو دکھایا اور پھر واپس آگئے۔ یہ بظاہر تو ایک بہت معمولی سا کام تھا لیکن حقیقتاً ایک عظیم کارنامہ تھا جو ہندوستان میں انگریزوں کے نمک قانون (salt-law) توڑنے کا نشان تھا۔ بس پھر کیا تھا؟ گاندھی جی کے ساتھیوں نے تقریباً دو ہزار پونڈ نمک گاڑیوں میں بھر بھر کر اپنے کیمپوں میں پہنچا دیا۔ فوراً ہی پولس والوں نے کیمپوں پر چھاپے مار کر تمام نمک اپنے تصرف میں کر لیا۔ لیکن گاؤں والوں نے اس کے جواب میں "خاموشی" اختیار کی۔ دوسرے ہی دن مہاتما کے ساتھیوں نے پھر نمک کے ذخیروں سے نمک لیا اور اسے گھر گھر تقسیم کیا جب کہ اُن میں سے کچھ نے سمندری پانی سے نمک بھی بنایا۔ اس کے بعد مہاتما جی کامیابی کا طوق پہنے ہوئے دوسرے ضلع میں چلے گئے اور ڈانڈی میں ہزاروں ہندوستانی اسی طرح نمک قانون کھلے عام توڑتے رہے۔

اس سِوِل نافرمانی تحریک اور نمک قانون شکنی کی خبر نے دہلی سے لندن تک انگریزی سرکار میں ایک ہلچل مچا دی۔ یہ تحریک جنگل کی آگ کی طرح بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ روزنامہ "The Times" کے کرسپانڈینٹ نے بتاریخ ۱۴ اپریل ۱۹۳۰ء بمبئی سے ٹیلی گرام کیا:-

The Laws of country has not only been broken, but have been contemptuously flouted from one end of India to the other.

گجرات کے گاؤں میں پولس اور دیگر سرکاری حکام کی کوئی نہیں سُن رہا تھا اور یہ عام ہوا چل پڑی تھی کہ صوبۂ گجرات و بمبئی کے شہری و دیہاتی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے اور دوسروں کو بھی دلا رہے تھے۔ بڑی سے بڑی طاقت بھی اس وقت گاندھی جی کی اس تحریک کے اثر کو ختم کرنا تو درکنار، کم تک نہیں کر سکتی تھی۔ انگریزی سرکار کی چولیں ہل گئیں۔ آخرکار یہی سوچا اور طے کیا گیا کہ مہاتما گاندھی کو نظر بند کر دیا جائے تو اس طوفان کو روکا اور قابو میں لایا جا سکتا ہے ورنہ اس طرح تو برٹش حکومت کا تختہ لوٹ جانے اور عزت خاک میں ملنے کا قطعی اندیشہ و خدشہ ہے۔ دن گذرتے گئے، ہفتے پورے ہوئے۔ یہاں تک کہ دو ماہ کی مدت اسی ہلچل میں گذر گئی۔

مہاتما گاندھی کی گرفتاری و نظر بندی کی مہم سرکاری حکام میں اندر ہی اندر چلتی رہی۔ گورنمنٹ موقع کی تلاش میں تھی کہ کسطرح اس مہم کو سر کیا جائے۔ اِدھر گاندھی جی نے فتح ڈانڈی کے بعد نمک کے دوسرے ذخیروں کو حاصل کرنے کا ارادہ کیا جو مقام دھر آسنا میں تھے۔ لیکن ایسا کرنے سے قبل مہاتما گاندھی نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اب جو شخص بھی میرے ساتھ جائے گا وہ مسلح اور شرابی نہیں ہوگا، نیز اس کا کھدر پوش ہونا ضروری ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص بھی کسی طرح

کی کھانے پینے کی کوئی چیز کسی غیر کے ہاتھ سے نہیں لے گا۔ ہم لوگ "اہنسا کی وِجے" کر کے دکھائیں گے۔ دھراسنا جانے سے قبل مہاتما جی نے وائسرائے (ہندوستان) کو ایک خط بھی تحریر کیا جس میں لکھا تھا:

"میں نے جو قدم اُٹھایا ہے وہ حکومت کی نظر میں یقیناً خطرناک ہے۔ میں "ہنسا" کو "اہنسا" سے فتح کروں گا اب آپ جس طرح بھی اس سول نافرمانی تحریک Civil Disobedience Move-ment کو روکنا پسند کریں، یہ آپ کا کام ہے .... ایم کے گاندھی"

بمبئی گورنمنٹ کے ۱۸۲۸ء کے ایک قانون کے تحت کسی بھی وقت کتنے بھی عرصے کے لئے کوئی بھی جانچ کئے بغیر ہر وہ شخص گرفتار و نظر بند کیا جا سکتا تھا جس سے سرکاری قانون شکنی اور ملک میں شور و غوغا اور ہلچل پھیلنے کا خطرہ ہو۔ لہٰذا اسی ordinence کے تحت سورت کے قریب کرادی (Karadi) نام کے ایک گاؤں میں آدھی رات کے وقت مہاتما گاندھی کو اُن کے کیمپ میں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن یہ گرفتاری اس ہوشیاری سے کی گئی کہ عوام کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

رات کے ایک بجے جب کہ مہاتما گاندھی گہری نیند میں آرام فرما رہے تھے، ڈسٹرکٹ پولس سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایک دستہ مسلح پولس گاندھی جی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ گاندھی جی جاگ گئے۔ وارنٹ پڑھا۔ ہاتھ منہ دھویا۔ فوراً ہی موٹر لاری کے ذریعے اسٹیشن پہنچا دیئے گئے اور بمبئی ایکسپریس (Bombay Express) سے یرودا جیل (yeravada) کو روانہ کر دیئے گئے۔ گرفتاری کے وقت کسی اخبار کا کوئی نمائندہ وغیرہ تک نہیں تھا۔ صرف روزنامہ "ڈیلی گراف" (The Daily Telegraph) کے اسپیشل کرسپانڈینٹ مسٹر اشمیڈ بارٹ لیٹ (Mr. Ashmead — Bartlett) موجود تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھا سرکاری طور پر یہ اسکیم تیار کی گئی تھی کہ مہاتما گاندھی کو بورِدلی (Borvili) اسٹیشن سے کچھ پہلے ہی ایک چھوٹے سے ریلوے کراسنگ پر صبح تڑکے بمبئی ایکسپریس سے اُتار کر ایک موٹر کار کے ذریعے جیل پہنچایا جائیگا مذکورہ ریلوے پھاٹک پر انسپکٹر پولس مسٹر کارڈن (cordon) اور پولس سپرنٹنڈنٹ مسٹر فرانٹ (Farrant) بے چینی سے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ صبح کا سہانا و دلکش وقت، نسیم کے جھونکے، چڑیوں کا چہچہانا۔ سبزہ لہرا رہا تھا۔ گاؤں والے خوش خوش اپنے اپنے کھیتوں پر کام کرنے چلے جا رہے تھے۔ لیکن ان بھولے بھالے دیہاتیوں کو کیا خبر تھی کہ آج اُن کا ہر دلعزیز لیڈر انہیں کے علاقے میں گرفتار ہو کر آ رہا ہے۔ جیسے ہی گاڑی آ کر ٹھہری، مہاتما گاندھی صرف ایک دھوتی پہنے اور کاندھوں پر شال ڈالے ہوئے گاڑی سے اُتارے گئے۔ پولس افسروں نے گاندھی جی کو سلام کیا۔ گاندھی جی نے خندہ پیشانی کے ساتھ مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ مسٹر بارٹ لیٹ نے مہاتما گاندھی سے سوال کیا "کیا آپ کو اِس گرفتاری کے سلسلے میں کسی سے بھی کسی طرح کا کوئی شکوہ و شکایت ہے؟" مہاتما گاندھی نے ہنستے ہوئے جواب دیا "نہیں! بالکل بھی نہیں! میں تو اِس گرفتاری کے بارے میں پہلے ہی سے جانتا تھا"

مسٹر بارٹ لیٹ نے پھر سوال کیا "کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ کی اِس گرفتاری سے ہندوستان میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ پھیل سکتی ہے۔؟" مہاتما گاندھی نے اِس سوال کا جواب بھی بڑے ہی اطمینان بخش طریقے پر دے کر انگریزوں کے منہ بند کر دیئے۔ فرمایا "نہیں! میں ایسا ہرگز نہیں سوچتا ہوں۔ میں بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں

کہ میں نے ہر طرح کی ہلچل روکنے کی ہر ممکن کوشش کردی ہے۔ میں سمجھتا ہوں میں نے بڑی عمدگی سے معاملے پر قابو پانے کی بہترین کوششیں کردی ہیں" ——— غور طلب بات ہے کہ مہاتما گاندھی کی گرفتاری اور گرفتاری بھی کیسی؟ ایک نامعلوم مدت کے لئے۔ لیکن مہاتما گاندھی کے جوابات کیسے تسلی و اطمینان بخش ہیں۔ اُن کی ہمت، جواں مردی، مستعدی، مستقل مزاجی اور اُولوالعزمی سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے اور اقوام عالم کے لئے ایک شمع رہگذر ہے۔ درحقیقت مہاتما گاندھی ایک عظیم شخصیت و کردار کے متحمل تھے۔ ایک انگریز مفکر نے کریکٹر کی تعریف جن الفاظ میں پیش کی ہے اُس کی روشنی میں مہاتما گاندھی کے کردار کا مہد سے لحد تک اندازہ لگائیے تو حقیقت معلوم ہوگی۔ وہ انگریز مفکر کہتا ہے:

"Character is completely fashioned will. It is an organization of sentiments round the self."

ان سوال و جواب کے بعد انڈین میڈیکل سروس کا ایک ڈاکٹر، انسپکٹر پولس مسٹر کارڈن اور مہاتما گاندھی موٹرکار میں بیٹھ گئے۔ خوبصورت، رنگین ریشمی پردے پڑی ہوئی موٹرکار ایک سو تیس میل کی رفتار سے علی الصباح مہاتما گاندھی کو اُن کی سول نافرمانی تحریک اور نمک قانون شکنی کی منزل مقصود یرودا جیل (yervada prison) لے گئی ——— پھر کیا تھا...؟ ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں عام ہڑتالیں۔ کیونکہ عوام و خواص بھلا اس بات کو کب بات کو کب برداشت کرسکتے تھے کہ سربراہِ ملک و ملت بے گناہ و بے قصور ایک نامعلوم مدت کے لئے ایسا نظربند کردیا جائے کہ یہ بھی پتہ نہ چل سکے کہ کب گرفتار ہوا؟ کہاں پوشیدہ کردیا گیا؟ لوگوں کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی لیکن مہاتما گاندھی کے چہرے پر مسکراہٹ ہی رہی۔ گاندھی جی خندہ پیشانی، ہمت و حوصلہ اور عزم مصمم کے ساتھ مسائل و مصائب کا دل و جان سے ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہی رہے۔ آخر کار وہ وقت آ ہی گیا کہ مہاتما گاندھی کی "اہنسا" Non-voilence نے انگریزوں کی "ہنسا" Voilence پر قابو پا لیا اور مہاتما گاندھی کو اپنے مقصد میں عظیم کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل ہوئیں جو آج تک اظہر من الشمس ہیں۔ لارڈ ریڈنگ Lord Reading نے لکھا تھا:

"Gandhi, The Prophet of India was convinced to a point bordering on fanaticism that Non-voilence and Love will give India its Independence."

مہاتما گاندھی کے عظیم کردار، مقناطیسی شخصیت، ہمت، حوصلہ، مستقل مزاجی، اُولوالعزمی، بلند فکر و شعور، ایمانداری و وفاداری، اخوت و ہمدردی، سنجیدگی و متانت اور مہر و محبت کی وجہ ہی سے برٹش گورنر، وائسرائے، اُمرا و وزراء امریکن، آسٹریلین اور یوروپین بلند پایہ مفکر، مقرر، ادیب اور انشاء پرداز اُن کے معترف و معتقد ہوگئے ——— !!

یہ لذّت اور نعمتوں میں کہاں ہے　　ہماری داستاں اک داستاں ہے

(سیّد بے نظیر شاہ وارثی)

گماں مبر کہ چوں تو بگزری جہاں بگذشت　　ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست

(عرفی)

اسرار اکبر آبادی



# مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے ہوتے ہوئے

# قومی یکجہتی کیسے؟

قوم کئی کلچروں کے انسانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ قوم کی شخصیت اپنی پوری ترقی اور مکمل کمال کے لئے ایکتا اور یکجہتی کی محتاج ہے۔ ایکتا اور یکجہتی کے بغیر قوم کو اپنی قوتوں اور خوبیوں کا شعور نہیں ہوتا اور جس قوم کو اپنی قوتوں اور خوبیوں کا شعور نہیں وہ کبھی ترقی اور کمال کی اونچائیوں پر نہیں پہنچ سکتی۔ وہ لاعلمی کے اندھیروں اور اپنے کردار کی کمزوریوں کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کمزور اور بھٹکے ہوئے ٹکڑے بیرونی دباؤ کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کے لئے دم توڑ دیتے ہیں اور قوم مر جاتی ہے۔

قوم اور کلچر کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ قوم کا تخلیقی اظہار ہی کلچر ہے۔ قوم کی روحانی قوتوں اور جمالیاتی قدروں سے بنتا ہے جن کا اظہار آرٹ اور شاعری، موسیقی اور رقص، رہن سہن اور بول چال کے ایک خاص انداز میں ہوتا ہے۔ یہ خاص انداز جغرافیائی اور تاریخی اثرات سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک مکمل اور صحت مند کلچر انسان کی حیوانی جبلتوں میں سدھار کر کے انہیں فائدہ مند بنا دیتا ہے اور اس کی تعمیری اور سماجی جبلتوں کو ابھار دیتا ہے۔ انسان اپنے جذبات پر قابو پا جانا سیکھ جاتا ہے۔ اس کا احساس تیز تر ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کو اس کے ماحول سے اور اس کے ماحول کو انسان کے ذہن سے مانوس کر دیتا ہے۔ کلچر زندگی کی طرح متحرک ہے۔ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کلچر کی بنیادیں زندگی کی لازوال سچائیاں ہیں اس لئے ان لازوال سچائیوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ ان کے اظہار کا اوپری روپ ہی وقت اور ماحول کی ضرورتوں کے مطابق ڈھلتا اور بدلتا رہتا ہے۔

ہر کلچر میں ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں کا استعمال ہوتا ہے۔ زبانیں جذبات و خیالات اور تجربات و محسوسات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ کسی زبان کے ادب میں اس کے بولنے والوں کی تہذیب، ان کی تاریخ، ان کی آرزوئیں اور امنگیں، ان کی قومی شخصیت، ان کے جمالیاتی، اخلاقی اور سماجی اقدار (Values) ہوتے ہیں۔ ادب کے ذریعے ہم خیال کی بلندی، جذبے کی گہرائی، احساس کی نزاکت، روح کی پرواز اور شوق کی معراج تک پہنچ سکتے ہیں۔ زبان اور ادب، سیرت اور شخصیت بناتے ہیں۔ اس لئے کسی زبان اور اس کے ادب سے نفرت کرنا انسان دشمنی اور کم نظری کی دلیل ہے اور کسی ایک زبان کی ترقی میں کسی دوسری زبان کو رکاوٹ سمجھنا اس سے بھی گئی گذری بات ہے۔ یہی کم عقلی اور کم نظری قومی یکجہتی کو پاش پاش کر دیتا ہے۔

قومی یکجہتی کے لئے سب سے پہلے ہمیں آج کے تمام کلچروں پر موجودہ سائنسی علوم کی ترقی کی روشنی میں کھلے دل و دماغ کے ساتھ اس حقیقت کو جاننا بہت ہی ضروری ہوگیا ہے کہ وہ کون کون سے کلچر ہیں جو بنیادی طور پر اپنے آپ میں مکمل ہیں اور آج کی آگے بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زندگی کا ساتھ دے سکتے ہیں اور ایسے کون کون سے کلچر ہیں جو ناموافق حالات کی وجہ سے ابھی تک بنیادی طور پر مکمل نہیں ہو پائے ہیں یا جن کی پہنچ پوری طرح زندگی کی لازوال سچائیوں تک نہیں ہو پائی ہے۔ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد ادھورے کلچروں کے انسان دوست اور تعمیری خوبیوں والے باعمل لوگوں کے لئے ایسے سادھن مہیّا کئے جائیں، جن سے وہ اپنے کلچر کے ادھورے پن کا احساس و شعور کر سکیں اور پھر اسی احساس و شعور کی مدد سے کلچر کے ادھورے پن کو مکمل کر سکیں۔ اس طرح جب قوم کے تمام کلچر بنیادی طور پر ایک ہو جائیں گے تو قومی یکجہتی اور ایکتا کا جذبہ عام کرنے میں بہت زیادہ آسانی ہوگی اور ہم ان تمام مشکلوں کے مقابلے میں ضرور کامیاب ہوں گے جو آج کل قومی یکجہتی کے درمیان رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد زبانوں کے ذریعے ایک ایسے صاف ستھرے لٹریچر کو پھیلایا جائے جو انسانی کمال اور زندگی کے جمال اور جلال سے بھرا ہوا ہو اور جو قوم کے اندر اس کی بنیادی جبلت یعنی جذبۂ محبت کو جگا کر انسان کو انسان سے ہمدردی اور پیار کرنا سکھائے۔ وہ انسان کو بااخلاق، بامروّت، باوضع، بااوقات، خوش پوش، خوش نوش، خوش مذاق، خوش مزاج شریف نواز، حسّاس، خوددار اور سلیقہ پسند بنائے۔ مذہب کو خالق و مخلوق اور انسان و کائنات کے اٹوٹ رشتے کا واحد اور موثر ذریعہ بنا کر پیش کرے۔ سائنسی ذہن اور سائنسی مزاج کو فروغ دے کر زندگی کی لازوال سچائیوں سے قوم کو روشناس کرائے۔ اقتصادی اور مالی خلیجوں کو بھرنے کے لئے قابل عمل ترکیبیں ذہن نشیں کرائے تاکہ قوم کی ذہنی اور جسمانی طاقتوں کا بھرپور استعمال ہو سکے۔ اور سرمایہ و محنت کا ٹکراؤ ہمیشہ کے لئے سماج سے ختم ہو سکے۔ دیش کے قدیم اور عظیم دانشوروں، ادیبوں، لیڈروں اور فن کاروں نے جو قدیم اور صحت مند ورثے کی تعمیر میں حصہ لیا ہے اُسے اجاگر کرے۔ دلوں میں وطن کی محبت جگا کر صوبائی اور نسلی تعصب ختم کرے۔ رواداری اور برابری کا احساس و شعور پیدا کرے اور اس انداز سے پیدا کرے کہ یہی احساس و شعور وطن کی محبت کے جذبے کو اتنا پھیلاتا چلا جائے کہ یہ بڑھتے بڑھتے وطن کی حدوں سے نکلتا ہوا تمام انسانی برادری کو اپنی گود میں سمیٹ لے اور بے اختیار اس حقیقت کو سب پر آشکار کر دے کہ ایک خدا   ایک کائنات   اور ایک انسان۔ کیونکہ یہی وہ سب سے بڑی لازوال بنیادی سچائی ہے جس سے قومی یکجہتی اور ایکتا اپنی تمام اچھائیوں اور خوبصورتیوں کے ساتھ قائم اور دائم ہو سکتی ہے اور ہم سب ایک ہو سکتے ہیں۔

آج کل قومی یکجہتی کے لئے جو مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں وہ کلچروں کے ادھورے پن کے ساتھ ساتھ تخریبی اور گندی سیاست کی وجہ سے بھی کامیاب نہیں ہو پا رہی ہیں۔ آج کل عام سیاست کا مقصد ملک و قوم کا سدھار اور خدمت نہیں بلکہ اقتدار حاصل کرنا ہے۔ دوسرے، اپنے مذہب اپنے کلچر اور اپنے صوبے کو سب سے بلند و بالا سمجھ کر دوسرے مذہبوں، کلچروں اور صوبوں سے نفرت کرنے کا رجحان سماج کے بااثر لوگوں میں بھی پایا جا رہا ہے تیسرے، ایسے نظریات و خیالات کا بڑے پیمانے پر زوردار پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے جو انسان کے شیطانی یا تخریبی عناصر کو بڑھا کر اس میں بے اصولی، بے حسی، بے عملی اور کم ظرفی کی لعنتیں ابھار رہے ہیں اور انسانیت کی اس خوبصورت تباہی کو انسان کی مکمل اور سچی آزادی کا خوبصورت نام دیا جا رہا ہے۔ چوتھے، ابھی دنیا سے چھوا چھوت

کی برائیاں پوری طرح ختم نہیں ہو پائی ہیں۔ پانچویں، قومی یکجہتی کے لیے جو کام ہو رہے ہیں اُن میں سلیقے کی کمی ہے۔ اور اُن کے کرنے کا ڈھنگ بھی پُر اثر اور دل و دماغ میں اُتر جانے والا نہیں ہے۔

ان سب دُشواریوں اور مشکلوں کو ختم کرنے کی سخت اور فوراً ضرورت ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی قوم اپنی روحانی ذہنی اور جسمانی خوبیوں اور قوتوں کا تعمیری وکاس کر سکتی ہے اور اس کے بعد ہی بہت سی زبانوں کے بولنے والوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ سماجی اور مالی ناہمواریوں کو ہموار کرتی ہوئی انسانیت کی اُس خوبصورت اور اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ سکتی ہے جہاں سے تمام دنیا جنت ہی جنت نظر آتی ہے اور جہاں ہر طرف امن و محبت کے سُریلے گیت گونجتے ہیں؛ جہاں آسمان اپنی اونچائیوں کے راستے کھول دیتا ہے اور جہاں زمین اپنے تمام خزانے اُگل کر قدموں میں ڈال دیتی ہے اور جہاں قومی یکجہتی حقیقت میں قومی خوش حالی کا بھرپور ذریعہ بن جاتی ہے۔

مہاتما گاندھی کی تعلیم اور اُن کا فلسفۂ حیات اُن ہی تمام باتوں کی طرف ہمیں توجہ دلاتا ہے جو میں نے اپنے مضمون میں عرض کی ہیں۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے میں نے گاندھی جی کے افکار و خیالات اور ان کی تحریروں کے اقتباسات نہیں دیئے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ مختصر سی تحریر اُن کے تعمیری خیالات کا عکس ہے۔ کاش ہر ہندوستانی بلا تفریق مذہب و ملت اُن اصولوں کی پیروی کرے اور کاش ہمارے ملک میں باپو کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی کی پوری طرح تقلید ہو سکے اور ہم نئے دور کے مطابق خود کو اُن سانچوں میں ڈھال کر ملک کو امن و آشتی اور فلاح کے جدید راستوں پر لا سکیں۔ ☐

---

## بقیہ "گاندھی کا فلسفۂ تصوف"

خالق یا ایشور ہے جس کی مجھے پرارتھنا کرنی چاہیئے۔؟"

"دیکھو تم پھر منطق پر اُتر آئے۔ درحقیقت ایشور دلیل یا حُجت سے پرے کی چیز ہے۔ لیکن اگر تمہیں اپنی ان دلیلوں سے تسلی ملتی ہے تو تم جانو میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں ؟"

نوجوان خیالوں کی گہرائی میں ڈوب گیا۔

گاندھی جی سمجھاتے گئے "بھائی، اپنی برادری کا دُکھ درد دیکھ سُن کر تمہارے دل میں جو ہمدردی اور درد و غم کی لہر دوڑتی ہے، وہ کیا ہے ؟ تم اپنے آپ کو چاہے کتنا ہی ملحد سمجھو، مگر جب تک تمہارا دل انسانیت کی فلاح چاہتا رہے گا، تم غیر محسوس طور پر زندگی کے عمل میں ایشور کے نزدیک ہو اور اس کا عقیدہ تم میں موجزن ہے عظیم دہریہ بریڈلا کی مثال لو۔ اس کی تجہیز و تکفین کے وقت کچھ پادری بھی موجود تھے۔ اس وقت انہوں نے کہا تھا کہ وہ بریڈلا کے لئے نذرِ عقیدت اس لئے پیش کرنے آئے ہیں کہ وہ بڑا نیک کردار تھا۔"

آخر میں گاندھی جی اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے بولے "بھائی، اگر تم یہاں (آشرم) سے ایشور اور ستیہ کے بارے میں جیتا جاگتا عقیدہ لے کر واپس جاتے ہو تو یقیناً تمہارا کام خوب پھولے پھلے گا۔" ☐

("مہاتما گاندھی۔ دی لاسٹ فیز" سے ترجمہ)

محمد کمال الدین



# باپو ــــ کوئی روپ دھار کر آجاؤ

(ایک خط)

پیارے باپو ــــــ !

آن ہم کروڑ عوام کا سلام، جن کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔

تم کو ہم لوگوں سے بچھڑے ہوئے اکیس سال ہو گئے۔ ۲۱ سال کی مدت کوئی بہت بڑی مدت نہیں ہوتی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے ۲۱ صدیاں بیت گئیں۔ مصیبت کا ایک ایک لمحہ سال اور صدیوں کا حامل ہوتا ہے۔ تم نے پستول کی گولی نگل لی۔ آج کے ہندوستان میں تمہارے جیسے کثیر لوگ ہیں جنہیں پستول کی گولی نگل لینی چاہیئے لیکن انہیں نہیں ملتی۔ تمہارے وقت میں، صرف ایک گوڈسے تھا اور اب ہزاروں گوڈسے ہندوستان پر مسلط ہیں۔ انہوں نے اب پستول سے وار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اُن کے ہتھیار بدل گئے ہیں۔

باپو! ہمیں یقین ہے کہ جس اضطراب میں تم نے ہم لوگوں کو خیرباد کہا، تم جس بے چینی اور بے قراری میں زندگی بھر مبتلا رہے، ابھی تک مبتلا ہو۔ تمہاری آنکھیں ہندوستان کو دیکھ رہی ہیں۔

تم نے ہندوستان کی آزادی کے قبل کہا تھا،

"ہندوستان کی ہر چیز میں دلکشی ہے۔ اس میں ہر وہ چیز ہے جس کی کوئی بھی شخص تمنّا کر سکتا ہے۔"

ہندوستان کی یہی دلکشی اُس کے لئے پریشانی کا باعث رہی۔ نادر شاہ سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی تک سبھوں نے اِس سونے کی چڑیا کی طرف حریص نظروں سے دیکھا۔ اُس کی دلکشی سے رنگ و روغن چُرا کر اپنے محلوں کو زینت بخشی۔ تم اِن کے خلاف آمادۂ پیکار ہوئے۔ ہندوستان کے بھوکے ننگے عوام کے ہاتھوں میں اہنسا اور رُوحانیت کا ہتھیار دیا۔ ایسی شہنشاہیت کے خلاف ٹکرا دیا، جو روئے زمین کے اکثر و بیشتر حصّے پر قابض تھی۔ اُسے جھکنے پر مجبور کیا، لیکن تم نہیں جھکے۔ ہندوستان کی دلکشی سے روشنی چُرانے والوں کو تم نے بیڑیاں پہنا دیں۔ انہیں مُلکِ عدم پہنچا دیا۔ تم بھی جانتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہے! ہندوستان کی دلکشی و زیبائی آج بھی لوٹی جا رہی ہے۔ دنیا کی اقوام کی للچائی نظریں جس طرح پہلے پڑتی تھیں، آج بھی پڑ رہی ہیں۔ وہ اِس کے عارض کے گلاب، اُس کے ماتھے کی بندیا اور اُس کی آنکھوں کی چمک چُرانا چاہتے ہیں۔ اُن کے پنجوں کی گرفت میں تمہارا ہندوستان کراہ رہا ہے۔

باپو! تم نے تو پورا ہندوستان آزاد کر دیا تھا، لیکن تم نے ضرور محسوس کیا ہوگا، ۶۲ء میں سُرخ آندھی چلی۔ اس نے ہماری سرزمین کے ایک بڑے حصّے کو پامال کر دیا۔ اُس کی زد میں بھارت کا ایک بڑا حصّہ آ گیا۔ ہمالہ کی برف پر سُرخ

نہیں ہوگئی تھیں۔ ہزاروں ماتموں کے سیندور سے شمالی مشرقی اُفق سے عارض تمتما اُٹھے تھے۔ بارود کی دھمک سے تمہاری سمادھی بھی وہاں اُٹھی تھی۔ تم نے دیکھا ہوگا، پورا ہندوستان اُبل پڑا تھا پھر ۶۵ء کی جنگ ہوئی۔ تم نے خوشی سے ہندوستان کا ایک ہاتھ الگ کردیا تھا لیکن اس ہاتھ نے پلٹ کر ایسا طمانچہ رسید کیا کہ بھارت کا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ تم اُس وقت بھی جاگ رہے تھے۔ تم سے کیا کہیں... تم تو سپر سونک جٹ فائٹر آوازیں سُن رہے تھے۔ بارود کی آندھی اور ٹینکوں کی گھن گرج میں ہندوستان کی سرحد اندھی ہوگئی۔ بڑے بڑے درخت اپنی اپنی جڑیں کھو بیٹھے۔

تم کو تو صرف اکیس سال ہوئے۔ اُمید ظاہر کی تھی ہندوستان اور پاکستان آپس میں بھائی بھائی کی طرح رہیں گے ارے! تم تو خود کفِ افسوس مل رہے ہو۔ تمہاری پیشانی پر شکنیں کیوں ہیں باپو!؟۔

تم نے کہا تھا !

"میں ایک ایسے ہندوستان کے لئے کام کروں گا جس میں غریب سے غریب آدمی یہ محسوس کرے گا کہ یہ اُس کا ملک ہے اور جس کے بنانے میں اُس کی آواز بھی اثر رکھتی ہے۔ ایسا ہندوستان جس میں کوئی اونچا یا نیچا طبقہ نہیں ہوگا۔" ہوا کیا ؟

بولو تو ارے تم تو رو رہے ہو۔ قید و بند کی مصیبتیں، حالات کے کچوکے۔ کستوربا کی موت۔ بڑھاپے کی کمزوری کسی سے تم ہراساں نہیں ہوئے۔ لیکن آج تم بہت پریشان ہو۔ تمہیں کسی کروٹ قرار کیوں نہیں ملتا۔ تم مجھ سے باتیں کرتے کرتے گردن کیوں گھما لیتے ہو ؟

میں سمجھ گیا باپو! تم اس لئے پریشان ہو کہ تم نے جو کچھ کہا، ہندوستان کی آزادی کے بائیس سال گذرنے پر بھی پورا کیا ہوتا بلکہ یہاں غریب تو اور بھی غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ پست پست ہی رہا۔ طبقوں کے درمیان گہری خلیج قائم ہوگئی۔ ہندوستان کی دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں سمٹ گئی ہے۔ اس کی افادیت سکڑ گئی۔ آج بھی اونچے طبقے نیچے طبقوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ سامراجی طاقتیں اپنے چنگل میں ہندوستان کو دبوچے ہوئے ہیں۔!

تم تو دیکھ ہی رہے ہو! آزادی کے اتنے دنوں بعد بھی ہندوستان کی تقریباً تیس کروڑ آبادی کے پاس گھر نہیں ہے کھانا، کپڑا، دوا دارو، علاج معالجہ کچھ نہیں ہے۔ اِس دھرتی پر کتنے اکبر، شیواجی، بہادر شاہ ظفر، کنور، رام موہن رائے، ٹیگور، غالب، اقبال، تلسی داس، سور داس اور بھارتیندو، نہرو، ابوالکلام، مظہر الحق، ڈاکٹر انصاری، مدن موہن مالویہ، گوکھلے، سر سید اور گاندھی نے فٹ پاتھ پر کیڑوں کی طرح جنم لیا اور نالی میں لُڑھک گئے۔ بڑے بڑے شہروں کی تاریک گلیوں میں، دیہات کی جھونپڑیوں میں کتنی معزز ہستیاں بے نام و نشان ختم ہوگئیں۔ انہیں ٹھیک ماحول نہیں ملا۔ انہیں دوا نہیں ملی۔ انہیں تعلیمی سہولت اور دوسری ضروریاتِ زندگی کی اشیا نہ مل سکیں۔

تم نے اگلے سال کی اُس بھکارن کو ضرور دیکھا ہوگا، جو پٹنہ کی ایک عظیم الشان عمارت کے پیچھے گندے نالے پر رہتی تھی۔ سامنے سینما کی چہل پہل ہے، جہاں ہر دن راتیں جوان ہو کر حاملہ ہو جاتی ہیں۔ سڑکوں پر چست شلوار اور قمیص میں کسی کسائی نشیلی آنکھوں اور شفق شنگار گالوں والی تھرکنے والیاں زندگی کے باغ سے ہزاروں بہاریں لئے اُڑتی ہیں۔ ہزاروں بانکے دھرتی کا سینہ مسلتے ہیں۔ معلوم ہے باپو! ہوا یہ کہ ایک دن اس بھکارن کا شوہر مر گیا۔ اُس نے ایک سیٹھ کے یہاں سراد کی سڑی گلی چیزیں کھائی تھیں۔ اپنی جھونپڑی میں آتے آتے بے ہوش ہوگیا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سے جھوٹے شوربے اور چاول میں لپٹے ہوئے پتے لایا تھا۔ بھکارن نے بھی کھا لیا۔ دوسری صبح بھکارن کے

پیٹ کا بچہ گھبرا کر باہر آگیا۔ بھکارن مرگئی۔ بچہ دس گھنٹے تک، اپنے آزاد ہندوستان میں ہمکتا رہا۔ کسی نے چمکارا بھی نہیں۔ سُنتے ہیں وہاں پر بہت سے لوگ تھے کسی نے دھیان نہیں دیا اور ننھا دُولہا بنا اپنی دُلہن لئے سسرال سے رُخصت ہوگیا۔ کتنا خوبصورت تھا وہ! کشادہ پیشانی۔ سُتواں ناک ... تم تو اتنا ضرور جانتے ہو باپو! کہ وہ کوئی دُوسرا گاندھی ہو سکتا تھا۔ اِس طرح کے ہزاروں واقعات پست طبقوں کے ساتھ تمہاری آزاد کردہ دھرتی پر ہر دن ہوتے رہتے ہیں۔

تمہاری دھوتی کا سِرا بھیگ گیا ہے۔ اب ہم زیادہ نہیں کہیں گے ــــ صرف ایک بات اور۔
باپو تم نے کہا تھا !

"ایسا ہندوستان بناؤں گا جس میں تمام فرقے شیر و شکر ہو کر رہیں گے۔ ایسا ہندوستان جس میں چھوت چھات کی لعنت نہ ہوگی۔ ہندو مسلمان، سکھ عیسائی سبھی اتفاق و اتحاد سے رہیں گے"۔

معلوم ہوتا ہے تم بہت پریشان ہو گئے۔ لیکن ہم جس آگ میں ہر دن، ہر لمحہ، ہر سکنڈ جلتے ہیں، تمہیں بھی بتائیں گے۔ ہم نے جب ہوش سنبھالا تو تمہیں ڈھونڈا۔ لوگوں نے کہا تم جا چکے ہو۔ تب ہم نے تمہاری باتوں کی طرف توجہ دی، تمہاری زندگی کا مطالعہ کیا ... تم کتنے عظیم ہو ... تمہاری سوکھی شخصیت میں کتنا رَس ہے ... تمہارے ارادوں میں کتنی مضبوطی ہے ... تم عظیم ہو بہت عظیم !۔

تمہاری موت ایک بہت بڑے کاز کو لے کر ہوئی لیکن تمہارا خون بھی بھارت کے ماتھے سے اس دھبّے کو نہ مٹا سکا باپو! تم نے تو اپنے خون کا بیشتر حصّہ آزادی کی لڑائی میں پانی کر دیا تھا۔ فرقہ وارانہ فساد کی جنگ لڑنے کے لئے تمہارے جسم میں بہت کم خون رہ گیا تھا۔ گوڈسے نے سوچا اگر تمہارے خون میں زیادہ حرارت آگئی تو تم یقیناً تمام فرقوں کو شیر و شکر کرتے رہو گے، اِس لئے اُس نے بڑی عقلمندی سے اپنا کام انجام دیا۔

اور ... اور اِس کے بعد کیا ہوا۔ تمہاری دھرتی پر راون کا ناچ ... آج تک ہو رہا ہے۔ ہزاروں سیتائیں، حوّائیں اور مریمیں ... ہزاروں جیالے اور بانکے سُورما ... ہزاروں پھُول جیسے بچے ... ہندوستان کے مستقبل کے معمار، ہر سال، ہر مہینے، ہر دن آندھیوں کی زد میں لُٹتے ہیں۔ آندھیاں تھمتی ہیں تو اُن کے چہرے اتنے بھیانک، مسخ شدہ اور دردناک ہو کر سامنے آتے ہیں کہ تمہاری سمادھی رات کے سنّاٹے میں چور چور ہو جاتی ہے لیکن صبح درخشاں کی خوشی میں پھر سے سنور کر ضوفشاں ہو جاتی، اِس لئے کہ تم گھٹا ٹوپ مایوسی کی آندھی میں بھی اُمید کا چراغ لے کر چلنے کے عادی تھے۔

باپو! تم نے آزاد ہندوستان کی تصویر پیش کرنے کے بعد کہا تھا: "یہ ہے میرے خوابوں کا ہندوستان! اگر اِن باتوں میں سے کوئی بھی پُوری نہیں ہوئی تو میں مطمئن نہیں ہوں گا۔" اور آج میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے آخری وعدے پر ابھی تک گامزن ہو۔ جب تمہیں آرام نہیں ہے تو تم کوئی رُوپ دھار کر کیوں نہیں آجاتے۔ آزادی سے پہلے تو صرف چند ہزار انگریز تھے، لیکن اب تو کئی کروڑ انگریز نما ہندوستانی تمہارے بھارت کے سینے پر مونگ دَل رہے ہیں۔

ہم پچاس کروڑ بھارتی عوام کی تم سے گذارش ہے کہ اپنی صد سالہ برسی کے موقع پر ہندوستان میں کوئی رُوپ لے کر آجاؤ۔ ہمیں تمہاری سخت ضرورت ہے۔

آپ کے منتظر ــــ رام محمد سنگھ ڈیسوزا

گاندھی نمبر ۶۹ء

شاعر، بمبئی

کیمبل جانسن



# جب ہندوستان تقسیم ہوا!

ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ملٹری سکریٹری مسٹر کیمبل جانسن نے حال ہی میں ایک کتاب "عہد ماؤنٹ بیٹن" لکھی ہے۔ ہندوستان کو اختیارات کی منتقلی کی یہ روئداد انہوں نے اپنی یادداشت اور بعض خطوط کے ذریعے مرتب کی ہے اور ڈائری کی صورت میں اسے شائع کیا ہے۔ ہر چند اس میں عصبیت اور واقعات کی بعض غیر حقیقت پسندانہ جھلکیاں ملتی ہیں اس میں Diplomatic ذہن کام کر رہا ہے۔ پھر بھی تقسیم ملک کے واقعات کی ایسی مربوط کہانی کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتی۔ اس کتاب کے چند ابواب کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

وائسرائے ہاؤس، نئی دہلی

بروز پیر ۲ر جون ۱۹۴۷ء

وہ عظیم لمحہ آ پہنچا جس کا انتظار تھا۔ سارے لیڈر اپنی امریکی کاروں میں شمالی کورٹ کی سمت آنے لگے۔

بین وائسرائے کی مطالعہ گاہ میں تھا۔ اس مطالعہ گاہ کی فضا قطعی غیر رسمی تھی۔ اس کے دروازوں پر ہلکے سبز رنگ کی پالش کی گئی ہے۔ بڑے کمرے کے دروازے کے ٹھیک اوپر کلائیو کی جو تصویر آویزاں ہے وہ "راج" کی ابھرتی ہوئی عظمت کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہی ہے۔

مسٹر جناح سب سے آخر میں چند منٹ دیر سے تشریف لائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے مختصر دوستانہ گفتگو کر کے فضا کو دوستانہ بنانا چاہا، لیکن فضا اتنی ہنگامہ خیز تھی، کہ بات مکمل نہ ہو سکی۔ کرپلانی کو شامل کرنے کا مسئلہ اس طرح حل کیا گیا کہ مسلم لیگ کے رکن سردار عبدالرب نشتر کو بھی شامل کر لیا گیا۔ جناح نے یہی شرط رکھی تھی۔ چنانچہ پانچ بڑوں کی بجائے سات بڑوں سے ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات ہوئی۔ کانفرنس ٹھیک دو گھنٹے جاری رہی۔

ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ میں نے آخری بار کیبنٹ مشن پلان میں جان ڈالنا چاہی تھی لیکن جب جناح نے اسے مسترد کر دیا تو پھر نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق میں تقسیم ملک کا فارمولا پیش کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کانگریس تقسیم ملک کے اصول پر رضامند تو نہ ہوئی، لیکن اس نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر تقسیم ہند ناگزیر ہے تو پھر صوبوں کی بھی تقسیم کر دی جائے، تاکہ مسلم یا ہندو اکثریت کے علاقوں کے جبر و استبداد اپنی موت آپ مر سکیں۔

جناح نے صوبوں کی تقسیم کی سختی سے مخالفت کی، وہ صرف تقسیم ہند کے مطالبہ پر آڑے رہے۔ انہوں نے کہا کہ پلان لندن میں پارٹی کا مسئلہ نہیں بنا۔ انہوں نے سکھوں کی پوزیشن پر اپنے دکھ کا اظہار کیا اور استصواب کی رائے کی تجویز کو کلکتہ "فری پورٹ" بنا دیا جائے، پیش کیا۔

پلان کی کاپیاں تقسیم کر دی گئیں تو ماؤنٹ بیٹن نے کہا: "مجھے امید ہے کہ اگر میں آپ سب کے تعاون کی درخواست کروں گا تو آپ اپنے ضمیر کی خلاف ورزی بھی کر سکتے ہیں۔ میری صرف یہ درخواست ہے کہ آپ لوگ پرامن طور پر پلان کو منظور کر لیں۔" پنڈت نہرو نے جب منظوری اور سمجھوتے کی مزید صراحت چاہی تو ماؤنٹ بیٹن نے فوراً کہا کہ سمجھوتہ کا مطالبہ

نہیں کر رہا ہوں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ پلان کو منظور کر کے صرف یہ یقین دلادیں کہ ملک کی فلاح اور بہبود کے لئے پلان مناسب اور معقول ہے۔

پنڈت نہرو نے کہا کہ کانگریس کسی حال میں پلان کو مکمل طور پر منظور نہیں کر سکتی، البتہ اس کے زیادہ حصے کو منظور کرتی ہے۔ عبدالرب نشتر نے اس منطقی بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ پلان کی منظوری کا مطلب ہی دراصل اس بات سے سمجھوتہ اور اتفاق ہے کہ اسے زیر عمل لایا جائے گا۔ ماؤنٹ بیٹن نے نشتر سے اتفاق کیا اور اس وقت یہ اندازہ لگا لیا گیا کہ جنگ جیتی جاچکی ہے۔ اس کے بعد جناح نے بتایا کہ وہ قائد اعظم ہونے کے باوجود اپنے طور پر فیصلہ کیوں نہیں لے سکتے۔ انہوں نے کہا کہ میں تجاویز کی اسپرٹ کی قدر کرتا ہوں لیکن مجھے اور مجلس عاملہ دونوں کو فیصلہ کرنے سے پہلے عوام کا نقطۂ نظر بھی معلوم کرنا ہوگا۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ ایسے بھی مواقع آتے ہیں جب لیڈروں کو عوام کا نقطۂ نظر معلوم کئے بغیر اہم فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ حالات کے مطابق اگر فیصلہ کر لیا جائے اور بعد میں عوام اس کی تصدیق کر دیں تو یہ طریقہ کار قطعی جمہوری ہوگا۔

جناح قریب قریب فیصلہ دے چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں عوام کے سامنے پلان کو پیش کروں گا، لیکن اس نیت کے ساتھ نہیں کہ اس میں مخالفت میں آوازیں بلند کروائی جائیں۔ بلکہ اس امید پر کہ وہ کسی طرح اسے منظور کر لیں۔ انہوں نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

ماؤنٹ بیٹن نصف شب تک کانگریس اور مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور سکھوں کا رد عمل معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کرپلانی اور بلدیو سنگھ رضامند ہوئے لیکن جناح نے کہا کہ وہ تحریری طور پر مجلس عاملہ کی آراء نہیں بھیج سکتے، البتہ خود آکر وائسرائے سے ملیں گے اور زبانی رپورٹ پیش کریں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کو اطمینان ہو گیا۔

ماؤنٹ بیٹن کے سر پر کامیابی کا مزید سہرا یوں بھی چڑھا کہ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو سے نشری تقریر کے لئے نہرو، جناح اور بلدیو سنگھ سے رضامندی لے لی تھی۔ طے یہ ہوا کہ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کے بعد پنڈت نہرو، جناح اور بلدیو سنگھ تقریر کریں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے صبح تک ان کی نشری تقاریر کا مضمون دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ سردار پٹیل جو اب تک کم سخنی پر عمل پیرا تھے، مسکراتے ہوئے بولے کہ قاعدہ تو یہ ہے کہ نشری تقریر ہونے سے پہلے اطلاعات کے معزز رکن کے سامنے پیش کی جائے۔ جناح نے لبوں پر مسکراہٹ لائے بغیر ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ میں اپنی تقریر میں وہی کہوں گا، جو میرے دل کی آواز ہوگی۔

ساڑھے بارہ بجے مہاتما جی تشریف لائے۔ ایک لحاظ سے وہ تمام کارروائیوں میں شریک رہے۔ لیکن تقسیم ملک سے متعلق ان کا رد عمل نہیں معلوم ہو سکا۔ ہر طرف اس بات کا خوف اور اندیشہ پایا جا رہا تھا کہ کہیں وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر صرف پلان کی مخالفت کریں بلکہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف اپنا فیصلہ بھی صادر کر دیں۔

ماؤنٹ بیٹن نے اس انٹرویو کا اضطراب اور بے چینی سے سامنا کیا۔ اس وقت ان کے استعجاب اور بے اطمینانی کا اندازہ لگائے بغیر مہاتما جی نے متعدد استعمال شدہ لفافوں کی پشت پر اور کاغذ کے دوسرے ٹکڑوں پر یہ لکھ کر بتا دیا کہ وہ آج یوم خاموشی منا رہے ہیں۔

جب انٹرویو ختم ہو گیا تو ماؤنٹ بیٹن نے کاغذ کے سارے ٹکڑے جمع کر لئے تاکہ یہ کاغذات بھی ان تاریخی یادگاروں میں اضافے کا سبب بن سکیں۔ ان کاغذ کے ٹکڑوں پر گاندھی جی نے لکھا تھا: "مجھے افسوس ہے کہ میں بات نہیں کر سکتا۔ پیر کا دن خاموشی اختیار کرنے کا جب میں نے فیصلہ کیا تھا تو دو باتیں مستثنیٰ رکھیں۔ اہم معاملات میں یا مریضوں کے ساتھ گفتگو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ

آپ میری خاموشی کو توڑنا نہیں چاہیں گے۔

کیا اپنی تقریروں میں کبھی میں نے ایک لفظ بھی استعمال کیا ہے؟ اگر آپ مانتے ہیں کہ میں نے ایسا کبھی نہیں کیا تو آپ کی وارننگ فضول ہے۔ دو ایک باتیں ایسی بھی ہیں جن پر میں اظہار خیال کروں گا۔ لیکن آج نہیں آئندہ ملاقات میں، اگر ہم ملے۔"

وائسرائے ہاؤس۔ نئی دہلی

منگل ۳ر جون ۱۹۴۷ء

ماؤنٹ بیٹن جناح کے ساتھ اپنی نصف شب کی ڈرامائی ملاقات کی رُوداد بیان کی۔ چونکہ جناح نے صاف صاف انکار کر دیا تھا وہ پلان کے بارے میں تحریری جواب نہیں دیں گے اس لئے گواہ کے طور پر وہ بھی ماؤنٹ بیٹن کے پاس بیٹھ گئے۔ جناح نے وہی کچھ دُہرایا جو صبح کی کانفرنس میں کہہ چکے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اُن پر خاصہ دباؤ ڈالا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اُنہوں نے صرف اتنا یقین دلایا کہ وہ مسلم لیگ کونسل سے پلان کو منظور کرانے میں ہر ممکن آئینی قدم اُٹھائیں گے۔ اُنہوں نے مجلسِ عاملہ کی بھی حمایت کا یقین دلایا۔

ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے کہا کہ کانگریس پارٹی اُن کی اس چال کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ اُنہوں نے جناح کو متنبہ کیا کہ پنڈت نہرو، کرپلانی اور سردار پٹیل صاف صاف کہہ چکے ہیں اگر مسلم لیگ نے ایک ہی وقت میں کانگریس کے ساتھ ساتھ پلان کو منظور نہیں کیا تو ایسی صورت میں وہ پلان مسترد کر دیں گے۔

ماؤنٹ بیٹن کی یہ وارننگ بھی بے اثر ثابت ہوئی۔ اُنہوں نے ایک بار پھر کہا وہ پوری مسلم لیگ کونسل کی اتفاق رائے کے بغیر اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے کا استحقاق نہیں رکھتے۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ چند روز اور وہ کونسل کی میٹنگ طلب نہیں کر سکتے۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے کہا، اگر آپ کا رویہ یہی ہے تو کانگریس پارٹی اور سکھوں کے لیڈر صبح کو آخری منظوری دینے سے انکار کر دیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انتشار پھیل جائے گا اور اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ پاکستان سے ہاتھ دھو لیں گے۔

جناح نے کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ "تو پھر، تو پھر"

ماؤنٹ بیٹن بولے "مسٹر جناح! میں نہیں چاہتا کہ سمجھوتے پر جو کام ہوا ہے آپ اسے انکار کر دیں۔ چونکہ آپ مسلم لیگ کے ارکان سے منظوری لئے بغیر اس پلان کو منظور نہیں کر رہے ہیں، اس لئے میں اُن سے نمٹ لوں گا۔ میں اُن سے یہ کہنے کا خطرہ اپنے سر لوں گا کہ آپ نے جو یقین دلایا تھا، میں اُس سے مطمئن ہوں۔ اگر آپ کی کونسل نے سمجھوتے کی توثیق نہ کی تو اس کا الزام مجھ پر ڈال دیجئے۔ میری صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ جب میں صبح کی میٹنگ میں یہ کہوں کہ مسٹر جناح نے مجھے یہ یقین دلایا ہے اور میں مطمئن ہوں۔ تو آپ کسی حال میں اُس کی تردید نہ کریں، بلکہ جب میں آپ کی طرف دیکھوں تو آپ صرف اثبات میں سر ہلا دیجئے۔" ماؤنٹ بیٹن کا آخری سوال تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اٹیلی کو یہ مشورہ دوں کہ وہ کل اعلان کر سکتے ہیں؟" اس سوال کا جواب اُنہوں نے اثبات میں دیا۔ اس آخری یقین دہانی پر ماؤنٹ بیٹن اور اسمے دونوں نے اطمینان کی سانس لی کہ جناح نے بالواسطہ پلان کو تسلیم کر لیا ہے۔ جناح کے رُخصت ہونے کے فوراً بعد کرپلانی کا مکتوب موصول ہوا۔ ویسے تو بعض شرائط رکھی گئی ہیں لیکن کانگریس کی پوری مجلسِ عاملہ کی طرف سے پلان کی منظوری لے لی گئی ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا کام بخیر و خوبی انجام پا جائے گا۔ لیکن جب ماؤنٹ بیٹن نے روشن مستقبل کی تعمیر کے لئے ماضی کی تلخ باتوں کو دفن کر دینے اور

چھوٹے چھوٹے لیڈروں کو اعتدال پسند بننے کی درخواست کی تو لیاقت علی اپنے جذبات کو نہ روک سکے اور بول اُٹھے کہ چھوٹے لیڈروں سے کہیں زیادہ اُونچے لیڈروں کو اعتدال پسند بننے کی ضرورت ہے۔ اِس سلسلے میں انہوں نے کہا: گاندھی جی کو پرارتھنا کے جلسوں میں دیکھئے۔" اِس فقرے سے پرانی اور دبی ہوئی تلخیاں پھر اُبھر آئیں۔

جناح نے کنایۃً کہا کہ گاندھی جی لوگوں کو من مانی کرنے پر اُبھار رہے ہیں اور ان کو اس کانفرنس کے لیڈروں کی بجائے دوسرے عہدیداروں پر تکیہ کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ اِس پر کرپلانی نے جواب دیا کہ گاندھی کا ہر عمل عدم تشدد کے لئے وقف ہے اور پٹیل نے کہا کہ گاندھی جی کو اس فیصلے سے جو یہاں سے کیا جائے گا، اتفاق ہوگا۔

ماؤنٹ بیٹن نے اس خطرناک بحث و تمحیص کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اِس موضوع پر خاصا اظہارِ خیال ہو چکا ہے۔ اِس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے ڈرامائی انداز سے متحیر لیڈروں کے سامنے تقسیمِ ملک کے انتظامی نتائج کا پلندہ ایک دھماکے کے ساتھ میز پر رکھا۔ یہ دستاویز فل اسکیپ کے ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اب تمام لیڈروں کے سامنے اُن کے سیاسی فیصلے کے حقائق آ گئے تھے۔ اُن کے لئے یہ بڑے جاں گسل اور قیامت خیز لمحے ثابت ہوئے۔ اس بار پھر جنبشِ لب سے رائی کا پہاڑ بن گیا۔ ہوا یہ کہ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز رکھی کہ "کابینہ کے جلسے" میں پیش کرنے سے پہلے کاغذات کو اِدھر اُدھر سے دوبارہ زیرِ غور لایا جائے گا۔

اس پر لیاقت اور جناح نے اعتراضات کئے۔ انہوں نے سمجھا کہ "کابینہ" کا مطلب برطانیہ عظمیٰ کی کابینہ ہے کافی دیر کے بعد یہ واضح ہو سکا کہ جناح اور لیاقت کا کیا مطلب تھا۔ بعد میں جناح نے اپنی غلط فہمی کو تسلیم کر لیا اور کہا کہ "آپ کو کہنا چاہیئے تھا۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو ہر بات کو واضح الفاظ میں بیان کرنا چاہیئے۔" ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ جناح کا ذہن ہمیشہ آہنی اصطلاح سوچا کرتا ہے۔

لیاقت علی نے سوال کیا کہ کیا اِس مسئلے کو تقسیمِ ملک کی بین کمیٹی میں اکثریتی آراء سے حل کیا جائے گا جیسا کہ دستاویز سے ظاہر ہے۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن بولے "نہیں"۔ اِس سلسلے میں جو بھی مناسب قدم ہوگا، اٹھایا جائے گا۔ اب جب کہ تقسیمِ ملک کا مسئلہ حتمی طور پر حل ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے مباحثوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوگا۔

بہرکیف تو طے پایا کہ مسلح افواج کی تقسیم شہریت کی بنیاد پر ہو۔ جناح نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا کہ میں پاکستان میں فرقہ وارانہ اختلافات کو پھولنے پھلنے نہیں دوں گا اور جو لوگ بھی خواہ مذہب کوئی بھی ہو وہاں رہیں گے۔ اُن کو پورے شہری حقوق حاصل ہوں گے۔

ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ میں بھی آل انڈیا ریڈیو گیا۔ چند سکنڈ آوازکی جانچ میں لگے۔ اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے آہستہ آہستہ لفظوں پر زور دے کر تقریر شروع کی۔ اُن کی یہ تقریر اِس تیز و تند اور شعلہ انگیز تقریر سے بالکل مختلف تھی جو کئی محفلوں میں سن چکا ہوں۔ تقریر بے حد جچی تلی اور خطابت سے پُر تھی لیکن کہیں بھی مبالغہ کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔

جناح نے بڑی چابک دستی اور ہوشیاری سے اپنی نیت واضح نہیں کی۔ البتہ اُن کی تقریر سے واضح ہو گیا کہ وہ پلان کو منظور کر چکے ہیں۔ غالباً اِن الفاظ میں پہیلی چھپی ہوئی تھی۔ دولتِ عظمیٰ برطانیہ نے جو پلان پیش کیا ہے اس کا فیصلہ ہم پر ہے کہ ہم اسے سمجھوتے کے طور پر منظور کریں یا تصفیئے کے طور پر۔ نہرو کی تقریر کے آخری الفاظ تھے "جے ہند" اور مسٹر جناح کے تھے "پاکستان زندہ باد"۔ آخری الفاظ انہوں نے اس طرح ادا کئے کہ چند سامعین سن کر چونک پڑے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ قائدِ اعظم نے اپنی عظمت اور شان ہوا میں شامل کرتے ہوئے اس طرح تلفظ ادا کیا　　پاکستان از

اِن دی بیگ"

والسرائے ہاؤس۔ نئی دہلی

۴ر جون۔ ۱۹۴۷ء

ماؤنٹ بیٹن نے حتمی طور پر فیصلہ کرلیا کہ گاندھی جی سے نمٹنے کا وقت آگیا ہے۔ انہیں قدم اُٹھانے سے روکنا ہے۔ چنانچہ پرارتھنا میٹنگ سے تھوڑی دیر پہلے انہیں والسرائے ہاؤس میں مدعو کیا گیا۔ گاندھی جی بہت رنجیدہ اور اُداس تھے۔ کیونکہ پلان کا پہلا اثر اُن کے ذہن پر یہ تھا کہ اُنہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے زندگی بھر جو کچھ بھی کیا، اُس پر پانی پھیر دیا گیا ہے۔

ماؤنٹ بیٹن نے ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے یہ کہا کہ اِس پلان کو ماؤنٹ بیٹن کا نہیں، گاندھی کا پلان سمجھیں، کیونکہ اِس میں پوری دیانت داری کے ساتھ اُن ہی کا تصور پیش کیا گیا ہے، یعنی عدمِ استبداد، حقِ خود اختیاری، دولتِ برطانیہ عظمیٰ کی ہندوستان سے جلد از جلد رُخصت۔ اس کے علاوہ درجۂ نوآبادیات کے بارے میں ان کے ہمدردانہ خیالات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ایک بار اور ماؤنٹ بیٹن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ آج رات گاندھی جی نے پرارتھنا سبھا میں کہا کہ حکومت برطانیہ پر تقسیم ملک کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اِس میں والسرائے کا ہاتھ ذرا بھی نہیں ہے۔ میں بھی تقسیم ملک کا اتنا ہی مخالف ہوں جتنا کانگریس۔ لیکن جب ہم دونوں یعنی ہندو اور مسلمان اِس کے علاوہ کسی اور بات پر متفق الرائے نہیں ہو سکتے تو پھر والسرائے کے لئے اس کے علاوہ اور کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے۔

والسرائے نے درحقیقت مصالحت کرانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہی پلان ایسا تھا جس کی بنیاد پر معاہدہ ہو سکتا تھا والسرائے ملک کو انتشار اور منافرت کی آگ میں جھونک کر رُخصت ہونا نہیں چاہتے تھے۔ گاندھی جی کے دل و دماغ پر ماؤنٹ بیٹن نے جس سُرعت اور برق رفتاری سے فتح پائی، اُس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔!

والسرائے ہاؤس، نئی دہلی

جمعرات ۵ر جون، ۱۹۴۷ء

آج سویرے ماؤنٹ بیٹن نے لیڈروں سے تیسری بار ملاقات کی۔ اس ملاقات میں تقسیم ملک کے انتظامی نتائج پر بحث ہوئی۔ فریقین اس میں اُلجھنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان پر اس کا مطلب واضح نہیں ہوا تھا۔ جناح نے صراحت کرتے ہوئے کہا کہ دونوں مملکتیں ہر اعتبار سے خود مختاری اور مساوی درجے کی مالک ہوں گی۔ نہرو اس بات پر بضد رہے کہ انڈیا پہلے کی طرح ایک حیثیت کا مالک ہے اور پاکستان اُن صوبوں کی رضامندی کا نتیجہ ہے جن کو اپنا رشتہ منقطع کرنے کا حق ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کے کام میں خارجی پالیسی کے تواتر میں کسی طرح کی مداخلت برداشت نہیں کی جائے گی۔ طعن و تشنیع کی اِس فضا میں ماؤنٹ بیٹن نے واضح کر دیا کہ ہر متنازعہ فیہ معاملے میں فریقین کی، اس درخواست کو کہ میں ثالث بنوں، منظور نہیں کر سکتا۔ دونوں فریق اس بات پر رضامند ہو گئے کہ کسی ایسے ثالث کی خدمات لی جائیں جو دونوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ پلان دو دن پُرانا ہو چکا ہے اور اس کی وجہ سے ملک بھر کی کشیدہ فضا صاف ہو گئی ہے لیکن دہلی میں جو لیڈران موجود ہیں ان کے دلوں میں بھائی چارہ کا چراغ نہیں جل سکا۔ یہاں کی صورتِ حال اب نازک ہے اور اس حد تک نازک ہے کہ ادنیٰ اور معمولی سا واقعہ بھی بہت بڑے بحران کا سبب بن سکتا ہے۔

والسرائے ہاؤس، دہلی

پیر ۹ر جون، ۱۹۴۷ء

آج امپیریل ہوٹل کی پہلی منزل کے بال روم میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جلسہ ہوا۔ کارروائی ختم ہونے کو تھی کہ خاکساروں نے ہوٹل میں ہلّہ بول دیا۔ یہ سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ خاکسار باغیچے کی طرف سے داخل ہوئے تھے۔ جب یہ بیلچے اُٹھائے لان کی طرف بڑھے تو پُرسکون فضا میں گھبراہٹ اور دہشت پھیل گئی۔ یہ لوگ "جناح کو نکالو" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے بال روم جانے والی زینے چڑھنا طے کر چکے تھے کہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ نے اُن کو گرفت میں لے لیا اور باہر نکال دیا۔ پولیس طلب کی گئی اور اشک آور گیس استعمال کر کے خلفشار کو روکا گیا۔

وائسرائے ہاؤس۔ نئی دہلی

منگل ۱۰ رجون ۱۹۴۷ء

مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد منظور کی ہے، جو کانگریس کو مشتعل کرنے کے لئے کافی ہے۔ قرارداد میں کیبنٹ مشن پلان کو ختم کر دیئے جانے پر اطمینان کی سانس لی گئی اور ۳ رجون کے پلان کو از سرِنو زیرِ غور لانے پر زور دیا کہ وہ پلان کے بنیادی اصول کو سمجھوتہ کی شکل میں تسلیم کر لیں۔ آج کی اسٹاف میٹنگ میں درجۂ نوآبادیات اور دونوں ملکوں کے لئے مشترکہ گورنر جنرل کا سوال پھر زیرِ غور آیا۔

جناح نے اِس سلسلہ میں نہ تو کوئی اشارہ کیا اور نہ کچھ کہا ہے۔ بحث و تمحیص کے دَوران ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ جون ۱۹۴۸ء کی مدت کے بارے میں نہرو کا ذہن بہت حد تک پراگندہ اور ابتر نظر آرہا ہے۔ حالانکہ نہرو اِس مدت سے پہلے ہی نئے دستور کو تکمیل تک پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں، بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر دستور کا کام وقت سے پہلے مکمل نہ ہوا تو کانگریس کے وقار کو دھچکا لگنے کا احتمال ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ جون ۱۹۴۷ء کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔

وائسرائے ہاؤس۔ نئی دہلی

پیر ۲۳ رجون ۱۹۴۷ء

ماؤنٹ بیٹن نے جب کشمیر کا دَورہ کیا تو اُن پر منکشف ہوگیا کہ ریاستیں کس بُحران سے گذر رہی ہیں۔ وہ اپنا دورہ ختم کر کے آج ہی لَوٹے ہیں۔ پنڈت نہرو اور گاندھی جی کو کسی حال میں یہ گوارا نہیں کہ مہاراجہ خود مختاری کا اعلان کر دیں۔ پنڈت نہرو خود کشمیر کے برہمن نژاد ہیں اور وہ اپنے دوست شیخ عبداللہ کو مہاراجہ کی قید سے آزاد کرانے کے لئے کشمیر کا دورہ کرنا چاہتے ہیں۔ گذشتہ سال جب وہ کشمیر تشریف لے گئے تو حکومتِ کشمیر نے انہیں سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔ گاندھی جی چاہتے ہیں کہ وہ خود نہرو کے دورۂ کشمیر کے سلسلے میں راستہ ہموار کریں لیکن مہاراجہ نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ وہ کسی کی بات سُننا نہیں چاہتے۔

ماؤنٹ بیٹن نے بھی اس مجوّزہ دورے سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ وہ پہلے خود مہاراجہ سے ملاقات کریں گے۔ کیونکہ بہت پہلے مہاراجہ نے انہیں دورۂ کشمیر کی دعوت دی تھی اور ماؤنٹ جب کشمیر گئے تو انہوں نے مہاراجہ کو سیاسی اعتبار سے الگ تھلگ پایا۔ باتیں اُس وقت ہوتیں جب دونوں کار میں بیٹھے سیر و تفریح کو نکلتے۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے ان ہی موقعوں سے فائدہ اُٹھایا اور انہوں نے مہاراجہ اور ان کے وزیرِ اعظم پنڈت کاک کو مجبور کیا کہ وہ خود مختاری کا اعلان نہ کریں، بلکہ جہاں تک ہو سکے عوام کی رائے معلوم کریں۔

ماؤنٹ بیٹن نے پہلے یہ سوچا تھا کہ وہ مشورہ مہاراجہ کو تخلیہ میں دیں گے اور بعد میں یہی مشورہ وزیرِ اعظم کی موجودگی میں بھی دُہرائیں گے تاکہ روئداد قلم بند کر لی جائے۔

مہاراجہ نے تجویز پیش کی کہ ملاقات کا انتظام دورے کے آخری دن کیا جائے جس کو ماؤنٹ بیٹن نے منظور کر لیا۔ کیونکہ اُن کے خیال میں مہاراجہ کو سوچ بچار کے لئے کافی وقت مل جائے گا اور وہ اس وقت کسی فیصلے پر پہنچ سکیں گے۔ لیکن جب ملاقات کا دن آیا تو مہاراجہ نے معذرت نامہ بھیجدیا کہ وہ دردِ شکم میں مُبتلا ہیں لہذا ملاقات ممکن نہیں۔ معلوم ہوا کہ جب بھی انہیں کسی مشکل اور کٹھن موضوع پر مذاکرہ کرنا ہوتا ہے وہ اپنی علالت کا حیلہ تراش لیتے ہیں۔ یہ قدرتی امر ہے کہ اس واقعہ سے ماؤنٹ بیٹن کو سخت مایوسی ہوئی۔

وائسرائے ہاؤس۔ نئی دہلی

جمعہ ۲۷ر جون ۱۹۴۷ء

اب جب کہ پنجاب اور بنگال نے اپنی اپنی تقسیم کا اعلان کر دیا ہے، نتیجہ کے طور پر دونوں صوبوں کا نصف حصّہ دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کا کام بھی شروع کر دے گا۔ تقسیم کی کمیٹی جو عارضی حکومت کے کانگریسی اور مسلم لیگی ممبران تک محدود تھی اب تقسیم کی کونسل میں بدل گئی۔ اس کے اختیارات وسیع کر دیے گئے اور جناح کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اب یہی کونسل آخری اور حتمی فیصلوں تک پہنچے گی۔

نئی کونسل کا اجلاس پہلی بار آج ماؤنٹ بیٹن کی صدارت میں شروع ہوا لیکن انہوں نے حسبِ معمول ثالثی عہدہ منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اب انہیں کوئی ثالث بننے پر مجبور نہیں کرے گا کیوں کہ جناح کی اس تجویز کو کہ بنگال اور پنجاب کی حد بندی کے پریشان کُن مسئلے کو اقوامِ متحدہ کے سُپرد کر دیا جائے۔ لیکن نہرو نے ان اسباب کی بنا پر مخالفت کی کہ اس طرح مسئلے کے حل میں غیر معمولی تاخیر ہو جائے گی۔ ہر کمیشن میں ریڈ کلف کے ساتھ ہائی کورٹ کے چار جج ہوں گے یعنی دو کانگریس کے نامزد اور دو مسلم لیگ کے۔ اس سلسلے میں فیصلہ جو بھی ہوگا، اس کی ذمہ داری سراسر ریڈ کلف پر عائد ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ ماؤنٹ بیٹن ان ایوارڈوں یا آئندہ کسی ایوارڈ میں خود کو شامل نہیں کریں گے۔

وائسرائے ہاؤس۔ نئی دہلی

ہفتہ ۲۸ر جون ۱۹۴۷ء

آج ماؤنٹ بیٹن کے نام جناح کا مکتوب موصول ہوا۔ اِس کو پڑھ کر آپسے کا ردِّ عمل خلافِ معمول شدید ہوا۔ اُنہوں نے کہا۔ "اگر بادشاہِ معظم مجھے ایسے مکتوب بھیجتے تو میں قبول نہ کرتا اور نہ ہی ایسا مکتوب میں اپنے خادم کو تحریر کر سکتا ہوں۔"

وائسرائے ہاؤس۔ نئی دہلی

پیر ۳۰ر جون ۱۹۴۷ء

مُسلّح افواج کی تقسیم کا بُنیادی اصول یہ منظور کیا گیا کہ انڈیا اور پاکستان کے اپنے اپنے علاقوں میں مُسلّح افواج ہوں گی اور ۱۵ر اگست سے یہ دونوں مملکتیں سیاہ و سفید کی مالک ہوں گی۔ طرفین نے اِس شرط پر کافی زور دیا کہ جب تک مکمل عسکری آزادی نہیں ملے گی، تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ جناح اور لیاقت علی خاں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اپنی مسلّح افواج کے بغیر وہ زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں نہیں لیں گے۔

وائسرائے ہاؤس، نئی دہلی

منگل یکم جولائی ۱۹۴۷ء

۱۵ر اگست کے نازک لمحے جوں جوں قریب آ رہے ہیں، پنجاب کی فضا زہر آلود ہوتی جا رہی ہے۔

جنکنس نے اطلاع دی ہے کہ لاہور اور امرتسر کے حالات تشویش ناک ہوگئے ہیں۔ تشدد کے شعلے جگہ جگہ بھڑک رہے ہیں۔ پولیس یا فوجی مداخلت اس نوع کے واقعات پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہندوستانی شہروں کو نذرِ آتش کردینا کتنا سہل کام ہوگیا ہے۔ یہ آتش زدگیاں خطرناک رجحانات کا پتہ دے رہی ہیں۔ کھڑکیوں، چھتوں اور تنگ گلیوں سے دستی بم پھینکنے والوں کو پکڑنا ناممکن بن گیا ہے۔

والسرائے ہاؤس۔ نئی دہلی

بدھ ۲ر جولائی ۱۹۴۷ء

صبح کے ساڑھے نو بجے اسمے کی قیام گاہ پر ماؤنٹ بیٹن کے اسٹاف کا ہنگامی جلسہ ہوا۔ کافی غور وخوض کے بعد اس بات پر ہم سب متفق ہوئے کہ اِن حالات کے پیشِ نظر ماؤنٹ بیٹن کو کانگریس کی غیر مشروط پیشکش قبول کرلینی چاہئے ہمارے سامنے اب تین راہیں کھلی ہوئی تھیں۔

۱۔ جناح سے اس بات پر اتفاق کرنا کہ وہ پاکستان کے گورنر جنرل ہوں اور ماؤنٹ بیٹن صرف انڈیا کے گورنر جنرل بن کر رہیں۔

۲۔ جناح سے اس بات پر اتفاق کرنا کہ وہ پاکستان کے گورنر جنرل ہوں اور کانگریس کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ ماؤنٹ بیٹن کے علاوہ انڈیا کے گورنر جنرل کے لئے کسی اور کو نامزد کیا جائے۔

۳۔ ایسے فارمولے کی تشکیل کرنا کہ ماؤنٹ بیٹن دونوں مملکتوں کے مشترکہ گورنر جنرل ہوں۔

لندن منگل ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء

دونوں ایوانوں میں مذاکرے سے پہلے میں نے کلیمنٹ ڈیوس اور لارڈ سیموئل سے طویل گفتگو کی اور انہیں بتایا کہ مارچ سے واقعات کس تیزی سے بدل رہے ہیں۔ آج جب دارالامرا میں بل پر دوسری بار خواندگی ہوئی تو لارڈ سیموئل کی تقریر نے سبھوں کو متاثر کیا۔ وہ لوگ جو ہندوستان میں انگریزی راج کو برقرار رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، آج اُن زبانوں سے خدا حافظ سُنا گیا، وہ اپنی شان وشوکت اور جاہ وجلال سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ سیموئل نے بڑے دُکھ کے ساتھ کہا کہ ہم شکست سے دوچار نہیں ہیں بلکہ ہم تکمیلِ وعدہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے گلاڈ اسٹون کی وہ بات یاد دلائی جب "ملکۂ ہند" کے تصورات اور خطاب کی انہوں نے سختی سے مخالفت کی تھی۔ سیموئل نے بل کا ذکر ان یادگاری لفظوں میں کیا: "تاریخ میں ایسے واقعے کی مثال نہیں ملتی۔ یہ جنگ اور خونریزی کے بغیر امن وامان کا ایک معاہدہ ہے۔"

دارالعوام کا مذاکرہ بھی کم دلچسپ نہ تھا۔ اس میں لیبر پارٹی کے عقبی نشست والے اراکین نے تقسیم کو نہ صرف منظور بلکہ اسے خوش آمدید کہا۔

والسرائے ہاؤس نئی دہلی

منگل ۲۲ر جون ۱۹۴۷ء

ماؤنٹ بیٹن نے عارضی حکومت کی از سرِ نو تنظیم کی ہے۔ اب ہندوستان اور پاکستان کے الگ الگ انتظامیہ کا ڈھانچہ بنایا گیا ہے۔ دونوں کو اپنے اپنے کام سے مطلب ہوگا۔ البتہ مشترک مسائل میں دونوں ایک دوسرے سے مشورہ کریں گے۔ [illegible] یہ نتیجہ پہنچا کہ اس کے ارکان کو الگ نہیں ہونا پڑا۔

[illegible] اور متعلقہ افسران کے لئے کمالِ دُور اندیشی اور [illegible]

ایسا کلینڈر بنایا تھا جس میں صرف دن اور مہینہ درج تھا اور اُس کے نیچے جلی حروف میں تحریر تھا۔ انتقالِ اختیارات کو اب اتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ ایچ ایم پاٹل اور چودھری محمد علی ابتدائی کام حیرت انگیز طور پر انجام دے رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۵ر جولائی کی میٹنگ میں ایسے سات ایٹم جو حد درجہ پیچیدہ مشکل اور نزاعی تھے، ۲۵ منٹ کے اندر اندر نمٹا لئے گئے۔ پارٹیشن کونسل بھی بلا ناغہ ہفتے میں تین بار ملا کرتی ہے۔

والئسرائے ہاؤس، نئی دہلی

جمعہ ۲۵ر جولائی ۱۹۴۷ء

والیانِ ریاست سے ماؤنٹ بیٹن کی آج پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اِس کے بعد نہ تو وائسرائے اور نہ ہی دولتِ برطانیہ کا کوئی نمائندہ اُن سے خطاب کرے گا۔ یہ کوئی رسمی مسرت کا پیغام نہ تھا۔ والیانِ ریاست واقعات کے معرکے سے شکست خوردہ ہو چکے ہیں اور اُن کے دلوں میں غیر یقینی کے غبار بیٹھ گئے ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن بھی ان کو کسی قسم کا سہارا نہیں دے سکتے۔ وہ مجبور ہیں کیونکہ لندن سے انہیں اس بارے میں کوئی ہدایت موصول نہیں ہوئی ہے۔ جون کے پلان اور کیبنٹ مشن پلان میں اس کا مختصر سا ذکر ہے۔ اصل انتقال اختیارات تو برطانیہ اور برطانوی ہند کے مابین ہونا ہے۔

وائسرائے ہاؤس، نئی دہلی

جمعہ یکم اگست ۱۹۴۷ء

آج قصرِ وائسرائے میں جن چند سربرآوردہ اور ممتاز والیانِ ریاست کو مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے اس کی تفصیل بتائی گئی یہ والیانِ ریاست اسنادِ الحاق سے متعلق کوئی فیصلہ کن قدم نہیں اُٹھا سکے۔ کسی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کسی نے نفی میں۔ پٹیالہ اور بیکانیر کے مہاراجے نفی والی لابی میں جا کر بیٹھ گئے اور وہاں سے قہقہوں کا شور بلند ہوا۔

حیدر آباد اور کشمیر کے علاوہ جن کے مسائل مخصوص نوعیت کے ہیں، دوسری ریاستوں پر ماؤنٹ بیٹن کے مشورے کا خوشگوار ردِ عمل ہوا۔ صرف دو یا تین والیانِ ریاست اس خیال میں ہیں کہ الحاق کی مخالفت میں اُن کو فائدہ پہنچے گا۔ ماؤنٹ بیٹن کے دوست یعنی نواب آف بھوپال کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ اگر انہیں موقع ملا تو پاکستان کی اعلیٰ سیاست میں اہم کردار ادا کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے جب وہ جناح کے قریب ترین مشیروں میں رہ چکے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ ان کی ریاست میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اور وہ ہندوستان کے قلب میں واقع ہے۔

وائسرائے ہاؤس، نئی دہلی

اتوار ۳ر اگست ۱۹۴۷ء

انتقالِ اختیارات کے دن جوں جوں قریب آرہے ہیں، ماؤنٹ بیٹن اور ان کے اسٹاف کے شانوں پر ذمہ داریوں کا بار بڑھتا جا رہا ہے۔ تعلقاتِ عامہ اور پریس کے مسائل سے میں خود دوچار ہوں۔ اطلاعات کے مرکزی دفتر کو مصروف رکھنے میں مجھے بہت سے فیصلے لینے ہیں۔ کراچی اور دہلی میں رسوم کی ادائیگی کے لئے منصوبہ تیار کرنا ہے۔ جناح نے ۱۳ر اگست کو کراچی میں ماؤنٹ بیٹن کے حقِ تقدم کے سلسلے میں مشکلات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اُن پر واضح کر دیا گیا ہے کہ ہز ایکسی لینسی کا درجہ وائسرائے کی حیثیت سے ہوگا۔ لہٰذا دستور ساز اسمبلی کے جلسۂ خصوصی میں جناح کے بعد بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وائسرائے ہاؤس، نئی دہلی

پیر ۴؍اگست ۱۹۴۷ء

دہلی میں یومِ آزادی کے موقع پر جو انتظامات کئے جا رہے ہیں میں نے وہ منصوبہ دیکھا لیکن میرے خیال میں انتظامات میں برطانوی جاہ و جلال کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ چنانچہ میں دہلی کے کمشنر مسٹر خورشید سے ملا اور اُن ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ پرانی دہلی کے روشن آرا کلب میں میونسپلٹی کی طرف سے تقریباً پانچ ہزار بچوں کو پارٹی دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔ کیوں کہ ماؤنٹ بیٹن اس فضا سے خوب لطف اندوز ہوں گے۔ اس قسم کے نشاط انگیز لمحوں میں ہندوستانی اپنی بے پناہ مسرتوں کا اظہار بچوں کا منہ میٹھا کر کے کرتے آئے ہیں۔

وائسرائے ہاؤس، نئی دہلی

ہفتہ ۹؍اگست ۱۹۴۷ء

آج اسٹاف میٹنگ میں پنجاب کے بحران پر جم کر مذاکرات ہوئے۔ جنکنس کی اس رپورٹ کے علاوہ کہ حد بندی سے علاقے کی حالت بے حد نازک ہو گئی ہے اور مزید ہوائی اور بری فوجوں کی کمک کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔

ماؤنٹ بیٹن کے سامنے تعلقاتِ عامہ کا اہم مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا ہے جس کا تعلق براہِ راست اعتمادِ نفس اور نظم و نسق سے ہے۔

یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ ریڈکلف پنجاب حد بندی کمیشن کا ایوارڈ آج شام تک وائسرائے کے حوالے کر دیں گے۔

ریڈکلف سے نہ ہندو خوش تھے نہ مسلمان۔ اس لئے جب بھی کوئی مشورہ کرنا ہوتا وہ اپنی ذات سے کرتے لیکن ایوارڈ کی اشاعت کی ذمہ داری وائسرائے پر ڈال دی گئی۔ ماؤنٹ بیٹن کی ابتدا ہی سے یہ ہدایت تھی کہ اُن کا اسٹاف ریڈکلف سے کسی نوعیت کا بھی رابطہ پیدا نہ کرے، اس لئے ہمیں قطعی علم نہیں کہ حد بندی کمیشن کے ایوارڈ میں انہیں کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی۔

اشاعت کے بارے میں مختلف خیالات پیش کئے گئے۔ جہاں تک انتظامی امور کا تعلق ہے یہ رائے پیش کی گئی کہ اگر جلد از جلد ایوارڈ کا اعلان کیا جاتا ہے تو اس سے جنکنس کو فائدہ پہنچے گا اور انتقالِ اختیارات سے کچھ پہلے ہی اثر زدہ علاقوں میں فوجوں کی نقل و حرکت شروع کر دی جائے۔ ایک خیال یہ بھی پیش کیا گیا کہ ایوارڈ بہرحال ہنگامے کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ لہٰذا اس کی اشاعت ۱۴؍اگست ہی کو کی جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔۔۔ اگر اس مسئلے میں میری رائے پوچھی جائے تو میں کہوں گا کہ یومِ آزادی تک اس کو التوا میں رکھا جائے کیونکہ نفسیاتی اعتبار سے دونوں مملکتوں کے اندر اس کی وجہ سے غم و اندوہ کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی وجہ سے بھی غم و اندوہ میں یومِ آزادی کی مسرتیں بدل جائیں۔

ماؤنٹ بیٹن کے خیال سے میں نہ صرف اتفاق کرتا ہوں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر یومِ آزادی کے موقع پر ریڈکلف ایوارڈ کو پیش کیا گیا تو ہندو، مسلم اور سکھوں کی آزادی کے لئے اب تک جو کچھ کیا گیا ہے اُس پر پانی پھر جائے گا۔ ماؤنٹ بیٹن اپنی خوشی و مسرت کو مجروح کرنا نہیں چاہتے۔ آج کی میٹنگ میں ہم آخری فیصلے تک نہیں پہنچ سکے، البتہ ماؤنٹ بیٹن کا اعلان ایوان وائسرائے سے کمیونکوں کی صورت میں کرنے کی بجائے غیر معمولی گزٹ میں کر دیا جائے۔

وائسرائے ہاؤس، نئی دہلی

منگل ۱۲؍اگست ۱۹۴۷ء

پہلا وارننگ کو تین دن گذر گئے ہیں اور ایوارڈ کا مسودہ تیار نہیں ہوا ہے۔ آج سہ پہر کو ہماری جو سترہویں اور غالباً آخری اسٹاف میٹنگ ہوئی اُس میں ماؤنٹ بیٹن نے مجھ سے اور جون کرسٹی سے کہا کہ ہم دونوں ریڈکلف سے مل کر معلوم کریں کہ آخر ایوارڈ وائسرائے کے ہاتھوں میں کب تک آ جائے گا۔ چنانچہ ہم دونوں فوراً ان کی قیام گاہ کیٹلر ہاؤس پہنچے۔

اُس وقت وہ ڈنر کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ پنجاب اور بنگال کے ایوارڈ تو تیار ہیں لیکن سلہٹ کا ایوارڈ ابھی تک ہنوز تیار نہیں ہوا۔ وہاں سے ہم خود وائسرائے ہاؤس آگئے اور ماؤنٹ بیٹن کو حالات سے آگاہ کر دیا۔ یہ سُن کر انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

گورنمنٹ ہاؤس، کراچی
بُدھ ۱۳ر اگست ۱۹۴۷ء

ماؤنٹ بیٹن آج سویرے کراچی پہنچ گئے۔ وہ یہاں متحدہ برطانوی ہند کے وائسرائے کی حیثیت سے آخری سرکاری فرائض انجام دیں گے۔ وہ اپنے ساتھ نئی مملکتِ پاکستان کے لئے جب کہ اُس کا پرچم ستارہ و ہلال ہوا کے دوش پر لہرائے گا —— ہی اور برطانیہ کی طرف سے پیغاماتِ تہنیت بھی لائے ہیں۔ ہم اپنے طیارے سے اترے ہی تھے کہ سندھ کے منتخب گورنر ہدایت اللہ نے ماؤنٹ بیٹن اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کو خوش آمدید کہا۔

یہاں بھی حسبِ دستور فوٹو گرافر اپنے کیمروں کے ساتھ تیار کھڑے تھے۔ جب وہ گورنمنٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہوئے تو مسٹر جناح کے ملٹری سکریٹری کرنل برنی نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا: "مجھے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ کل سرکاری تقریبات میں مسٹر جناح پر بم سے حملہ کیا جائے گا، لہٰذا اس شرانگیز منصوبے کے پیشِ نظر اس بات پر غور و خوض کیا جا رہا ہے کہ آیا جلوس کی رسم کو منقطع کر دیا جائے، یا پھر جن سڑکوں پر سے جلوس گذرنا ہے ان کی بجائے دوسری سڑکوں کا انتخاب کیا جائے۔ کرنل برنی نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ بھی بتایا کہ مسٹر جناح نے اس کا فیصلہ ماؤنٹ بیٹن پر چھوڑ دیا ہے۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا کہ پہلے جو انتظامات کر لئے گئے ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

مسٹر جناح اور مس جناح ہال کے باہر ماؤنٹ بیٹن کے لئے چشم براہ تھے۔ ہال کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سامنے ہالی وُڈ کا فلم سیٹ ہو۔ چاروں طرف روشنیوں کے فوّاروں سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ایک طرف جھاڑ فانوس بھی لٹک رہے تھے۔ حکومتِ پاکستان کے انفارمیشن آفیسر کرنل مجید ملک سے میں نے پیلیس ہوٹل میں ملاقات کی۔ وہیں چند اور غیر ملکی صحافیوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ یہ صحافی کراچی کی اب تک کی کارروائی سے خوش نہ تھے۔ بعض صحافیوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ مسٹر جناح نے ہوائی اڈے پر بہ نفسِ نفیس خیر مقدم نہ کر کے اُن کی توہین کی ہے۔ لیکن فوراً میں نے یہ کہہ کر اُن کے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی کہ ماؤنٹ کی زبان سے تو میں نے یہ شکایت نہیں سنی۔

ڈنر کے بعد ہم استقبالیہ میں شریک ہو گئے۔ مشروبات کے علاوہ ہلکی ہلکی موسیقی کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ سارے مہمان بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن مسٹر جناح کو میں نے بالکل الگ تھلگ پایا، جس کی وجہ سے اِس تاریخی لمحے میں اُداسی پھیل گئی۔ وہ اچکن اور پاجامے میں ملبوس تھے اور چاندی جیسے بال چمک رہے تھے۔ انہوں نے چند ہی مہمانوں کو اپنے تکلم سے نوازا۔ میں اِس بات کو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ شخص جس کو اتنی عظیم الشان سیاسی فتح نصیب ہوئی ہو اور اتنی بڑی قوم کا خالق ہو، اپنے پیروکاروں کے ہجوم میں یکّہ و تنہا نظر آئے گا۔ انہیں اس طرح تنہا پا کر میں اُن کے قریب گیا اور کچھ دیر تک ان کے ساتھ محوِ تکلم رہا۔ مبارکباد دینے کے لئے مناسب اور موزوں الفاظ کی تلاش میں تھا لیکن ان کو مختلف خیالات میں غلطاں دیکھ کر الفاظ ذہن کے پردے کے پیچھے ہی رہ گئے۔

گورنمنٹ ہاؤس کراچی ۔ جمعرات ۔ جمعہ
گورنمنٹ ہاؤس نئی دہلی ۔ ۱۴ر اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء

آج سویرے دستور ساز اسمبلی میں رسوم انجام دی جانے والی تھیں۔ اُن میں شرکت کے لئے ہم علی الصباح بستر سے اُٹھے۔ مسٹر جناح اور ماؤنٹ بیٹن کی تشریف آوری سے نصف ساعت قبل میں پہنچ گیا۔ ایسے موقعوں پر جو چہل پہل اور مسرت و انبساط نظر آنی چاہیئے وہ مفقود تھی۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پارلیمنٹ کا اجلاس ہونے والا ہے۔ البتہ اسمبلی کے سامنے والی زمین پر جو نصف دائرہ نما چبوترہ ہے اس کی ایک ایک انچ جگہ پُر ہو گئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا استقبال انتہائی جوش و خروش سے کیا گیا جس تزک و احتشام سے مسٹر جناح اور مس جناح کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔

مسٹر جناح اور ماؤنٹ بیٹن کی تقریریں اپنی اثر آفرینی کے لحاظ سے بے مثال تھیں۔ مسٹر جناح تقریر ختم کرکے بیٹھے ہی تھے کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے ازراہِ محبت و شفقت مس جناح کا ہاتھ دبا دیا۔ کارروائی ایک گھنٹے کے اندر اندر ختم ہو گئی۔ مسٹر جناح اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا جلوس ایک ساتھ بڑے طمطراق سے نکلا۔ پاکستان کے خوش پوش ملاؤں اور خوش و خرم بچوں کے علاوہ عوام بہت کم نظر آئے۔ جوں ہی دو عظیم شخصیتوں کی پُر وقار سواری گورنمنٹ ہاؤس کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو مسٹر جناح نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے جذبات آگیں لہجے میں کہا کہ:

"خدا کا شکر ہے میں آپ کو زندہ و سلامت واپس لے آیا۔"

دوپہر ہوتے ہوتے معزز مہمان سب کو خدا حافظ کہنے لگے۔ مس جناح لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے بغلگیر ہوئیں اور مسٹر جناح نے شدتِ جذبات سے بے اختیار ہو کر اپنی مستحکم اور دائمی دوستی کا یقین دلایا۔

پاکستان سے واپسی پر جب ہمارا جہاز پنجاب کی سرحد عبور کر رہا تھا تو ہم کو آگ کے بڑے بڑے شعلے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نظر آئے، جو بستیوں اور قصبوں کو خاکستر کر رہے تھے۔ دھوئیں اور آگ کی ہم آہنگی نے عجیب ہیبت ناک اور کراہت آمیز منظر پیدا کر دیا تھا۔

جیسے ہی ہمارا طیارہ نئی دہلی کے ہوائی اڈے پر اُترا، میں نہ ختم ہونے والی مصروفیت میں مشغول ہو گیا۔ فوٹو گرافروں سے ریہرسل کرانا، وزارتِ اطلاعات سے رابطہ قائم کرنا، دعوت ناموں کی تقسیم، ملکی اور غیر ملکی اخباری نامہ نگاروں کو مطمئن کرنا میرے فرائض میں شامل تھا۔

کئی روز سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا عملہ مسلسل دن رات کام کر رہا تھا۔ آدھی رات سے کچھ دیر قبل وائسرائے کی جانب سے اسٹیٹ سیکریٹری کو رسمی تار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وائسرائے کے عملہ کا کام ختم ہو گیا۔

۱۴ اگست کو دن ہی میں قومی اسمبلی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو آزاد ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل بنانے کی تجویز پاس ہو چکی تھی۔ اب راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرنے کا رسمی دعوت نامہ لے کر آنے والے تھے۔ ۱۲ بج کر ۴۵ منٹ پر اُن کی آمد متوقع تھی۔ ٹھیک وقت پر اخباری نامہ نگار آنے شروع ہو گئے۔ انہوں نے مطلع کیا کہ وائسرائے ہاؤس کو آنے والے تمام راستے کثرتِ ہجوم کی وجہ سے بند ہو گئے ہیں اس لئے پنڈت نہرو اور راجندر پرشاد شاید وقت پر نہ آ سکیں۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ وقت مقررہ کے چند منٹ بعد ہی راجندر پرشاد اور پنڈت نہرو آ گئے۔ ایک ساتھ فوٹو گرافروں نے بٹن دبا کر ہال کو جگمگا دیا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور راجندر پرشاد آمنے سامنے کھڑے ہوئے اور پنڈت نہرو ان دونوں کے درمیان۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ڈیسک سے ٹکے ہوئے کھڑے تھے۔ راجندر پرشاد نے رسمی دعوت دینی شروع کی، مگر وہ درمیان میں

چلے جُھول گئے۔ تب پنڈت نہرو نے اُن کی مدد کی۔ اُنہوں نے دعوت دیتے ہوئے کہا کہ "قومی اسمبلی نے حلف اُٹھا لیا ہے۔ میں ممبرانِ اسمبلی اور قومی لیڈرانِ وطن کی جانب سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ہندوستان کے گورنر جنرل بننا قبول کرلیں۔" لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جوابی تقریر میں شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس عزت افزائی کے لئے، آپ کا شکر گذار ہوں۔ میں آئین کے مطابق اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کروں گا۔" تقاریر کے بعد پنڈت نہرو نے ایک بڑا سا لفافہ پیش کرتے ہوئے رسمی الفاظ ادا کئے اور کہا:

"کیا میں آپ کی خدمت میں نو تشکیل شدہ کابینہ کے نام پیش کرنے کا شرف حاصل کر سکتا ہوں"؟ گو اِس تمام تقریب کے عمل میں دس منٹ لگے، مگر میں نے اِس تقریب میں عظیم فاتحانہ پریڈوں اور تقاریب سے زیادہ انسانیت سرگرمی اور جوش پایا۔

اب میں اور لارڈ ماؤنٹ اسٹیڈی رُوم میں تنہا تھے۔ اُنہوں نے شاید اپنے تجسس کو دُور کرنے یا چند گھنٹوں بعد حلف لینے والی کابینہ کے وزراء کے ناموں سے صحیح طور پر واقف ہونے کے لئے پنڈت نہرو کا پیش کردہ لفافہ کھولا۔

مگر یہ کیا لفافہ بالکل خالی تھا۔

۱۵ راگست۔ گورنمنٹ ہاؤس، نئی دہلی

صبح ۸ بج کر ۳۰ منٹ پر سُرخ اور سُنہری وردی میں ملبوس نقیبوں نے نوبت بجا کر آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کی آمد کا اعلان بالکل اِسی انداز سے کیا جس طرح لارڈ ماؤنٹ سے قبل کے بیس والسرائوں کی آمد کا اعلان کر چکے تھے۔ چند ہی لمحوں بعد آزاد ہندوستان کے پہلے چیف جسٹس ڈاکٹر کنہیا نے ارل لارڈ ماؤنٹ بیٹن آف برما کو ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف دلایا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے بیٹھنے کے لئے نقرئی مسندیں رکھی گئی تھیں۔ مسندوں پر گہرے سُرخ اور اُودے رنگ کے فانوس جل رہے تھے۔ مسند کے چاروں طرف سُنہرے قالین بچھے ہوئے تھے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے بھی سُنہری رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جیسے ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن مسند پر بیٹھے، ہال میں ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ کسی فوٹو گرافر کے کیمرے کا فلیش بلب اچانک پھٹ گیا تھا۔ سارا پروگرام بڑے پُر تکلف انداز سے عمل میں آیا۔ پروگرام کے اختتام پر انگلینڈ کا قومی ترانہ "خدا بادشاہ کو سلامت رکھے" اور ہندوستان کا قومی ترانہ "جن گن من" بجایا گیا۔

گورنمنٹ ہاؤس سے میں ایک مختصر راستے کے ذریعے فوراً کونسل ہال پہنچا۔ یہاں بھی کثیر تعداد میں لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد سرکاری مہمانوں کا بھی صدر دروازے سے داخل ہونا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ صورتِ حال بہت خراب ہو گئی۔ ڈھائی تین لاکھ کا مجمع اس قدر پُرجوش لگتا تھا کہ ابھی کونسل ہاؤس کے پرخچے اُڑا دے گا۔ اِس وقت پنڈت نہرو اور دوسرے چوٹی کے لیڈروں کو چیمبر سے باہر بُلایا گیا۔ اُنہوں نے آکر مجمع کو کنٹرول کیا تب کہیں جاکر سرکاری مہمان اندر داخل ہو سکے۔ تھوڑی دیر بعد گورنر جنرل کی بھی سواری آگئی۔ اسمبلی کے اندر کا ماحول بڑا پُر اسرار اور سنجیدہ تھا۔ سب سے پہلے راجندر پرشاد نے ساری دنیا سے آئے ہوئے مبارکبادی کے پیغامات پڑھ کر سُنائے۔ اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اسمبلی سے خطاب کیا۔ سب سے پہلے اُنہوں نے بادشاہ انگلستان کا پیغام مبارکبادی ممبرانِ اسمبلی کو پڑھ کر سُنایا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے اپنی طویل تقریر شروع کی۔ انہوں نے نہرو اور پٹیل کی راہنمائی پر اعتماد کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی ساتھ گاندھی جی کو بہت پُرجوش طریقے سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ہندوستان اور

انگلینڈ کے تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ یہ ہندوستان کی اپنی مرضی پر ہے کہ وہ کامن ویلتھ میں شامل ہو یا نہ ہو۔ اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔" لارڈ کی تقریر کا استقبال بہت مسرت سے کیا گیا۔ اس تقریر کا جواب راجندر پرشاد نے دیا۔ پہلے انہوں نے ہندی میں طویل تقریر کی۔ اس کے بعد انہوں نے انگلش میں خطاب کیا۔ تقاریر کے بعد ہندوستان کا جھنڈا کونسل ہاؤس پر لہرایا گیا۔ ۳۱ توپوں نے سلامی دی۔ سلامی کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی رہائش گاہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستہ بھر لوگوں نے تالیاں بجا کر اُن کا استقبال کیا۔ سارا ماحول جے ہند اور ماؤنٹ بیٹن زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔

پنچ کے بعد میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ روشن آرا باغ گیا۔ جہاں پانچ ہزار اسکول کے بچوں نے ان کا استقبال کیا لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بچوں کے ساتھ بازی گری کے کرتب دیکھے اور ان کو تحفے دیئے۔

روشن آرا باغ سے آتے ہی انہوں نے لباس تبدیل کیا اور پرنسس پارک انڈیا گیٹ پر واقع جنگی شہیدوں کی یادگار پر پرچم کشائی دیکھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں وہاں پہلے پہنچ چکا تھا۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ رش کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ گورنر جنرل اپنی گاڑی سے نیچے نہیں اتر سکے۔ پرچم کشائی کے وقت انہوں نے اپنی گاڑی ہی میں کھڑے ہو کر سلامی دی۔ جیسے ہی جھنڈا لہرایا گیا، ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ آسمان پر قوس قزح نمودار ہوگئی جس کا ہر رنگ ترنگے سے گلے مل رہا تھا۔ لوگوں نے متفقہ طور پر اسے نیک شگون قرار دیا۔ واپسی کے وقت کا منظر بھی یادگار تھا۔ پنڈت نہرو ہجوم کی کثرت کے سبب اپنی کار تک نہ پہنچ سکے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ان کو اپنی گاڑی پر چڑھا لیا۔ راستے میں مزید چار خواتین، ایک بچہ اور ایک فوٹو گرافر جن کے گاڑی سے کچل جانے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی گاڑی میں چڑھا لیے گئے۔ اس طرح گاڑی میں بارہ مسافر ہو گئے تھے۔

رات گورنمنٹ ہاؤس میں اس تاریخی دن کے شایانِ شان ڈنر کا انتظام کیا گیا۔ ڈنر میں تقریباً نئی کابینہ کے وزراء، سفارتی عہدیداران اور فوجی شہری حکام نے شرکت کی۔ مسٹر نہرو نے بادشاہ کا جامِ صحت تجویز کیا۔ جواب میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نو آزاد ملک کا جامِ صحت تجویز کیا۔

سوا نو بجے تین ہزار مہمانوں کو اوپر کی منزل پر لے جایا گیا، جہاں ان کا فرداً فرداً ماؤنٹ بیٹن سے تعارف کرایا گیا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے سارے ڈرائنگ روم کھول دیئے گئے تھے۔ مغل باغ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف جوش اور مساوات کی روح رقصاں نظر آرہی تھی۔ سارا ہندوستان آزادی کی دیوی کی پُر شفقت گود میں کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔

اِس طرح ۱۵ اگست کا دن گذر گیا اور ہندوستان اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ ▲

علی جواد زیدی



# ایک نئی معنویت

یہ مضمون اُس وقت موصول ہوا جب "گاندھی نمبر" کے مقالات کا حصہ پریس
جا چکا تھا۔ اسلئے مجبوراً شروع میں شامل ہونیکے بجائے آخر میں شامل ہو رہا ہے ـــــ ادارہ

گاندھی صدی میں گاندھی جی کا نام ایک نئی معنویت کا حامل ہو گیا ہے۔ یہ نام تقریباً دو سال سے بار بار دہرایا گیا ہے اور پچھلے چند مہینوں میں تو ساری دنیا اس نام کا وظیفہ خلوص و عقیدت مندی سے پڑھنے لگی ہے۔ مجھے اپنے بچپن کا وہ دور یاد آتا ہے جب مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی "مہاتما" کے روحانی منصب پر فائز نہیں ہوئے تھے مگر اپنی لگن اور مخصوص طرز فکر کی بنا پر ملک کے قائدین کی صفِ اوّل میں پہنچ گئے تھے۔ افریقہ میں جیتی ہوئی پُرامن سیاسی جنگ ایسا اکتساب تھی جس نے تمام اہلِ فکر و قلم کو چونکا دیا تھا۔ اکبر الہ آبادی جیسے اعلیٰ سرکاری عہدیدار بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے

مدخولۂ گورنمنٹ اکبرؔ اگر نہ ہوتا   اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کے گوپیوں میں

برج نرائن چکبستؔ نے تو دل کھول کر خراجِ عقیدت اور عملی تعاون پیش کیا تھا۔

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے   وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے

اور ظفر علی خاں نے للکارا تھا :

پھیلتی جاتی ہے گاندھی کی لگائی ہوئی آگ   کوئی اروِن سے یہ کہہ دو کہ نہ اِس آگ سے کھیل

اِس میں شک نہیں کہ گاندھی کی لگائی ہوئی آگ سارے ملک میں بڑی تیزی سے پھیلی۔ ایک نہتی اور شکست خوردہ قوم ایک شدید ذہنی تشنج میں مبتلا ہو گئی تھی۔ بہتوں نے بیرونی اقتدار سے مصالحت کر لی تھی۔ بہت سے ایسے تھے جنہوں نے اسے قسمت کا کھیل سمجھ کر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ بہت سے اصلاح پسندی کے جال میں گرفتار ہو گئے تھے۔ قومی ولولہ کہیں معزول بادشاہ کے جلال کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ کہیں خفیہ اور جذباتی تحریکوں کی صورت میں نمودار ہو رہا تھا لیکن ایک منظم قومی تحریک ہنوز معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی۔ یہ گاندھی جی ہی کے فلسفۂ عدم تعاون اور مقاومت مجہول کا کرشمہ تھا کہ یہ تھکی ہاری قوم جاگ اُٹھی اور اس صدی کی دوسری دہائی کے خاتمے پر ایک عظیم الشان تحریک نے جنم لیا۔ گوکھلے اور تلک جیسے سیاسی کی سیاسی دین بھی کم نہیں ہے لیکن گاندھی جی نے وطن کو نئی زندگی بخشی۔ قومی اور وطنی تحریک نے نیا جنم لیا۔

اِس تحریک کے کئی پہلو تھے۔ ایک تو بیرونی اقتدار سے ترکِ موالات۔ سرکاری ملازمتوں سے لوگوں نے استعفے دیئے۔ انگریزی اسکولوں کا مقاطعہ کیا گیا اور کلرک ساز تعلیم کی بجائے ملک دوست اور انسانیت دوست

آزادی پرست تعلیم کے لئے کاشی ودّیا پیٹھ، گجرات ودّیا پیٹھ اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ جیسے تعلیمی ادارے وجود میں آئے اور پھر برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔

دوسرا پہلو یہ تھا کہ ہندوستانی سوسائٹی میں جو خرابیاں در آئی تھیں اور جن کی وجہ سے اہلِ ملک ٹولیوں اور ٹکڑیوں میں بٹ کر وحدتِ قومی کے تصوّر سے دُور جا پڑے تھے۔ اُن کے دُور کرنے کی مہم چلائی گئی۔ اِس سلسلے میں ہریجنوں اور پس ماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود کے کام ہاتھ میں لئے گئے اور ان کو سماج میں برابری کا درجہ دلانے کی جدوجہد کی گئی۔ اِسی سلسلے کی دوسری کڑی فرقہ وارانہ اتحاد بھی تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں حکمرانی کا ایک طریقہ یہ ایجاد کیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا جائے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہ طریقہ اور بھی شدّت سے اختیار کیا گیا تھا اور حکومت کی ساری مشنری اِس کام میں لگ گئی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا جائے۔ اِس مہم میں فرقہ پرست لیڈروں نے انگریز پرستی کے اہم کارنامے انجام دئیے۔ فرقہ وارانہ انجمنوں بالخصوص مسلم لیگ کا قیام اِسی حکمتِ عملی کا ایک دردناک رُخ تھا۔ گاندھی جی نے ہریجنوں کو مساوات کا درجہ دلانے اور ہندوستان کے دو بڑے فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مواخات قائم کرنے کی لگاتار کوشش کی۔ فرقہ پرستی کی لڑائی میں ایک مصیبت یہ تھی کہ دونوں ہی مذاہب کے ماننے والوں میں بھڑکانے والوں کا ایک گروہ تیار ہو گیا تھا جسے آزادیٔ وطن سے زیادہ انگریزوں کے مفاد کے لئے فرقہ پروری کا سوانگ رچانے میں مزا ملتا تھا۔ اُس دَور میں علامہ اقبال نے لکھا تھا:

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی — مُسلمانوں کو آخر نامُسلماں کر کے چھوڑوں گا
اُٹھا دوں گا نقابِ عارضِ محبوبِ یک رنگی — تجھے اِس خانہ جنگی پر پشیماں کر کے چھوڑوں گا

اور مولانا ظفر علی خاں نے یہ آواز دی تھی:

جانِ بلب برہمن و شیخ سے ہے بر سرِ جنگ — اب نہ ہوگا تو پھر اِن دونوں میں ہوگا کب میل!

اور علامہ شبلی نعمانی نے صاف لفظوں میں مسلم لیگ کے فضائل یوں بیان کئے تھے!

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں — محسنِ قوم بھی ہے، خادمِ حکّام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی — جس طرح صرف میں اک قاعدۂ ادغام بھی ہے

گاندھی جی نے مقاطعے کی تحریک چلا کر اسی سیاسی ادغام کے دروازے بند کر دئیے اور حقیقی اتحاد کے لئے ایک پُر زور تحریک چلائی۔ ہندو اور مسلم فرقہ پرستوں نے اُن کی راہ میں کانٹے بچھا دیئے، لیکن انہوں نے کبھی ہار نہیں مانی، یہاں تک کہ اپنی بیش بہا جان کی عظیم قربانی بھی اِس راہ میں پیش کر دی۔

گاندھی جی کے سوراج کا نظریہ صرف انگریزوں کے ہندوستان سے نکالے جانے تک محدود نہیں تھا۔ وہ ایک مضبوط اور قوی ہندوستان تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں فرقوں اور ذاتوں کی تفریق نہ ہو، اونچ اور نیچ کا تعصّب نہ ہو، جس کا ہر فرد اپنے کو وطن کا خادم سمجھے اور پچاس کروڑ کی آبادی کا ایک ایک فرد فرد کا سب اور تعمیری مہمّات میں مصروف رہے۔

گاندھی جی کا تعمیری پروگرام اِسی پس منظر میں دیکھے جانے کی چیز ہے۔ اکثر اصحاب اِن بحثوں میں اُلجھ جاتے

ہیں کہ اس صنعتی دَور میں گھریلو صنعتوں کا کیا مقام ہے۔ چرخہ اور کھدّر صرف علامتیں ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ تعمیری مہم میں ایک ایک فرد کو لگ جانا چاہیئے اور ہندوستان ایسے وسیع ملک میں (جس کی آبادی کا تین چوتھائی حصّہ دیہاتوں میں رہتا ہے) کوئی تعمیری مہم اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک آبادی کی اکثریت یعنی دیہاتی باشندے بھی بھرپور حصّہ نہیں لیتے۔ یہ سچ ہے کہ گاندھی کو مشینی دَور کی بڑی صنعتوں پر زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ لیکن وہ مشین کے سرے سے مخالف بھی نہیں تھے۔

تعجب ہے کہ آج گاندھی جی کے اِن سیاسی اور تعمیری خیالات سے زیادہ اُن کے اخلاقی اور رُوحانی خیالات پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ یقیناً گاندھی جی نے اخلاقیات اور رُوحانیات کے بہت سے پہلوؤں سے بحث کی ہے اور خالص دنیاوی اُمور میں بھی اخلاق اور مابعدالطبعیات کے دخل کو جائز سمجھا ہے لیکن یہ صرف ایک پہلو ہے۔ اُن کی تعلیمات و خیالات کا مالہٗ وماعلیہ سب کچھ نہیں ہے۔ سیاست جس کے بارے میں جالنسن نے کہا تھا کہ "بدمعاشوں کی آخری جائے پناہ ہے"۔ اب عوام کی خدمت کا آلۂ کار بن کر ایک معزز حیثیت کی مالک ہو گئی ہے، لیکن سیاست کو کس طرح برتا جائے، اس کے بارے میں اب بھی اختلافِ رائے ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اگر ذرائع غیر صالح بھی ہوں تو صالح مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ گاندھی کا کہنا تھا کہ وہ صالح ترین مقصد کے لئے بھی غیر صالح ذرائع کا استعمال جائز نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک ذرائع بھی مقصد ہی کا ایک جزو ہیں اور جزو کے غیر صالح ہونے سے کُل کا متاثر ہونا بھی یقینی ہے لیکن کوئی آفاقی اور انسانی مقصد ایسا نہیں تھا جس کی تائید گاندھی جی نے نہ کی ہو۔

گاندھی جی کی زندگی میں سوشلزم اور کمیونزم کی بات چل پڑی تھی بلکہ پہلے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کانگریس ہی کا ایک جزو تھی۔ کمیونسٹ بھی کانگریس میں شامل تھے۔ آج کے کئی ایک چوٹی کے کمونسٹ نیتا کل کے کانگریسی تھے۔ گاندھی جی ٹالسٹائے سے بے حد متاثر تھے اور بعد میں مارکس اور لینن وغیرہ کے خیالات کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ اِن خیالات سے کس حد تک متاثر ہوئے لیکن یہ یقینی ہے کہ اقتصادی مساوات اور عالمگیر برادری کے نظریات کو اپنا چکے تھے۔ وہ طبقاتی تفریق کی نفی تو نہیں کرتے تھے لیکن اتیاتی طور سے انسانی برابری کے قائل اور اس کے حصول کے کوشاں تھے۔ ہاں ذرائع کے استعمال کے معاملے میں اُن کا رویہ بالکل واضح تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی تشدّد سے صلح کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ جزوی اختلافات اور بھی بہت سے تھے لیکن اِس مختصر سے مضمون میں اُن سب کے اعادے کا نہ تو مقام ہے نہ ضرورت۔

گاندھی کا پیغام عام سیاست دانوں کے پیغام کی طرح وقتی نہیں ہے۔ گاندھی جی نے کچھ بنیادی سوال ایسے اُٹھائے تھے جو اُن سے پہلے بھی انسانیت کے سامنے آچکے تھے۔ ان میں امن، محبّت اور مساوات کے پیغام ہیں۔ امن آج بھی دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ حیرت انگیز ایجادوں اور ہلاکت آفریں ساز و سامان سے گھری ہوئی دنیا موت کے دہانے پر کھڑی ہے۔ بٹن دباتے ہی آفتابِ محشر سوا نیزے پر آسکتا ہے۔ قیامت انسان کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ اگر آج تشدّد پھوٹ نہیں پڑ رہا ہے تو اُس کا سبب اسی قیامت کا خوف ہے۔ لیکن انسان مسلسل خوف کی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اِس خوف سے نجات پانے کے لئے یا حصولِ اقتدار کی

ٹھوک میں اگر ہاتھ آجائے تو دشمن تک جا پہنچا تو لین پڑ لے ہے! کیا تشدد سے اس تشدد کا مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے؟ کیا امن کی بھرپور تحریک اور کوشش کے بغیر اس تشدد زدہ انسان کو تباہی سے بچایا جاسکتا ہے؟ اگر لوگ اس عظیم آفاقی مسئلے کے اس گاندھیائی حل کو ہوائی بات کہہ کر ٹال سکتے ہوں تو مجھے ایسے مریض ذہنوں سے کچھ نہیں کہنا ہے، لیکن اگر یہ حل آج بھی دعوتِ فکر دے سکتا ہو تو یقیناً گاندھی جی کے افکار کی افادیت آج بھی مسلم ہے۔ سوال امن کے ناگزیر ہونے کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس خواہشِ امن کو کیسے بروئے کار لایا جائے۔ گاندھی کا جواب تھا کہ اجتماعی روحانی اور اخلاقی طاقت سے۔ آج دنیا کے ہر گوشے میں اُن کا حربہ کامیابی سے استعمال ہو رہا ہے اور جنگ باز اس اخلاقی قوت سے ہراساں بھی ہیں۔

گاندھی جی کا دوسرا پیغام محبت تھا۔ باہمی، سماجی اور آفاقی محبت۔ دراصل یہ بھی امن ہی کا ایک شاخسانہ ہے۔ جب تک نفاق انگیز حالات، تفرقہ پرور جذبات اور مذہبی، علاقائی یا نسلی نفرت موجود ہے امن کے پہلو میں نشتر چبھتے رہیں گے۔ یہ نفاق و تفرقہ و نفرت کیسے مٹائی جائے۔ گاندھی جی کا جواب تھا کہ محبت سے۔ وہ اس محبت کو ربانی عطیہ سمجھتے تھے۔ آپ اس کی ربانی اور روحانی حیثیت کے قائل نہ ہوں تب بھی ایک دوسرے کو سمجھے اور قریب آئے بغیر، دکھ درد میں شریک ہوئے بغیر، دوسروں کی اچھائیوں کی تلاش کئے بغیر نفرت اور نفرت سے پیدا ہونے والی کشیدگی اور علیحدگی پسندی سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ یہی باہمی مفاہمت اور شرکتِ غم محبت کا زینہ بنتی ہے۔ اگر محبت نہ ہو تو باہمی سماجی یا سیاسی سمجھوتے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ جن کاغذوں پر صلحنامے لکھے جاتے ہیں اُن پر پہلی شکن پڑنے کے پہلے ہی بلکہ بعض اوقات سیاہی خشک ہونے سے پہلے وہ معاہدہ، وہ صلحنامہ ہوا میں پرزے ہو کر اڑ جاتا ہے، دھوئیں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ اجتماعی محبت گاندھی جی کے نزدیک اخلاقی یعنی روحانی بنیادوں ہی پر قائم ہو سکتی ہے۔ جو لوگ روحانیت کو نہیں مانتے وہ اخلاق کے مفہوم کو وسیع کر کے اخلاقِ اجتماعی کو بنیاد بناتے ہیں۔ منزلِ مقصود ایک ہے، راہیں جدا جدا ہیں۔

گاندھی جی کے عدم تشدد کے بارے میں بعض اوقات یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ کمزور کا حربہ ہے۔ یہ غلط فہمی اس لئے بھی پھیلتی ہے کہ ابھی تک طاقتوروں نے اسے آزمایا نہیں ہے۔ طاقتوروں کی مجبوری یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خوف کی بنا پر اس حربے کو آزمانے سے گریز کرتے ہیں لیکن یہ گریز بھی اب کلی نہیں رہ گیا ہے۔ تخفیفِ اسلحہ کے سلسلے میں جو سوچ وچار ہو رہا ہے، ایٹمی ہتھیاروں کی روک تھام کے لئے جو تدبیریں سوچی جا رہی ہیں وہ ایک سمت کی نشان دہی کر رہی ہیں۔ یہ سمت عدم تشدد کی ہے۔ تخفیف، عدم تو نہیں ہے لیکن عدم کی طرف ایک قدم تو ضرور ہے۔ جھجکتا ہوا سہی، لڑکھڑاتا ہوا سہی۔ گاندھی جی نے بار بار اس کی وضاحت کی تھی کہ عدم تشدد کمزوروں کا حربہ نہیں ہے۔ کمزوری دل کی بھی ہو تو عدم تشدد کی گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔ یقینِ محکم اور عملِ پیہم عدم تشدد کے دو اٹل اصول ہیں۔

گاندھی جی کو قدامت پرست بھی کہا جاتا ہے۔ یقیناً وہ ان معنوں میں جدید نہیں تھے جن معنوں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس کو جدید کہا جاتا ہے۔ وہ روایت کی عظمت کے قائل تھے لیکن نہ انہوں نے تجربوں سے گریز کیا اور نہ مسلمات کو ٹھکرانے سے۔ چھوت چھات کا وہ زور و شور یاد کیجئے جو بیسویں صدی کے شروع میں تھا اور پھر اس پر غور کیجئے کہ سب ایک دسترخوان پر ساتھ کھانے لگے۔ آپس میں شادی بیاہ کرتے

لگے تب گاندھی جی کی ترقی پسند اصلاح پسندی کا حال معلوم ہوگا۔ بات یہ تھی کہ وہ ایک تو سارے معاشرے کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے اور دوسرے کوئی بات صرف تقلید کے طور پر اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بعض باتوں میں مثلاً قدرتی طریقِ علاج وغیرہ، وہ عام رفتارِ ترقی سے الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے ایسے افعال کو ذاتی رکھا اور جو لوگ دوسرے طریق ہائے علاج کے قائل تھے انہیں کبھی حلقۂ بیرونِ در نہیں سمجھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے انہوں نے نہرو کو اپنا روحانی وارث بھی قرار دیا۔ مطلب یہ تھا کہ جو باتیں نہرو نے اخذ کرلی ہیں' وہ گاندھیت کا مرکزی نقطہ اور اصل اصول ہیں۔ باقی باتیں فروعی ہیں۔

گاندھی جی کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی تپاک۔ اختی۔ انہوں نے اپنی سوانح عمری کا عنوان "تجرباتِ حق و صداقت" رکھا۔ اُن کی زندگی کا ہر لمحہ ایک تجربہ تھا۔ وہ بندھی ہوئی ڈگر پر کبھی چلتے تھے تو تجربہ کرتے چلتے تھے۔ اُن کی خاموشی، اُنکا برت، اُنکا لباس، اُنکی غذا، اُنکا طریقِ علاج، اُنکا فلسفۂ عدم تشدد، اُنکا طریقِ تعلیم، اُنکا چرخہ، اُنکی کُٹیا اور اُنکا آشرم سب تجربہ تھے۔ تجربے کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن تجربہ کرنیوالے کے خلوص کے بارے میں نہیں

آخر میں اُن کے ایک اور تجربے کا ذکر ضروری ہے جو زبان کے مسئلے سے تعلق رکھتا ہے۔ گاندھی جی نے اِس کو محسوس کرلیا تھا کہ آزادی کے بعد اس عظیم ملک میں انگریزی کا مستقبل روشن نہیں ہے۔ وہ مقامی زبانوں کے حق میں تھے۔ انہوں نے سبھی رسم الخط سیکھ لئے کئی زبانیں لکھتے اور بعض میں دو چار جملے بولنے بھی لگے۔ اپنی مادری زبان گجراتی میں بہت کچھ لکھا۔ انگریزی میں بھی لکھتے تھے بلکہ انہوں نے سب سے زیادہ انگریزی ہی میں لکھا۔ پھر بھی وہ جانتے تھے کہ انگریزی مقامی زبان نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو ریاستوں میں زیادہ دنوں تک رہنے پائے گی نہ مرکز پر۔ اس لئے انہوں نے "ہندوستانی یا ہندی" کا نعرہ دیا۔ اور اسکی وضاحت کردی کہ یہ وہ زبان ہوگی جو اُردو اور دیوناگری دونوں ہی رسوم الخط میں لکھی جائے گی۔ وہ خود اسی زبان میں بولنے اور ہر سپیچ میں یہی زبان استعمال کرنے لگے۔ اس پر ہندی اور اُردو والے دونوں ہی نے شور مچایا، کیونکہ وہ زبان کے مسئلے پر یا تو ادبی اور لسانی زاویے سے غور کرتے تھے یا علاقائی اور سیاسی، بلکہ فرقہ پرورانہ نقطوں سے۔ وہ مسئلے کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے۔ آج گاندھی جی ہم میں نہیں ہیں۔ ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے اور 'ہندوستانی' کی جگہ مشکوک ہو گئی ہے۔ ہندی کے بارے میں یہ طے ہو گیا ہے کہ وہ قومی اور آئینی سطح پر ہماری زبان ہوگی لیکن بعض علاقوں کی طرف سے اِس اسکیم پر عمل درآمد میں رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ پاکستان نے اُردو کو اپنایا ہے لیکن وہاں بھی مشرقی پاکستان نے اُردو کو مسترد کر دیا ہے۔ اِس پس منظر میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ گاندھی جی نے کس دُوربینی سے آنیوالے خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک مصالحتی زبان اختیار کرنا چاہتے تھے، جو بین صوبائی اور بین لسانی ضروریات کی کفایت کر سکے۔ یہ زبان پہلے سے بنی بنائی نہیں تھی بلکہ اسے از سرِ نو بننا تھا اور فارسی زدہ اُردو اور سنسکرت زدہ ہندی سے الگ ہٹ کر امتزاج و اشتراک سے بننا تھا۔ میں آج بھی جب سوچتا ہوں تو متحدہ ہندوستان کے لئے اس سے بہتر کوئی حل نہیں تھا لیکن جب زبان سیاست کا بُری طرح شکار ہو ہی گئی تو گھڑی کی سوئی پیچھے چلانے کی بات بھی سوچنا بے سُود ہے تاہم ہندوستان میں اُردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اب "ہندوستانی" کا احیاء نہیں ہو سکتا۔ اِس کیلئے آج بھی نہ تو اُردو والے تیار ہیں نہ ہندی والے۔ لیکن ناموں کے جھگڑے میں پڑے بغیر یہ کوشش کی جا سکتی

(باقی صفحہ ۲۲۲ پر دیکھئے)

# پتنجلی

سیماب اکبرآبادی مرحوم

# یہ کس کی آواز ہے؟

(یہ نظم 'گاندھی صدی' کے موقع پر حکومتِ ہند کی طرف سے گاندھی جی پر
منتخب نظموں کے مجموعہ میں چھاپی گئی ہے)

میں نے اے ہندی! فدا کی اپنی جاں تیرے لئے — ناتواں سینے پہ کھائیں گولیاں تیرے لئے
کیا مری ایذا کشی کا کچھ نہیں تجھ پر اثر؟ — عمر بھر جھیلی تھیں میں نے سختیاں تیرے لئے
نا مکمل کیا مری تعلیمِ صلح و امن تھی؟ — کیا نہ میرا درس تھا تسکیں نشاں تیرے لئے
میں نے آزادی کی منزل تک تجھے پہونچا دیا — وقف کر دی دولتِ ہندوستاں تیرے لئے
تو مگر اب بھی ہے صرفِ انتشار و اضطراب — کیا مری کوشش تھی سعیِ رائیگاں تیرے لئے
ہر طرح تنظیم کر اپنی غنیمت ہے یہ وقت — پھر سکون و نظم کا موقع کہاں تیرے لئے
یہ مرا پیغام تھا اور یہ مرا پیغام ہے — ہے "محبت" ضامنِ امن و اماں تیرے لئے

جب "محبت" تیرا جزوِ زندگی ہو جائے گی
ایک ہندستان کیا، دنیا تری ہو جائے گی

تو ہے انساں اور آزادی ہے فطری حق ترا — یہ زمیں تیرے لئے ہے آسماں تیرے لئے
یہ ہوائیں، یہ فضائیں، سب تری محکوم ہیں — ہیں یہ سب دریا، سمندر، ندیاں تیرے لئے
صبح سے تا شام تجھ پر ضو فشاں ہے آفتاب — رات کو مہتاب ہے جلوہ فشاں تیرے لئے
بے تکلف لے بسیرا، بے تردد چہچہا — یہ چمن تیرے لئے ہیں، آشیاں تیرے لئے
چاند، سورج اور تارے، نور و ظلمت، ابر و باد — ہے رواں یہ زندگی کا کارواں تیرے لئے
تیرے ہی کچھ گیت ہیں، نوحہ ہو یا نظم و غزل — سازِ ہستی ہے مسلسل نغمہ خواں تیرے لئے
ہے تری میراث لا محدود پھیلائے زمیں — الغرض ہے وسعتِ کون و مکاں تیرے لئے

تنگ دل ہو کر یہاں تجھ کو نہ رہنا چاہئے
وسعتِ خاطر بقدرِ ظرفِ دنیا چاہئے

(اکتوبر ۱۹۴۸ء)

ساغر نظامی

# گاندھی جی

ہزار گوہرِ تاباں نچوڑ کر تو نے
ہزار لالۂ خنداں نچوڑ کر تو نے
ہزار شمعِ فروزاں نچوڑ کر تو نے
ہزار انجمِ رخشاں نچوڑ کر تو نے
شبِ سیہ کو کیا مطلعِ سحر تو نے

بہار باغ گریزاں تھی لالہ زاروں سے
صبا کٹی کٹی چلتی تھی شاخساروں سے
چمن گلوں سے تھا مایوس گل بہاروں سے
کرن سحر سے تھی محروم شب ستاروں سے
ستارے شب کو دیئے نور کو سحر تو نے

نوائے شام میں اک آتشِ صدا بھر دی
سحر کے سازِ شکستہ میں سحرِ نغمہ گری
فغانِ نیم شبی کو نئی تڑپ بخشی
عبور کر گیا آفاق نالۂ سحری
دعا کی بے اثری کو دیا اثر تو نے

سجایا جس کو گلابوں کے تازہ ہاروں سے
نئی شعاع کے آزاد نور پاروں سے
نئے جہانِ تمنا کے بیقراروں سے
ازل سے جس کو بسایا گیا بہاروں سے
سنائی رات کو اُس صبح کی خبر تو نے

حیات اُن کی ہے دمساز بھول بیٹھے تھے
قفس میں رہ کے جو یہ راز بھول بیٹھے تھے
جو اپنی جودتِ آواز بھول بیٹھے تھے
جو اپنی قوتِ پرواز بھول بیٹھے تھے
لگا دیئے انھیں نندوں میں بال و پر تو نے

جو ڈنک اُٹھتے تھے ان کو دیں محبت سے
جو کانٹے اُٹھتے تھے پھولوں کے مسکرانے سے
جو خواب کو لاتے تھے بادِ صبا کے آنے سے
جو بھاگتے تھے شراروں کے چھو جانے سے
عطا کیا انھیں شاہین کا جگر تو نے

نہ تیز دھوپ کو چھوا اور نہ دامنِ گل کو
نہ موجِ بو کو چھوا اور نہ ساغرِ مُل کو
نہ چھیڑا شعلۂ سرکش سے سازِ بلبل کو
نہ موجِ نے کو چھوا اور نہ سبزہ و گل کو
کچھ اس طرح کیے آزاد بحر و بر تو نے

ہر ایک شاخ فسردہ کو دی جلالتِ برق
ہر ایک ذرہ کا دیدہ کو تمازتِ برق
قفس کی تیلیوں کو اضطرابِ فطرتِ برق
نزاکتِ گل و لالہ کو دی صلابتِ برق
مزاجِ کاہ کو بخشا دمِ شرر تو نے

جو بے زباں تھے انھیں جذبۂ کلام دیا
جو تشنہ لب تھے انھیں سرخوشی کا جام دیا
خودآگہی و خودی کا نیا پیام دیا
دلِ خواص کو تو نے غمِ عوام دیا
عطا عوام کو کی چشمِ حق نگر تو نے

کھلائے لالہ و گل سحرِ گفتگو نے ترے
خزاں کو سرخ کیا سیلِ آبِ جو نے ترے
بہائی جوئے مے ارغواں سبو نے ترے
بہار کو شفقی کر دیا لہو نے ترے
چمن کی خاک کو بخشا لباسِ زر تو نے

ترا ستارہ درخشاں رہیگا صدیوں تک
یہ سرخ پھول گل افشاں رہیگا صدیوں تک
دلِ زمانہ فروزاں رہیگا صدیوں تک
زمیں کا سینہ چراغاں رہیگا صدیوں تک
اُبھر کے ثبت کیا نقشِ کالحجر تو نے

شمیم کرہانی

# روشنی کا سفیر

میں نہ ٹھہرا، قدم کو بڑھاتا گیا
وحشتِ وقت نے اپنا چاکِ گریباں سیا بھی نہ تھا
شام کی کالی ہتھیلی پہ کوئی دیا بھی نہ تھا
سہمی سہمی سی پرچھائیوں کے تلے زیست حیران تھی
کوئی سایہ نہ تھا، کوئی آہٹ نہ تھی، راہ سنسان تھی
مسکراتا گیا، گنگناتا گیا
میں نہ ٹھہرا، قدم کو بڑھاتا گیا

میرے نغموں کی نرم آہٹیں سن کے ذرّوں میں جان آ گئی
دل دھڑکنے لگے، زندگی جاگ اٹھی، موت گھبرا گئی
تیرگی کانپ اٹھی، آرزوؤں کے دل میں دیا جل پڑا
پیچھے پیچھے مرے چاند تاروں کا اک کارواں چل پڑا
چل پڑا، تو اندھیرا ڈراتا گیا
میں نہ ٹھہرا، قدم کو بڑھاتا گیا

مجھ کو روکا گیا، میرے ساتھی ستاروں کو روکا گیا
روشنی کے مسافر جدھر کو بڑھے، اُن کو ٹوکا گیا
رات کے راہزن، دولتِ کہکشاں لوٹ کر لے گئے
لیکن آزاد تارے فدا ہو کے بھی روشنی دے گئے
ظلم مانا نہیں، اُس نے ظلمت کا پھر بول بالا کیا
یہ سماں دیکھ کر میں نے اپنے لہو سے اُجالا کیا
چشمۂ نور میں پھر نہاتا گیا
میں نہ ٹھہرا، قدم کو بڑھاتا گیا

رفعت سروشؔ

# باپو کا امر پیام (گیت)

امن کی پیاسی اس دھرتی کو دو باپو کا امر پیام
ستیہ اہنسا کے سائے میں پائے گی دنیا آرام
نگری نگری پاپ کے ڈیرے بستی بستی میں ہاہاکار
بستی بستی پھوٹ کے پہرے بھائی بھائی سے بیزار
نفرت کے ماحول میں لیکن دہراتا ہے پیار کا نام
امن کی پیاسی اس دھرتی کو دو باپو کا امر پیام
نفرت کا وش پی کر تجھ میں ایٹم کے زہریلے ناگ
جل جائے گی دنیا ساری چھیڑ رہی ہے دیپک راگ
اندھی جنگ کے متوالوں کو بتلا دو اس کا انجام
امن کی پیاسی اس دھرتی کو دو باپو کا امر پیام
ذات پات کے جھگڑے قصے آزادی کے دشمن ہیں
اونچ نیچ پھیلانے والے آزادی کے دشمن ہیں
آزادی تو حق ہے سب کا پھر کیوں ہو انسان غلام
امن کی پیاسی اس دھرتی کو دو باپو کا امر پیام
جو بستا ہے سب کے من میں اس کے ہیں بندے سارے
اس کی ہی منزل کے نشاں ہیں مندر مسجد گردوارے

سب کو اک منزل پر جانا کھوٹ کپٹ کا پھر کیا کام
امن کی پیاسی اس دھرتی کو دو باپو کا امر پیام

# گاندھی جی آپ پھر آجائیں!

سلام مچھلی شہری

گاندھی جی : آپ خدا کے لیے پھر آجائیں
اِن دِنوں مُلک کے حالات بہت نازک ہیں
آپ آجائیں تو ہوجائے ہم آہنگ فضا
ورنہ اب شعلۂ جذبات بہت نازک ہیں

آپ نے ہم کو بتایا تھا کہ یہ مسجدِ ہند
نُور و نکہت کی علامت ہے، سجاؤ اِس کو
آپ نے ہم سے کہا تھا کہ وطن کا ہر پھول
رُوحِ گیتا ہے کلیجے سے لگاؤ اِس کو

آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارا مندر
"وَا ہے ہر مہرِ درخشندہ کے جلوؤں کے لیے
ہم کہ خود خالقِ نغماتِ محبت ہیں مگر
منتظر رہتے ہیں تازہ تریں نغموں کے لیے"!

آپ کی ذات امر، آپ کا پیغام امر
ہمیں خود بھول گئے راہِ صداقت شاید
جانے کیا بات ہے، گلشن ہے وہی، پھول وہی
گم شدہ سی ہے فضاؤں کی وہ نکہت شاید

آپ کے نام سے وابستہ "صدی" کی سوگند
ہم نئے سر سے سجائیں گے گلستانِ وطن
گو نیاں برسیں کہ طوفانِ حوادث آئیں
اپنے ہاتھوں سے تو چھوٹے گا نہ دامانِ وطن!

اعجاز صدیقی

# بوڑھا ہادی

یہ نظم کئی سال پرانی ہے اور ریڈیو کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ یہ متعدد بار مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر بھی ہو چکی ہے۔ اس میں آخری تین شعروں کا اضافہ آج کے حالات کے تحت کیا ہے۔ "اعجاز"

وہ گاندھی، وہ بوڑھا ہادی، من میں جس نے بسرام کیا
چھوٹوں کو، بڑوں کو، اپنوں کو، بیگانوں کو، مجبوروں کو
آنکھیں بھی منور تھیں جس کی، اور دل بھی مقدس تھا جس کا
اب سوچ کہ وہ کمزور بدن، فولاد کا تھا یا پتھر کا؟
وہ فکر و تدبر کا عالم، وہ ذہن و نظر کی گہرائی
صدیوں کی غلامی نے آخر، جی چھوڑ دیا، دم توڑ دیا!
مشرق کے کناروں سے پھوٹیں، کرنیں ایسی بیداری کی
لوہا اُس کا سب نے مانا، بلوانوں، بدھی مانوں نے
دیکھا ہے بہت کم دنیا میں قومی کردار ایسا کوئی:
ہر آنے والی صبح بنی، اُجلی اُجلی، جگمگ جگمگ
"سابرمتی آشرم" آ تجھ کو سینے سے لگا لیں ہم اپنے
یہ عزم و عمل کی چنگاری ہے دین اُسی کی، سچ تو یہ ہے

وہ حضرتِ وطن جس کو ہم نے رہبر اپنا ہر گام کیا
وہ ہاتھ عزیزِ عالم تھے جن ہاتھوں نے پرنام کیا
بیگانۂ تشدد رہ کر، دنیا کو اسی نے رام کیا
اے قوم، تری خاطر جس نے کانٹوں پر بھی آرام کیا
جو لفظ بھی نکلا ہونٹوں سے اُس لفظ کو اک پیغام کیا
آزادی کے متوالے نے، آزادی کو یوں عام کیا
بڑھتی ہوئی ظلمت مغرب کی ہر کوشش کو ناکام کیا
ایک ایک سیاسی کش مکش کو مجبورِ شکست جام کیا
وہ قوم و وطن کی خاطر تھا، دیا توں اُٹھا، جو کام کیا
روشن خونِ دل سے اُس نے اِس طرح چراغِ شام کیا
تیری دھرتی پر باپو نے بیکل رہ کر آرام کیا
ہے اُس کا تصرف بھی اِس میں، اب تک ہم نے جو کام کیا

آزادی کے افسانے کا آغاز بہت ہی سادہ تھا
خود اپنی چتا کے شعلوں سے رنگیں اُس کا انجام کیا

اے قوم ترا کردار و عمل باپو کے منافی ہے بالکل
تو نے تعلیمِ "اہنسا" کو برباد کیا، بدنام کیا
چھائے ہوئے دیش پہ بادل ہیں ہر سُو ہنسا اور نفرت کے
لعنت کو فرقہ پرستی کی تو نے دانستہ عام کیا

"گاندھی کی صدی" پر بھی ندیاں خونِ انساں کی بہہ کے رہیں!
اِس بارِ شرم و ندامت سے اُٹھ سکتی نہیں بھارت کی جبیں!!

مخمور سعیدی

# گمشدہ آدرش

وہ سایا!
جو پیڑ [illegible] تپتے راستوں پر سفر کرنے والوں کو تابِ سفر بخشتا تھا
[illegible] تن کو شبنم بنا دینے والی نئی انبساطِ نظر بخشتا تھا
وہ خوشبو!
جو بنجر زمینوں کی مشکل مسافت کو آساں بنائے ہوئے تھی
جھلستی فضاؤں کو گلشن بداماں بنائے ہوئے تھی
وہ جھونکا صبا کا!
[illegible] ہماری سماعتوں کے [illegible] کی جانب لیے جا رہا تھا
[illegible] نگری [illegible] لگا ہو [illegible] دکھلا رہا تھا
وہ آدرش اپنا!
محبت، مساوات، آزادی و امن جیسے کئی نام جس کے
سنے ہم نے شام و سحر زندگی بخش پیغام جس کے
وہ سایا، وہ خوشبو، وہ جھونکا صبا کا!
[illegible] گئے وقت کے [illegible] جانے کہاں کھو گیا ہے
وہ آدرش اپنا، [illegible] نے بیداریِ دل کی دولت عطا کی
[illegible] منہ چھپا کر کہیں سو گیا ہے!

حرمت الاکرام

# گاندھی

آغوش میں پھولوں کی تھرکتا ہوا شعلہ
انگاروں کے گہوارے میں سوئی ہوئی شبنم
اک جذبہ، اک احساس، اک انداز، اک آواز
نکھرا ہوا اک درد، تپایا ہوا اک غم
انسان کی صورت میں دھڑکتا ہوا اک دل
پیکر میں عناصر کے کوئی دیدۂ پُرنم
سینے میں سموئے ہوئے گنگا کا تموّج
کاندھے پہ ہمالہ کا اٹھائے ہوئے پرچم
نیرنگیٔ افکار کا سمٹا ہوا دریا
بیتابیٔ جذبات کا ٹھہرا ہوا طوفاں
فاروق کا متوالا، اخوت کا پجاری
گوتم کا دلآرام، اہنسا کی رگِ جاں
اپنی ہی خطاؤں کا وہ نقّادِ جواں فکر
وہ اپنے ہی اسرار کا اک سیلِ خراماں
ماحول کے سینے کا دہکتا ہوا لاوا
تاریخ کے ماتھے پہ سجائی ہوئی افشاں

نشاراتاوی

# فقیرِ بے نوا

آفتابِ تازہ برآمد ز چرخِ چنبری
پڑ گئی پھیکی ضیائے شمعِ بزمِ قیصری

جگمگا اُٹھے در و دیوارِ بہنائے وطن
چھپ گئی زیرِ حجابِ مرگ تیرہ منظری
پارہ ہائے دامنِ عظمت سمیٹے ہند نے
سوزنِ تدبیر سے کرنوں نے کی بخیہ گری
زندگی بر کف، عصا در دست، قشقہ بر جبیں
اک فقیرِ بے نوا نکلا بہ شانِ سروری
آنکھ میں جادو، زباں میں سحر، باتوں میں طلسم
ہر نفس نغمہ محبّت کا بہ سازِ دلبری
رُوح میں ہلچل، جگر میں سوز، سینے میں تڑپ
سر میں سودائے وطن، دل میں خروشِ محشری

ایک کھادی کی ردائے صاف میں لپٹی ہوئی
مُسکرائی مُصلحانہ عزم سے پیغمبری
اک صداقت کی سپر، تیغِ سیاست کا جواب
اک محبّت کی ادا، رشکِ نظامِ عسکری
واردھا کی سمت سے آئی صدائے انقلاب
کھل گئی انسان پر افرنگ کی بازی گری
قصرِ استبداد کی بنیاد تھرانے لگی
بھول بیٹھی قوّتِ تخریب جنگِ زرگری
اک ہریجن کو برہمن کے برابر کر دیا
روند ڈالا پائے حکمت سے دماغِ برتری
مُلک میں جس دم تنفّر کے ہُوئے شعلے بلند
قوم نے کی جب عروسِ ہند کی پردہ دری
رام دھن گاتا ہُوا شعلوں میں داخل ہو گیا
اک نحیف و ناتواں انساں بہ اندازِ جری

آگ بُجھ کر رہ گئی اور خود بھی بُجھ کر رہ گیا
سُرمۂ چشمِ محبّت بن گئی خاکستری

صبا فتح آبادی

# گاندھی نے کہا تھا:

میں ہندو ہوں
تم ہو مسلماں
میں گجراتی
تم مدراسی
یہ باتیں ساری بے معنی
خوش فہمی، کوتہ نظری کی
آؤ، بھلا دیں ان باتوں کو
آؤ، مٹا دیں
"میں" اور "میرا" کا احساس!
ابھریں تو مل کر ابھریں ہم
ڈوبیں تو مل کر ڈوبیں ہم

اک اچھے گھر سے بہتر
درس گاہِ زیست کیا ہوگی؟
نہیں بڑھ کر کوئی استاد
ایسے باپ اور ماں سے
جو لے کر شمعِ ایماں
راستے پر پاکبازی کے
رواں رہتے ہوں ہر دم

کسی کو تم نہ ستاؤ، کسی کا دل نہ دکھاؤ
کہ اس سے بڑھ کے جہاں میں کوئی گناہ نہیں!
غلطی کرنا،
انسانی فطرت میں داخل
لیکن سچ ہے،
غلطی کا اقبال اور اس سے توبہ،
متقاضی ہے،
ہمتِ مردانہ کی:

ہمت،
استقلال،
بے خوفی،
ایثار و قربانی،
یہی پہچان سچے رہنما کی ہے

ایک ہے روح سب مذاہب کی
مختلف لیکن اس کے قالب ہیں

کرشن موہن

# مہاتما گاندھی

**اک بیراگی جس کا دھرم تھا اپنا پن**

اک بیراگی جس کا دھرم تھا اپنا پن
اپنے تیاگ سے جیت چکا ہے سب کا من
ایسا پھول کہ سارا عالم جس کا چمن
ایسا انساں ساری دھرتی جس کا وطن
اس کا جیون ساری دنیا کا درشن
اور اس کا من تھا مانوتا کا درپن
وحدت کی آئینہ دار تھی اس کی زباں
فرق مٹانا، پیار بڑھانا اس کا چلن
اس نے دکھائی دیش کو راہِ آزادی
اس کا پیام اور کام تھے دونوں من موہن
اس کی چاہت میں راحت ملتی تھی ہمیں
اس کی ذات کے پھولوں سے پُر تھا دامن
ایک درویش کہ تھا ہر دیش کا خیر اندیش
توڑے جس نے مکر و سیاست کے بندھن
اس کی قربانی کی کہانی لا فانی
جس نے کیا تھا دیش کو ارپن تن من دھن
سچائی اور نیکی کا اوتار تھا وہ
یاد سدا رکھیں گے اس کو اہلِ زمن

**ایسے راہبروں کے دم سے قایم ہے**
**پیار کا دھن، جیون کی لگن، دھرتی کی پھبن!**

رشمی پٹیالوی

# محسنِ اعظم گاندھیؔ

تیرا ذکرِ پاک اے گاندھی! ہر اِک محفل میں ہے
احترام اے رہبرِ کامل! ترا ہر دِل میں ہے
تُو نے اپنی زندگی دے دی وطن کے نام پر
آشیاں اپنا جلا ڈالا چمن کے نام پر
مِٹ گیا تُو خود مگر بگڑی بنا دی قوم کی
بے طرح سوئی ہوئی قسمت جگا دی قوم کی
اِک انوکھی شان سے جامِ شہادت پی لیا
جان دے کر تُو نے نامِ آدمی اُونچا کیا
شمع روشن تُو نے کی جاں باز پروانے بڑھے
سرفروشی کی تمنّا لے کے مستانے بڑھے
راہ جو تُو نے دِکھائی راہِ منزل بن گئی
تیری ہر کاوِش بالآخر سعئِ حاصِل بن گئی
جادۂ دُشوار کو آساں بنا کر رکھ دیا
رہبروں نے سر ترے نقشِ قدم پر رکھ دیا
مرحلے دار و رسن کے کھیل بن کر رہ گئے
سرفروشانِ وطن ہنس کر بلائیں سہہ گئے
نعرۂ بیدار سے اِک حشر برپا کر دیا
جذبۂ حُبِّ وطن ہر دِل میں تُو نے بھر دیا

تیرے عزم و فکر میں تھے عرش پیما حوصلے
رہ نمائی میں بڑھے منزل بہ منزل قافلے
تیرا ایثار و عمل آئینہ دارِ زندگیؔ
زندگی نے تجھ سے پایا اعتبارِ زندگی
تیری حکمت کس قیامت کی کرامت کر گئی
آپ اپنی موت انگریزی حکومت مر گئی
چاند سُورج کی طرح عالم میں تیرا نام ہے
آج تیرے نام سے روشن وطن کا نام ہے
جو کسی کے بھی نہ قائل تھے ترے قائل ہوئے
چُوم کر تیرے قدم ذرّے مہ کامل ہوئے
حق تو یہ ہے تیری راہیں سجدہ گاہیں بن گئیں
تُو جہاں بیٹھا وہاں عالم پناہیں بن گئیں
حقِّ آزادی ترے اعجاز ہی کی دین تھا
رہبرِ انسانیت نہرو تری ہی دین تھا
کیوں نہ تیری شانِ قربانی کو جانے گا وطن
رہتی دُنیا تک ترا احسان مانے گا وطن
مُختصر بھی ہے مفصّل بھی ہے بس اِتنا بیاں
ہوگیا آزاد تیری سعی سے ہندوستاں

صغیر احمد صوفی

## رہبرِ کامل

نغمۂ امن ہر اِک رُوح میں گھُل جاتا ہے
رہبرِ قوم کا پیغام جو یاد آتا ہے
اُس کو حاصل سبھی راہوں کی شناسائی تھی
اُس کے قدموں میں ہر اِک منزلِ دانائی تھی
سوزِ ادراک لیئے، گرمیِ پندار لیئے
دِل میں جمہور کی اِک دولتِ بیدار لیئے
زندگانی کا نیا ذہن میں معیار لیئے
بے نیازانہ صداقت کا وہ شیدائی تھا
اُس کے کردار میں اعجازِ مسیحائی تھا

زندگی قوم کی تھی سنگِ ملامت کی طرح
دِل بجھے رہتے تھے احساسِ ندامت کی طرح
شمعِ عرفان ہر اِک دِل میں جلائی اُس نے
رُوحِ خوابیدہ کو اِک مژدۂ تعمیر دیا
بربریت کا ہر اِک دَور میں تھا رقصِ دوام
کتنے سُقراطوں کو پینا ہی پڑا زہر کا جام
گولیاں کھا کے نہ قاتل کا لیا جس نے نام
اُس اہنسا کے پیامی کا سبق یاد رہے
بابِ جمہور کا اِک ایک ورق یاد رہے

یُوسف ناظم

## "چراغِ رہ گُذر"

یہ ایک شخص کی محنت ہے ایک شخص کی دین
کہ آج اپنے وطن کا بلند ہے پرچم
وہ شخص جس نے اہنسا کا درس ہم کو دیا
جو تھا تو آگ کا شعلہ پہ فطرتاً شبنم
دُعا تھی جس کی، وطن میں ہر ایک شاد رہے
ہر ایک زخم کو تھا جس کا نام بھی مرہم
وہ شخص لائقِ صد احترام ہے یارو
جو کھینچ لایا چمن میں بہار کا موسم
یہ اور بات ہے ہم بھول جائیں اس کو مگر
چراغِ راہ گُذر ہیں اُسی کے نقشِ قدم
ہُوئے ہیں جس کے اُخوّت کی روشنی پھیلی
وہ روشنی نظر آتی ہے آج کچھ مدّھم
ہزار تُند ہوائیں چلیں چمن میں، مگر
ہمارے ہاتھ سے چھُوٹیں نہ آشتی کے عَلَم

جلاؤ رُوح کی شمعیں، جلاؤ دِل کے چراغ
کہ ایک کُنبے کی محفِل کبھی نہ ہو برہم

مہدی پوناگڈھی

# اے باپو

جو راہ منزلِ وہم و گماں کو جاتی تھی
بنا دیا اُسی جادے کو معتبر تُو نے
نویدِ فصلِ بہاراں ہوئی تری کاوش
نئی سحر کی زمانے کو دی خبر تُو نے

ترا شعور تھا ظلمت سے برسرِ پیکار
تمام عمر جلایا دل و جگر تُو نے
جہاں میں تُو نے اہنسا کو سرفراز کیا
بشر کو بخش دیا، زیست کا ہنر تُو نے

جہاں میں مسلکِ صدق و صفا کو عام کیا
پیامِ امن و مسرت کے نامہ بر تُو نے
تجھے ملا تھا زبان و قلم کا وہ حربہ
کیئے عدو کے مسخر دل و نظر تُو نے

جہاں میں تُو نے بڑھایا وقار بھارت کا
کیا تھا اس طرح طے زیست کا سفر تُو نے
ترا اُصول تھا "کانٹے بھی ہیں وقارِ چمن"
جہاں کو دی تھی نئی وسعتِ نظر تُو نے

اس آرزو میں کہ یک جہتی کو فروغ ملے
خود اپنی زیست لگا دی تھی داؤں پر تُو نے
اُسی پہ چل کے یہ دُنیا سکون پائے گی
جگر کے خوں سے بنائی جو رہگذر تُو نے

تھی نذرِ جاں تری بہبودیٔ بشر کے لیئے
کِھلایا خون سے گُل، قصہ مختصر تُو نے

یعقوب راہی

# "گاندھی جی کے نام"

گُذشتہ شب کے امین بن کر کھڑے ہو تپھر کے رُوپ میں تم
میں دُھندلی دُھندلی سحر کا شاعر، نظر جُھکائے ہوئے کھڑا ہوں
اور اپنے چڑھتے اُترتے سائے سے اُلجھا اُلجھا، ذرا ذرا سا
طویل اور اجنبی سفر میں ہجومِ آدم بھٹک رہا ہے!

کِرن کِرن دُھوپ اُگل رہی ہے کہ چھاؤں کا آسرا نہیں ہے
بدن بدن زخم کِھل رہے ہیں، مگر کوئی چارہ گر نہیں ہے
ہوا جو چلتی ہے کاٹتی ہے، فضا کی یکسوئی توڑتی ہے
زمین کی ریت خار بن کر بھٹکتے تلوؤں میں چُبھ رہی ہے

سُنا ہے مَیں نے کہ تم "اہنسا" کو ظُلم کا حل سمجھ رہے تھے
مگر تمہارے بھی جسم و جاں سے لہو کے دھارے اُبل پڑے تھے
اِسی لیئے میں کہ عصرِ حاضر کا ایک باغی، یہ چاہتا ہوں،
اگر مِٹانا ہے ظُلم تو اُس کے واسطے ظُلم لازمی ہے
اگر دبانی ہے جنگ تو اُس کے واسطے جنگ لازمی ہے

کہو تمہارا خیال کیا ہے، تمہارے ہونٹوں پہ چُپ سی کیوں ہے؟
خود اپنے سائے سے ڈرنے والے، بتاؤ کب تک ڈرا کریں گے!؟

ایم۔ اے۔ حفیظ بنارسی

# اَمر وانی

اے فقیرِ ہند اے شاہنشہِ بے تخت و تاج  پیکرِ عالی خیال و بندۂ سادہ مزاج
اے کہ بعدِ مرگ بھی ہے ذہن و دل پر تیرا راج  پیش کرتی ہے تجھے دنیا عقیدت کا خراج
اِک جہاں کے لب پہ تیرا نام ادب سے آئے ہے
اِک زمانہ آج تیری داستاں دہرائے ہے

اے کہ تیری ہر ادا تھی جاں نواز و دل نشیں  اے کہ تیری زندگی تھی اتحادِ کفر و دیں
اے کہ تیرا قول و فعل آئینۂ حسنِ یقیں  اے اہنسا کے پرستار اے صداقت کے امیں
جنگِ آزادی کو تو نے اِک نیا حربہ دیا
محوِ حیرت سن کے جس کو سب تھے وہ نعرہ دیا

بادۂ حبِّ وطن سے زندگی تھی تیری مست  تو نے اپنے دشمنوں کو دی محبت سے شکست
تجھ کو تھا منظور ایسا انتظام و بند و بست  جو مٹا دے امتیازِ نقشۂ بالا و پست
داغ نفرت کا ترے آئینۂ دل میں نہ تھا
فرقِ رنگ و نسل و مذہب تیری محفل میں نہ تھا

یوں تلاشِ حق میں سرگرداں رہا تو عمر بھر  کی نہ کچھ بھی فکر اپنی، لی نہ کچھ اپنی خبر
خدمتِ نوعِ بشر کرتا رہا شام و سحر  تیری انساں دوستی نے کر دیا تجھ کو امر
قاصدِ امن و اماں گردانتے ہیں تجھ کو لوگ
ایک "انسانِ معظم"[1] جانتے ہیں تجھ کو لوگ

تو نے بتلایا کہ راہِ حق پہ چلنا چاہیے  ظلم و استبداد کے آگے نہ جھکنا چاہیے
کوئی مقصد ہو مگر "ہنسا"[2] نہ کرنا چاہیے  نیک منزل کے لیے رستہ بھی اچھا چاہیے
روشنی سے مات کھائی ہے سدا ظلمات نے
اِک نئی دنیا دکھائی تیری تعلیمات نے

آج تیری یاد میں سجتی ہے محفل ہر جگہ  جشنِ صد سالہ منایا جا رہا ہے جا بجا
اے شہیدِ قوم لیکن سن یہ غم کا ماجرا  تیرے گھر میں چاک ہے تیرے اصولوں کی قبا
بھول بیٹھے ہیں وطن والے ترے پیغام کو
صرف استعمال کرتے ہیں یہ تیرے نام کو

۱: مہاتما
۲: تشدّد

شاعر - بمبئی

تیری باتوں پر وطن والے عمل پیرا نہیں — کوئی سچے دل سے تیری راہ پر چلتا نہیں
تیری جرأت جس میں ہو ایسا کوئی ملتا نہیں — دل میں وہ جذبہ نہیں ہے سر میں وہ سودا نہیں
لڑ رہے ہیں چھوٹی چھوٹی بات پر اہلِ وطن
سی رہے ہیں اپنے ہاتھوں اپنی عظمت کا کفن

چھا رہی ہے ہر طرف ظلم و تشدد کی گھٹا — اِک تعصب اور تنگ نظری کی پھیلی ہے وبا
بڑھ کے دردِ قوم ہوتا جا رہا ہے لا دوا — بحرِ طوفاں خیز ہے ناکام ہے ہر نا خدا
کاش کوئی پھر جگا دے اہلِ بھارت کا ضمیر
کاش مل جائے وطن کو پھر کوئی تجھ سا فقیر

پھر کوئی دردِ وطن کی چارہ فرمائی کرے — کاش پھر تجھ سا کوئی کارِ شکیبائی کرے
ذہن پر ہو حکم فرما، دل پہ دارائی کرے — کاش پھر تیری طرح کوئی مسیحائی کرے
جادہ پیما سوئے منزل پھر ہو اپنا کارواں
رشک سے دیکھیں زمینِ ہند کو اہلِ جہاں

تیری باتوں پر عمل پیرا ہوں گر اہلِ وطن — جھوم اُٹھے مسکرا کر وادیٔ گنگ و جمن
ایک ہو جائیں محبت سے جو شیخ و برہمن — رشکِ فردوسِ بریں ہو پھر وطن کی انجمن
رہنما اب تک تری تعلیم روحانی تو ہے؛
تو نہیں تو کیا ہوا تیری "امر وانی" تو ہے!

## فخرِ مجسم

قلم تھا جس کی رفاقت کو سرنگوں ہر دم
وہ اُس کی مشعلِ شعلہ فشاں و دستِ کرم
نصیب جس کو تھی قلب و نظر کی آزادی
خوشا وہ جادۂ بابائے قوم، فخرِ مجسم

جہاں میں جس نے قیامت کا کھیل کھیلا تھا
تھا اُس کا سارا جہاں، پھر بھی وہ اکیلا تھا

منجو قمر

حبیب الرحمن راہی

# گذر گئی یہ صدی بھی!

گذر گئی یہ صدی بھی اسی تمنّا میں!

بہار آئے چمن میں تو ہم بھی رقص کریں
کسی حسین، کسی گلبدن کی مانگ بھریں
گلوں کی پنکھڑیوں پر لکھیں لبوں کی غزل
سنائیں سارے زمانے کو خوشبوؤں کی غزل
چمن کے عارضِ رنگیں پہ گیت لہرا دیں
فضا میں غنچۂ نو رَس کے جام چھلکا دیں
کسی شہیدِ چمن کا منائیں جشن یہاں
جلا کے رکھ دیں بجائے چراغ زخمِ نہاں
روش روش کو سجائیں نئی دُلہن کی طرح
ہر ایک شاخ نظر آئے ناک کرن کی طرح
یہ آرزو ہے اُجالوں سے اب وضو کر کے
نگاہ، دامنِ گلریز پر نماز پڑھے
مگر یہ آرزو پوری کبھی نہ ہو پائی —
بہار جب بھی یہاں آئی، سوگوار آئی

گذر گئی یہ صدی بھی اسی تمنّا میں!

ہر ایک دور میں کچھ یونہی نظم و ضبط رہا
کبھی گلوں کا، کبھی خوشبوؤں کا قتل ہوا
ہر ایک دور میں نقشے بنائے خنجر نے
ہر ایک دور میں ایوان ڈھائے ہیں شر نے
ہر ایک دور میں کوئی مسیح آیا ہے
وہ اپنے ساتھ مداوائے درد لایا ہے
مسیح خوابوں کا، شیشوں کا، دل کے زخموں کا
مسیح گیتوں کا، نغموں کا، آرزوؤں کا
جو زخم بھرنے کو آیا، وہ زخم کھا کے گیا
اندھیری رات میں لیکن دیئے جلا کے گیا
ہر ایک دور میں اُس کی صدی منائی گئی
ہزاروں جشن ہوئے اور خوشی منائی گئی
مجسّمے بھی ہوئے نصب، مقبرے بھی بنے
نمائشیں بھی سجیں اور جلوس بھی نکلے
ہوئے تماشے، تماشوں میں کھو گئی دنیا
سسکتی رہ گئی وہ رُوح، سو گئی دنیا

گذر گئی یہ صدی بھی اسی تمنّا میں!

زمانہ اک دلِ شاعر کا کرب کیا جانے
کسے پڑی ہے جو زخمِ جگر کو بہلانے
مجھے عروسِ تمنّا کی مانگ بھرنی ہے
ہر ایک آبلۂ دل کی لاج رکھنی ہے
یہ درد و کرب کا لاوا ہمیں مٹا دے گا
اُبل پڑا جو کسی روز تو بہا دے گا
میں کیوں نہ ساغرِ رنگیں سے دل کو بہلا لوں
چھلکتا رہتا ہے ہر دم، ذرا تو سنبھالوں
کبھی تو آئے گا وہ دن کہ امن کے سوتے
تمام دھرتی کی چھاتی کے زخم دھو دیں گے
کبھی تو جھانکے گی وہ پیار کے دریچوں سے
کبھی تو کھولے گا کوئی خوشی کے دروازے
میں انتظار ہی کرتا رہا — کہ آئے گی
حسین خوابوں کی کوئی حسین شہزادی
دھماکے کھا گئے نغموں کو، رہ گئیں چیخیں
یہ کہہ کے دامن پرستوں سے اپنا سر پٹکیں

گذر گئی یہ صدی بھی اسی تمنّا میں!

شاعر، بمبئی

وقار خلیل

# گاندھی دوہے!

تن پہ لنگوٹی، ہاتھ میں لاٹھی، لب پر رام رحیم
دُھن کا پکّا، بات کا سچّا، نیک، مہان، عظیم

جب جب نفرت پھن پھیلائے، دھرتی ڈسنے آئے
باپو کے آدرش سنبھالو، پھر وہ مُنہ کی کھائے

بھگتی رس اور مانوتا جب اپنے قدم ڈگمگائیں
اُس دم دنیا والو! سب کو گاندھی جی یاد آئیں

مُلکوں مُلکوں انسانوں کی عظمت کے گُن گائے
سب دھرموں کا ایک خدا ہے اُس کو پُوجا جائے

بھارت کی آزادی یُگ یُگ اِس بلوان کا نام جپے
جو گاندھی کہلایا لیکن، سچ مچ وہ اوتار اُسے چھپے

لاٹھی، گولی خود کھائی، پھر جیون کا بلیدان دیا
اے بھارت کے رہنے والو! اُس نے ہم کو مان دیا

اختر بستوی

# حقیقی خراجِ عقیدت

دلوں سے دُور کریں بُغض و نفرت و کینہ
عداوتوں سے دماغوں کو اپنے، پاک کریں
خیال و فکر میں پالیں نہ انتقام کے ناگ
خلوص و مہر کا دامن کبھی نہ چاک کریں
یہ سوچ لیں کہ چلے گی اگر ہوائے فساد
ہرا نہ ہوگا کبھی نخلِ امن و آزادی
نہ بھول جائیں کہ طاقت ہے مِل کے رہنے میں
جو اتحاد نہ ہوگا تو ہوگی بربادی
تنازعات اگر ہوں سماج میں پیدا
تو اُس کو دُور کریں عدل سے، شرافت سے
بجائے ظلم و تشدّد کے، یہ کریں تدبیر
کہ جیت لیں دلِ اغیار کو محبّت سے
دبا کے بے کس و مجبور کا گلا نہ ہرگز،
حقوق اپنے نہ منوائیں ظلم و جبر کے ساتھ
اگر ہو چیز کسی دوسرے کی، قبضے میں
تو اُس کو سونپ دیں خود ہی سکون و صبر کے ساتھ
مٹائیں بھوک جو اپنی تو یہ بھی ہو کوشش
کسی کا پیٹ نہ خالی رہے زمانے میں
بنائیں اپنے لئے قیمتی لباس اگر
تو غیر بھی نہ ہوں بے بس بدن چھپانے میں
زباں پہ نام ہے بابائے قوم کا، لیکن
یہ کیا کہ ذکر پہ باپو کے، اکتفا کر لیں
منا رہے ہیں جو گاندھی کا جشنِ صد سالہ
اُنہیں بتاؤ کہ یہ سب بھی وہ ذرا کر لیں



# گاندھی ناٹک

رونق دکنی سیمابی

# رکت دان

## افرادِ تمثیل :-

| | | |
|---|---|---|
| سلیم : ایک مسلم نوجوان | رمیش : ایک ہندو نوجوان | رنجیت سنگھ : ایک سکھ نوجوان |
| ماں : سلیم کی ماں | ماں : رمیش کی ماں | باپ : رنجیت سنگھ کا باپ |
| شمع : سلیم کی بہن | لچھمی : رمیش کی پتنی | چارلس : ایک کرسچین جوان |
| راحت میاں : سلیم کے ماموجان | جیتو : رمیش کا نوکر | ڈاکٹر ۔ آرمی افسر وغیرہ |

—— ○○ ——

سلیم کا مکان ۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی ہے ۔ جس سے مکین کی نفاست پسندی ظاہر ہوتی ہے شمع آرام کرسی پر لیٹی خیالوں میں کھوئی ہوئی ہے ۔ پاس ہی میز پر "شاعر" بمبئی کا غالب نمبر رکھا ہوا ہے ۔ شاید ابھی ابھی اس نے اس کا مطالعہ کیا ہے ۔ اب وہ گنگنانے لگی "نکتہ چیں ہے غمِ دل . . . نکتہ چیں ہے . . ." ایسے میں ڈاکیہ کی آواز آتی ہے "چٹھی !" پردہ ہٹا کر ماں بے تابانہ اندر آجاتی ہے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے خط اُٹھا کر بیٹی کے حوالے کرتی ہے ۔

سلیم کی ماں : خدا کرے ! یہ خط بھیا ہی کا ہو ۔ انہیں لکھنؤ گئے آج دو ہفتے سے زیادہ گذر گئے ہیں ۔ کس کا خط ہے شمو بٹیا ۔ کہاں سے آیا ہے یہ خط ؟

شمع : (جس کے چہرے پر حجاب کی سُرخی دَوڑ جاتی ہے) بس کیجئے امّی ! آپ کو تو بس ایک ہی رٹ لگی رہتی ہے کہ کب بیٹی کے ہاتھ پیلے ہوں اور کب یہ یہاں سے دفع ہو جائے ۔

ماں :- تو ابھی نادان ہے شمو ۔ جوان بیٹی ماں باپ کے سینے کا بوجھ ہوتی ہے ۔ خیر . . . یہ خط کس کا ہے ۔ پڑھتی کیوں نہیں بیٹی ۔

شمع :- خط بھیا کے نام ہے اور آیا ہے مقامی بلڈ بنک (Blood-Bank) سے ۔

ماں : اے لو ! یہاں سے کس نے بھیجا ہوگا یہ خط میرے بچے کے نام اور یہ بلڈ بنک کیا چیز ہے بھلا ؟

(شمع خط میز پر رکھ دیتی ہے)

ماں :- (بے تابانہ) ارے تو یہ خط کھولتی کیوں نہیں پڑھو تو سہی کیا لکھا ہے اس میں ۔

شمع :- آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں امّی بھیا کے

نام خط ہے۔ نا بابا میں اسے نہ کھولوں گی۔

ماں: (خط پلک کر دیتی ہے) اونہہ! یہ خط تو انگریزی میں ہے۔ میں تو انگریزی پڑھنے سے رہی۔ دو چار جملے بول لینا یا سمجھ لینا اور بات ہے۔ لے ذرا پڑھ تو دے بیٹی۔ سلیم کیوں بُرا مانے گا۔

شمع: (خط پڑھتی ہے۔ اس کا چہرہ فرطِ انبساط سے دمک اُٹھتا ہے) شکر ہے خدا! تُو نے میرے بھائی کو عزت دی۔

ماں: ارے، یہ کیا پہیلیاں بجھائی جا رہی ہیں۔ صاف صاف بتاتی کیوں نہیں۔

شمع: امی یہ خط بلڈ بنک کے ڈاکٹر انچارج سے آیا ہے۔ انہوں نے بھیا کو خون کے دینے پر مبارکباد دی ہے۔ کس قدر خوش قسمت ہیں ہم بھی۔ ہمیں بھی انسانیت کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے جبکہ انسانیت کی خدمت قوم کی خدمت ہے اور قوم کی خدمت خدا کی عبادت سے کم نہیں۔

ماں: ارے تو تو ایک ہی سانس میں کیا کچھ کہہ گئی شمو! ارے یہ خون کیسا اور یہ خدمت اور عبادت والی بات کیا ہے۔ اور تو اور یہ بلڈ بنک (سر پر آنچل ڈال لیتی ہے) میرا بچہ تو خیریت سے ہے نا۔

شمع: (ہنستی ہے) کمال ہے امی! کیا ہوا ہے بھیا کو، وہ بھلے چنگے ہیں ہی۔

(سلیم آفس سے تھکا ماندہ داخل ہوتا ہے اور کرسی پر بیٹھ کر پاؤں پسارے ایک لمبی سانس لیتا ہے۔ ماں اور بہن چپ ہیں۔ بہن کے چہرے پر مسرت کی جھلکی ہے مگر ماں کچھ پریشان سی ہے۔ سلیم کچھ سمجھ نہیں پاتا ہے)

سلیم: (ماں کی طرف دیکھ کر) کوئی خط آیا ہے راحت ماموں کا۔ (شمع کے ہاتھ میں خط دیکھ کر) خط آیا تو ہے مگر امی یہ اداسی کیوں ہے۔ شمو نے پھر کچھ شرارت کی ہے۔ ہے نا۔

(شمع بھائی کے ہاتھ میں خط تھما دیتی ہے اور اندر چلی جاتی ہے۔ سلیم خط پڑھتا ہے، اس کا چہرہ بھی، خوشی سے کھِل اٹھتا ہے)

سلیم: (آپ ہی آپ) کیا ضرورت تھی اِس خط کی بھلا۔ میں نے ایک شہری کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا تھا۔ (شمع چائے لاتی ہے اور تپائی پر رکھ دیتی ہے)

شمع: امی اب جو بھیا آگئے ہیں۔ یہ ہی کچھ ساری باتیں بتا سکیں گے جسے جان کر آپ بھی خوش ہوں گی۔

ماں: ارے یہ کیا بتائے گا۔ بیٹا اپنی لگن میں کھویا ہوا۔ بیٹی اپنے خیالوں میں گُم۔ ارے لوگو مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔ سمجھاؤ مجھے خدا کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے۔ آخر میں تمہاری ماں ہوں ماں۔

سلیم: (ہنستا ہے) ارے توبہ! اِس میں کیا شک ہے امی! آپ اکثر گھبرا جاتی ہیں۔ بات کچھ بھی نہیں یہ خط میرے نام مقامی بلڈ بنک سے آیا ہے

.....

ماں: یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر یہ بلڈ بنک، بلڈ بنک ہے کیا آخر؟ اور یہ خون والا معاملہ کیا ہے۔

سلیم: بات یوں ہے امی۔ آج سے قریب ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں آفس میں تھا۔ ہاسپٹل سے میرے نام ٹیلیفون آیا کہ میں جلد از جلد وہاں پہنچوں۔ وہاں جانے پر مجھے معلوم ہوا کہ ایک مریضہ کا آپریشن ہوا ہے اور اُسے میرے خون کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ہم دونوں کا بلڈ گروپ Blood-group ایک ہے۔ فوراً میرا خون لیا گیا اور مریضہ کے جسم میں دوڑایا گیا۔ خدا کا شکر ہے امی! مریضہ موت کے چنگل سے زِنچ نکلی اور اب وہ صحیح و سلامت گھر بھی واپس لوٹ آئی ہے۔

شمع : (قطع کلامی کرتے ہوئے) مگر بھیا ڈاکٹروں کو کیسے معلوم ہوتا ہوگا کہ فلاں کا خون فلاں سے ملتا ہے۔

سلیم : وہ یوں ہے عموماً دفتروں میں، کارخانوں میں حتیٰ کہ ہر شہری کا بشرطیکہ وہ اس نیک کام کے لئے آمادہ ہو، خون کا ٹیسٹ (Test) کر لیا جاتا ہے۔ پھر اس کی الگ الگ گروپنگ کی جاتی ہے۔ اب ہر گروپ کا نمبر لگا کر اس گروپ کے تحت جتنے بھی لوگ آتے ہیں اُن کے نام اور پتے رجسٹر میں درج کر لئے جاتے ہیں۔ جب کبھی ہاسپٹل میں کسی مریض کو خون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو پہلے اُس کے خون کا ٹیسٹ کر کے اُس کا گروپ دریافت کر لیتے ہیں۔ پھر اس کی اطلاع بلڈ بنک کو دی جاتی ہے۔ بلڈ بنک والے فوراً متعلقہ گروپنگ میں پہلے جس شخص کا نام ہوگا، اُسے ٹیلیفون یا اپنی موٹر گاڑی سے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ فوراً ہاسپٹل پہنچے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ سمجھیں۔

ماں : تو گویا سلیم تو نے خون کا ٹیسٹ بھی کرا لیا۔ اُس کی گروپنگ بھی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی تیرا نام اور پتہ بھی رجسٹر میں درج ہو گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں تو نے ایک مہینہ پہلے قربانی کے بکرے کی طرح اپنے خون کی بھینٹ بھی چڑھا دی۔ کس قدر ڈھٹائی ہے اِس لڑکے میں۔ . .

شمع : (ہنستی ہے) ڈھٹائی! اس میں ڈھٹائی کی کیا بات ہے بھلا۔

ماں : (غصّہ ہو جاتی ہے) تو چُپ رہ چھوکری! ہاں تو سلیم میں تجھ سے پوچھتی ہوں کہ یہ تو نے سب کچھ کس سے پوچھ کر کیا۔ کیا یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ گھر میں ابھی ایک بوڑھی ماں زندہ ہے، اس سے بھی اجازت لے لینی چاہیے۔ جب تجھے ٹیلیفون ملا تو تجھے چاہیے تھا کہ تو دوڑا ہوا گھر آتا۔ مجھ سے اجازت طلب کرتا۔ شاید میں اجازت دے بھی دیتی۔ مگر تُو نے تو . . . . . .

سلیم : یہ بھی خوب رہی امّی۔ دراصل آپ سمجھیں نہیں۔ اِس طرح کے Serious Cases میں ایک لمحہ بھی بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے کہا میں ٹیلیفون پا کر گھر آتا۔ ہو سکتا ہے آپ اجازت دینے میں ردّ و کد کرتیں۔ میں آپ کو سمجھانے لگتا۔ جانتی ہیں اِس طرح کس قدر وقت ضائع ہوتا اور اِدھر مریض کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ ایسے نیک کام میں اجازت کیسی؟

ماں :۔ ہاں اجازت کیسی۔ میں جیسے کوئی چیز ہی نہیں، وہ ماں جو اپنے ننّھے کے لئے سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ دودھ پیتے ننّھے کو سینے سے لگا کے آرام چین سب بھول جاتی ہے۔ اُس کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ پر وہ کھِل اُٹھتی ہے۔ اُس کی مناسب غذا اور اس کی صفائی کا ہر دم خیال رکھتی ہے۔ اُس کے پوتڑے دھوتی ہے اور جب خدانخواستہ ننّھا بیمار پڑ جاتا ہے تو اپنی جان کی بازی لگا دیتی ہے اور جب . . . . .

شمع : (ہنستی ہوئی اپنی امّی سے لپٹ جاتی ہے اور سلیم بھی بے تابانہ اپنی ماں کے قریب آ جاتا ہے۔ میری امّی، میری اچھی امّی۔ یہ کون کہتا ہے کہ آپ نے ہمیں پالا پوسا نہیں، پڑھایا لکھایا نہیں اور . . .

سلیم :۔ بات دراصل یوں ہے امّی۔ آپ نے اچھی طرح سمجھا نہیں کہ یہ سب کیا ہے۔ کسی کی جان بچا لینا کیا کارِ ثواب ہونے کے ساتھ زندگی کے سچے اصولوں میں شامل نہیں؟ انسان اگر اپنے فرائض کو نہ سمجھے اور اُن کے بجا لانے میں کوتاہی کرے تو پھر وہ انسان ہی کہاں رہ جاتا ہے۔ آپ ہی نے تو ہمیں فرض کی اہمیت اور پہچان اور اس کے

بجالانے کا سبق پڑھایا ہے اور آج جب کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے تو خوش ہونے کے بجائے آزردہ خاطر ہوتی ہیں آپ .....

ماں ۔ یہ سب کچھ سہی بیٹے۔ مگر اس کارِ خیر میں اس بات کا تو خیال رکھنا ضروری ہے کہ ـــــ اپنا خون اپنے ہی لوگوں کے کام آئے، میرا مطلب ....

سلیم ۔ یہ بھی خوب رہی امی (ہنس دیتا ہے) خون دیتے وقت یہ سب کہاں دیکھا جاتا ہے بھلا۔ اس وقت تو سب کی مجموعی کوشش یہی رہتی ہے کہ ایک قیمتی جان تلف نہ ہو جائے۔

ماں :۔ (پھر برہم ہو جاتی ہے) اس کے معنی یہی ہوئے ناکہ تو نے جو خون دیا ہے وہ اپنی ذات پات والا نہیں تھا بلکہ ....

سلیم ۔ کس قدر تنگ نظری ہے واللہ! یہی تنگ نظری ہمارے جمہوری نظام کی بنیادیں کھوکھلی کر دیتی ہے۔ یہی تنگ نظری فرقہ وارانہ تعصب کی دیوار قوموں کے بیچ کھڑا کر دیتی ہے جس سے دلوں میں محبت، باہمی ہمدردی کے بجائے شک و شبہہ، نفرت و عداوت کے جذبے پرورش پاتے ہیں۔ انسان کو انسان پر بھروسہ نہیں رہتا۔ ایک، دوسرے سے ڈرتا ہے۔ آج آزادی کے ۲۲ سال کے بعد بھی یہی تنگ نظری شاملِ حال رہی تو بس ....

ماں :۔ میں اس قدر بھی تنگ نظر نہیں سلیم جیسا کہ تو نے سمجھ رکھا ہے۔

سلیم ۔ یہ رہی کشادہ دلی۔ میں نے جس عورت کو خون دیکر موت سے بچا لیا ہے، وہ تھی ذات کی برہمن۔

ماں :۔ جزاک اللہ۔ بیٹے، خدا تیری عمر دراز کرے۔

شمع :۔ اچھا بھیا یہ بتائیے کہ کیا مرد کا خون عورت کے اور اسی طرح عورت کا خون مرد کے کام آتا ہے؟

سلیم : اس میں کوئی تخصیص نہیں شمو، بشرطیکہ دونوں کا خون ایک گروپ کا ہو۔

شمع ۔ کسی کا خون ایک بار لینے کے بعد ڈاکٹر اس آدمی کا کتنے دن تک خون نہیں لیتے ہوں گے۔

سلیم : تین مہینے یا کبھی اس سے زیادہ عرصے تک، تاکہ اسے بھی سنبھل جانے کا موقع ملے۔

شمع : خون کی گروپنگ کے بعد خون الگ الگ بڑی بڑی بوتلوں میں جمع کر لیا جاتا ہوگا۔ تاکہ وقتِ ضرورت کام آسکے۔ مگر بھیا! کیا خون وقت کے ساتھ ساتھ سڑ نہیں جاتا ہوگا۔ بدبو پیدا نہ ہوتی ہوگی اس میں، بلکہ میرا قیاس ہے کہ اس میں کیڑے بھی پڑ جاتے ہوں گے۔

سلیم ۔ یہ بات نہیں۔ گروپنگ ہونے کے بعد ہی خون کو سائنسی اصولوں پر خشک کر لیا جاتا ہے جو پوڈر کی صورت میں ہو جاتا ہے جسے ڈاکٹر پلازما Plazma کہتے ہیں۔ یہ بعد احتیاط الگ الگ محفوظ رکھا جاتا ہے اور ضرورت پڑنے پر انہیں سائنسی اصولوں پر پھر استعمال کیا جاتا ہے۔

ماں :۔ اب بس کر شمو۔ تیرا بھیا تھک گیا ہوگا۔ جا دسترخوان بچھا دے۔

شمع ۔ ابھی جاتی ہوں، مگر ان باتوں کی جانکاری ہر مرد و عورت کے لئے ضروری بھی ہے امی۔ اس طرح مستعدی سے جذبے ہمہ وقت بیدار رہتے ہیں۔

(شمع اندر چلی جاتی ہے)

ـــــ ۲ ـــــ

رمیش کا گھر۔ ریڈیو پر بھجن ہو رہا ہے "بھگت کے بس میں ہیں بھگوان"۔ نوکر جیتو بولے ہولے تالی بجاتا ہے اور جھوم رہا ہے۔ [illegible] ہوتی ہے۔ دروازہ کھلنے پر ڈاکٹر اندر داخل ہوتا ہے۔ ریڈیو بند کر دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر : (ادھر ادھر دیکھ کر) کہاں گئے یہ لوگ۔ رمیش

کہاں ہیں؟

جیتو۔ رمیش بابو اپنی پتنی کے ساتھ باہر ٹہلنے گئے ہیں جی۔ ان ہی مندر گئی ہوئی ہیں۔ آپ بیٹھئے جی۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ (ڈاکٹر بیٹھ جاتا ہے اور سگریٹ سلگاتا ہے۔ جیتو اندر جاتا ہے اور چائے لاکر تپائی پر رکھ دیتا ہے اور خود نیچے بیٹھ جاتا ہے)۔

ڈاکٹر: ارے یہ کیا جیتو، نیچے کیوں، اُدھر بیٹھ! یہ اونچا بنچ کیا۔

(جیتو تھوڑے فاصلے پر بنچ پر بیٹھ جاتا ہے ڈاکٹر چائے پینے لگتا ہے)۔

جیتو: ڈاکٹر صاحب! ایک بات پوچھوں جی، آپ بُرا تو نہ مانیں گے؟

ڈاکٹر: کیا بات ہے، پوچھ بھی۔

جیتو: جب بہو جی کو ہاسپٹل میں خون دیا جا رہا تھا تو میں بھی وہاں کھڑا تھا جی۔ رمیش بابو کے ہوتے ہوئے آپ نے کسی دوسرے آدمی کا جو خون لیا تھا، تو میری سمجھ میں یہی بات آئی جی کہ پتی کا خون پتنی کو کسی طرح بھی نہیں دیا جا سکتا۔ ایسا ہو تو جی پھر پتی پتنی کہاں رہتے، یہ لوگ بھائی بہن نہ ہو جاتے جی رام رام۔

ڈاکٹر: (چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دیتا ہے اور سگریٹ جلاتے ہوئے) یہ بات نہیں جیتو۔ پتی پتنی ایک دوسرے کو خون دے سکتے ہیں اگر دونوں کا خون ایک دوسرے سے میل کھاتا ہو۔ رمیش کا خون دوسرے گروپ کا تھا اس لئے اُن کا خون اُن کی پتنی کے شریر میں نہیں دیا گیا۔

جیتو: ایک بات اور جی۔ یہ خون کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کیوں۔ شہر میں ہر روز کتنی بھیڑ بکریاں کٹتی ہیں، کیوں نہ ان کا خون جمع کر لیا جاتا اور اپنے کام لایا جاتا جی۔

ڈاکٹر: نہیں جیتو، ایسا ہو نہیں سکتا۔

(رمیش اور اُس کی پتنی اتنے میں اندر آتے ہیں۔ دونوں ڈاکٹر کو نمستے کرتے ہیں۔)

ڈاکٹر: نمستے۔ کہو رمیش کیسے ہو اور آپ کی پتنی کا کیا حال ہے۔ ویسے کافی Improvement معلوم دیتا ہے۔

رمیش: آپ کی کرپا ہے ڈاکٹر صاحب۔ آپ کے کہنے کے بموجب انہیں صبح و شام ٹہلنے کے لئے باہر لے جاتا ہوں۔

لچھمی: (نوکر سے) ارے ڈاکٹر صاحب کے لئے ناشتہ لے آ۔ کھڑا کھڑا کیا مُنہ تک رہا ہے۔

ڈاکٹر: Thanks۔ میں نے ابھی چائے پی ہے اور اس سمے میں ناشتہ نہیں کرتا۔

(ڈاکٹر لچھمی کا معائنہ کرتا ہے۔ نبض دیکھتا ہے اور چٹھی میں کچھ لکھتا ہے)

ڈاکٹر: رمیش، اب اِن کی حالت یقینی بہتر ہے۔ اگر ہو سکے تو کچھ دنوں کے لئے آب و ہوا بدلنے کے لئے انہیں باہر لے جائیے۔

رمیش: ایسا ہی ہوگا ڈاکٹر (اپنی پتنی کی طرف دیکھ کر)، اُس دن اگر آپ کی خصوصی توجہ نہ ہوتی تو آج یہ

. . . . .

لچھمی: (مسکراتے ہوئے) پرلوک میں ہوتی۔

(سب ہنستے ہیں۔ رمیش کی ماں اندر سے آتی ہے)

ڈاکٹر: اِس میں میری مدد یا توجہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ارے بھئی دھنیہ باد دو بلڈ بنک والوں کو جن کی مستعدی اور فرض شناسی سے آپ کی پتنی موت کے چنگل سے بچ نکلی۔ دیکھئے نا کس قدر جلد یہ لوگ مریض کے خون کا گروپ معلوم ہو جانے پر اس گروپ کے خون والے آدمی کو بھیجتے ہیں۔ اگر اُس دن سلیم صاحب کا خون وقت پر دستیاب نہ ہوتا تو لچھمی کا آپریشن [illegible]

نہیں ہو پاتا۔

رمیش کی ماں۔ (چین بہ جبیں ہوکر) کیا کہا! سلیم صاحب کا خون! کون سلیم! نام سے تو مسلمان معلوم دیتا ہے۔

ڈاکٹر: ہاں ماں جی۔ سلیم صاحب ایک مسلم نوجوان ہیں دفتر میں کام کرتے ہیں۔ پہلے بھی کئی بار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رمیش کی ماں۔ تو گویا ایک برہمن کے شریر میں ایک ایسے شخص کا خون دیا گیا ہے جو ہماری ذات پات کا نہیں۔ آپ لوگوں کو ہماری آگیہ لینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ رام! رام!! ہمارا تو دھرم بھرشٹ ہوگیا (اپنے بیٹے کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) اور تو یہ تماشا کھڑا دیکھتا رہا۔

رمیش۔ یہ کیا ذات پات کی دیوار آپ نے کھڑی کر دی، ماتا جی! ذرا سنیئے تو!

ماں۔ سنوں کیا تیرا سر! تو نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ اب کیا ہوگا رام!

رمیش۔ (کچھ برہمی سی آجاتی ہے) کون سے پہاڑ ٹوٹ پڑے اب! اس دن یہ مسلمان خون دینے سے انکار کر جاتا تو تمہاری بہو آج زندہ نہ رہتی۔ تمہیں یاد بھی ہوگا اس دن تمہارے چھوٹے بیٹے ستیش نے عین وقت پر اپنا خون نہیں دیا جا ہا جبکہ اس کا خون لکھمی کے خون سے ملتا تھا۔ ایسے وچار آپ کو شوبھا نہیں دیتے ماتا جی۔

ماں۔ تو شوبھا کی بات کرتا ہے اور یہ دھرم بھرشٹ جو ہوا اس کا خیال ہوا۔ ارے بیچ! لکھمی کو اگر اپنی ذات پات والوں کا خون نہیں مل سکتا تھا تو اسے بھگوان کے بھروسے ہی چھوڑ دیا جاتا۔ وہی اس کی رکھشا کرتے۔ رام رام۔

رمیش۔ پھر وہی ذات پات کی بات (غصہ آجاتا ہے) یہی ذات پات والی بات ہی تو جذبات کو مشتعل کر دیتی ہے۔ چاروں طرف تعصب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ آدمی دیرینہ تعلقات اور آپس کی دوستی کو بھول کر جانور سے بدتر ہوجاتا ہے اور اس بات سے آئے دن سمپردایک دنگے اپنا سر اٹھاتے ہیں۔ کتنے ہی بے گناہوں کا پیٹ میں چھرے گھونپ دیئے جاتے ہیں۔ کتنے ہی معصوم بچے یتیم اور کتنی ہی جوان عورتیں بیوہ ہوجاتی ہیں۔ آن کی آن میں ان کے مال و متاع کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹ لیا جاتا ہے پھر ان کے گھروں میں آگ لگادی جاتی ہے۔ کتنے ہی لوگ گھر سے بے گھر ہو جاتے ہیں۔ حکومت کی ملکیت جو برباد ہوتی ہے وہ الگ۔ دیش ان گھٹناؤں سے کمزور ہو جاتا ہے۔ ان واردات کی وجہ یا پھر ان بے گناہوں کا کوئی قصور ہے تو بس اتنا کہ یہ ہندو ہے وہ مسلمان یہ سکھ ہے تو وہ عیسائی۔

ماں۔ بس اب رہنے دے اپنا بھاشن۔

رمیش۔ بھاشن کیا ہے یہ حقیقت ہے۔ آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور بھارت ماتا کی دو آنکھیں۔ ہمارے نام الگ ہو سکتے ہیں۔ ہماری پیار دھنا کی راہیں الگ ہو سکتی ہیں ہمارا رہن سہن الگ ہو سکتا ہے مگر ہمارا خون ایک ہے۔ ہم نے اس دیش میں جنم لیا ہے جہاں رام لچھمن، مہاتما بدھ، اشوک، بابا کبیر، بابا گورو نانک اور مہاتما گاندھی جیسی مہان شکتیوں نے جنم لیا تھا۔ یہ سبھی لوگ مت بھید کے مخالف تھے اور اہنسا اور مانوتا کے حامی۔

ماں۔ (ہونٹوں پر کھسیانی ہنسی کروٹیں لیتی ہے) خیر، یہ سب کچھ سہی بیٹے مگر ہمیں اپنے پرکھوں کی نیتی اور ذات کی رکھشا کو بھولنا نہیں چاہیئے۔

مانتی ہوں کہ ماتا بڑی چیز ہے۔

رمیش: ماتا بڑی چیز ہی نہیں ماتا جی۔ میرا تو یہی دھرم ہے کہ ماتا کو بھگوان کی پوجا ہے اور یہی کچھ ہمارے مہاتما نیتا مہاتما گاندھی نے ہمیں سکھایا ہے اور ہمیں انہیں کی نیتی پر چلنا ہے۔ اسی میں ہمارا کلیان ہے۔

ڈاکٹر: رمیش ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ماں جی۔ مہاتما گاندھی نے ہومت بھید کو مٹانے میں اپنی جان تک کی قربانی دی تھی۔ اب سمے آگیا ہے کہ ہم اس مہاتما سنگتی کے اصولوں پر چلیں۔ اسی میں ہماری اُنتی ہے۔ (ڈاکٹر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

ماں: ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔ میں بھی آپ لوگوں کے وچاروں سے سہمت ہوں۔

(پڑوس میں کہیں ریڈیو پر رام دھن بج رہی ہے۔

رگھوپتی راگھو راجہ رام
پتیت پاون سیتا رام

اور جب:

ایشور اللہ تیرو نام
سب کو سمتی دے بھگوان

تو سب لوگ دھیرے دھیرے جھومنے لگتے ہیں اور جب رام رحیما، کرشن کریما گایا جاتا ہے تو رمیش کی ماں ہلکے ہلکے تالی بھی بجاتی ہے۔

—— ۳ ——

سکھ کا گھر۔ رنجیت سنگھ پلنگ پر لیٹے ہوئے کتاب پڑھ رہا ہے۔ ریڈیو پر میر راجھا کی غمگین لے کروٹیں لے رہی ہے۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دستک ہوتی ہے۔ دروازہ کھلنے پر چارلس ایک کرسچین جوان داخل ہوتا ہے۔

چارلس: کہو سردارا کیا حال ہے۔ ارے یار یہ کیوں منہ لٹکائے ہوئے ہو، وہ جو کسی نے کہا ہے نا
زندگی زندہ دلی کا ہے نام....

رنجیت سنگھ: مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔ آؤ آؤ دوست، میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں (نوکر کو آواز دیتا ہے اور اسے چائے لانے کے لئے کہتا ہے)۔

چارلس: شکریہ کی کوئی بات نہیں دوست۔ ہاں اگر شکریہ ہی ادا کرنا ہے تو بلڈ بنک والوں کا کرنا چاہئے جنہوں نے اس دن کمال ہی تو کر دیا۔ جانتے ہو کیا ہوا۔ اس دن میں ہاسپٹل اپنے ایک بیمار دوست کو دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ آپریشن تھیٹر کے پاس ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا ایک سکھ نوجوان کی موٹر سائیکل ٹرک سے ٹکرا گئی ہے اور اس نوجوان کا سر پھٹ گیا ہے میں بھی وہیں کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں تھیٹر سے ایک ڈاکٹر اور ایک نرس تیز قدموں سے باہر نکلے۔ میرا قیاس صحیح نکلا۔ یہ لوگ بلڈ بنک کو ٹیلی فون کرنے جا رہے تھے۔ خون کی ضرورت تھی میں لپکا اور ڈاکٹر سے کہا کہ اگر خون کی ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں۔ میں نے اپنا بلڈ گروپ D.Rh. Negative بتایا اور ساتھ ہی بلڈ بنک سے ملا ہوا کارڈ بھی دکھا دیا جو اتفاق سے میرے پاکٹ میں تھا۔ ڈاکٹر نے نرس سے کہا what a co-incidence اور ساتھ ہی مجھے اندر لے گیا۔ معلوم ہوا ہم دونوں کا بلڈ گروپ ایک ہی ہے اور سنتے ہیں، یہ گروپ بہت ہی کمیاب ہے۔ بہر حال میں نے خون دے دیا۔ بلڈ بنک والوں کو جب اس کا علم ہوا تو مجھے V.I.P. کے خطاب

نوازا ہے یعنی 'Very Important Person'۔
رنجیت سنگھ۔ دوست تم ہو بھی V.I.P. (سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) زخم کاری تھا اور خون کافی بہہ گیا تھا۔
چارلس۔ جب ہمارا بلڈ گروپ ایک ہے تو ہمارا رشتہ دوست سے کہیں اونچا ہونا چاہیئے۔ ہم بھائی بھائی ہیں۔
رنجیت سنگھ۔ (کھڑے ہو کر چارلس سے بغلگیر ہوتا ہے) کیوں نہیں بھائی میرے۔
(دونوں چائے پینے لگتے ہیں۔ چارلس لائٹر سے سگریٹ سلگا لیتا ہے۔ اتنے میں رنجیت سنگھ کے باپ اندر چلے آتے ہیں۔ چارلس فوراً سگریٹ کو انگلیوں سے دبا کر بجھا دیتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے)
رنجیت سنگھ۔ اِن سے ملئے پاپا، یہی ہیں مسٹر چارلس جن کے خون سے اُس دن میری جان بچی تھی۔
باپ۔ (چارلس سے بصد گرمجوشی ہاتھ ملاتا ہے) بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ نے جو کچھ بھی کیا اِس سے ظاہر ہے کہ اس فرقہ وارانہ تعصب کے دور میں آپ جیسے جیالے اور انسانیت کا بھرم رکھنے والے نوجوان اب بھی ہیں اور بھارت کو ایسے ہی سپوتوں کی ضرورت ہے۔
(چارلس اپنے سینے پر صلیب کا نشان انگلی سے بنا لیتا ہے اور رنجیت سنگھ کے باپ اندر چلے جاتے ہیں)
چارلس۔ (سگریٹ پھر سلگا لیتا ہے اور ایک کش لے کر) ہاں تو یار شاہو، میں تمہیں ایک خوش خبری سنانے آیا تھا اور ہم خوبی کاروبار کی بات چیت لے بیٹھے۔ بات یہ ہے کہ میرا Armed forces سے کمیشن آگیا ہے اور میں کل ہی بارڈرس پر اپنے دیش کی حفاظت کے لئے جا رہا ہوں جہاں ہر مذہب اور فرقے کا سپاہی اسلحہ سے لیس جان کی بازی لگانے کے لئے تیار ہے۔ تم مجھے اپنا پتہ دو، میں وہاں سے تمہیں خط لکھوں گا۔ تم بھی مجھے خط لکھتے رہو گے۔
(چارلس رنجیت سنگھ کا پتہ اپنی پاکٹ بک میں لکھ لیتا ہے اور ساتھ ہی اُس کا بلڈ گروپ بھی اپنے بلڈ گروپ کے ساتھ نمایاں طور پر واضح کرتا ہے)۔
جانتے ہو میں نے یہ بلڈ گروپ بھی پتے کے ساتھ کیوں لکھا ہے (قہقہہ لگا کر) کیا سمجھے؟ لو میں چلا مگر دوست ہاں ایک بات چلتے چلتے۔ موٹر سائیکل رکے آنکھ نہیں ہوتی۔ گاڑی کبھی تیز نہ چلانا۔
رنجیت سنگھ۔ (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں) جا بھائی میرے۔ واہگورو تیری حفاظت کریں گے۔

— ۴ —

(ہاسپٹل کا زنانہ وارڈ۔ سلیم کی ماں لیٹی ہوئی ہیں۔ سر پر پٹی بندھی ہے۔ پاس ہی راحت ماموں، شمع اور سلیم بیٹھے ہیں۔)
راحت ماموں: کیسی طبیعت ہے نازو۔ مگر یہ سب کیسے ہو گیا۔ کل ہی شام کو مجھے سلیم کا تار ملا اور میں فوراً چل کھڑا ہوا۔ (سلیم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رمیش اپنی ماں اور بہن کے ساتھ داخل ہوتا ہے)
رمیش: (آگے بڑھ کر) کیسی طبیعت ہے ماں جی۔
سلیم کی ماں: اچھی ہوں بیٹے (رمیش کی ماں بھی آگے بڑھتی ہے۔ سلیم کی ماں دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیتی ہے۔ رمیش کی ماں انہیں اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے۔ دونوں کی آنکھیں اشک سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ سلیم اور رمیش یہ دیکھ کر مسکراتے ہیں۔)
رمیش: ماما جی۔ اِس حادثے کا سلیم کو علم نہیں۔ میں بتاتا ہوں۔ پرسوں پولنگ اسٹیشن پر مرد اور عورتیں الگ الگ قطار باندھے ووٹ ڈال

رہتے تھے۔ اتنے میں کئی مُسلم خواتین بھی بُرقع اوڑھے رکشاؤں میں آ گئیں اور زنانہ قطار میں شامل ہو گئیں۔ ووٹ ڈالنے کے بعد اپنی اپنی رکشا میں سوار ہو رہی تھیں۔ ایسے میں ایک ٹرک رکشا سے ٹکرا گیا اور ایک خاتون دہیں ایک کراہ کے ساتھ گر گئیں۔ دوسری اُن کی ساتھی گھبراہٹ میں چلّا اُٹھیں۔ میں اپنے قطار سے بھاگا گیا۔ اور بھی لوگ جمع ہو گئے۔ وہ ماں جی ہی تھیں جنہیں چوٹ آئی تھی اور دوسری خاتون سلیم کی بہن تھیں۔ میں ان دونوں کو فوراً ٹیکسی میں ہاسپٹل لے گیا۔ ماں جی کے سر میں گہری چوٹ آئی تھی اور خون بہہ جانے کی وجہ انہیں خون کی اشد ضرورت تھی۔ میں خون دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر نے گروپنگ کی۔ اتفاق سے ہم دونوں کا خون ایک ہی گروپ کا نکلا۔ میرا خون کام آ گیا اور ماں جی کو اُسی وقت خون دے دیا گیا۔

سلیم کی ماں: رمیش بیٹے۔ خدا تیری عمر دراز کرے۔

راحت ماموں: سُبحان اللہ۔ ماشاء اللہ۔ بھارت کو ایسے ہی جوانوں کی ضرورت ہے۔

رمیش کی ماں: جب رمیش سے اِس گھٹنا کی خبر ملی تو دُکھ کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ میرا رمیش کسی کے کام تو آیا ہے۔ اور اسی وقت سے بہن جی تمہیں دیکھنے کو جی بے قرار تھا۔

سلیم کی ماں: میں تمہاری احسان مند ہوں بہن۔

رمیش کی ماں: جیسا کہ میں نے رمیش سے یہ بھی سنا ہے کہ شمع کی شادی کے بارے میں آپ کو بھیا کے خط کا انتظار تھا۔ اب جب کہ یہ لکھنؤ سے خود آ گئے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ بٹیا کے ہاتھ پیلے کر کے ہی جائیں۔

راحت ماموں: انشاء اللہ۔ ایسا ہی ہوگا۔

(دیکھی شمع کے چُٹکی لیتی ہے اور دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں)

— ۵ —

رنجیت سنگھ کا کمرہ۔ رنجیت سنگھ کہیں جانے کے لئے کپڑے بدل رہا ہے۔ دستک ہوتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ بلڈ بنک کے ڈاکٹر انچارج اور ایک آرمی افسر اندر آتے ہیں۔

ڈاکٹر: رنجیت، اِن سے ملئے، یہ ہیں کیپٹن آنند (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں) ابھی چند منٹ پہلے کیپٹن صاحب بلڈ بنک آئے تھے اور انہیں بلڈ گروپ O. Rh. Negative کی اشد ضرورت ہے جو بہت کمیاب ہے۔ رجسٹر میں اِس گروپ کے تحت تمہارا نام نکلا۔ کیپٹن صاحب کہہ رہے تھے کہ بارڈر سے انہیں اطلاع ملی ہے کہ وہاں ایک کرسچین جوان چارلس نامی جو یہیں کا رہنے والا ہے دُشمن کے گولے سے شدید زخمی ہو گیا ہے اور وہ بے ہوش ہے۔ اُس کی پاکٹ بک سے تمہارا نام، پتہ اور بلڈ گروپ وغیرہ سب معلوم ہوا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

رنجیت سنگھ: (بے تابی سے) چارلس میرا بھائی۔ چلئے کیپٹن آنند، میں تیار ہوں۔

کیپٹن آنند: ہاں مسٹر رنجیت سنگھ۔ ہمیں ابھی ہوائی جہاز سے سیدھے بارڈر پہنچنا ہے۔ آپ تیار ہو جائیے۔

ڈاکٹر: کیوں کیپٹن صاحب، میں نے ٹھیک ہی کہا تھا نا۔ ہمارے بلڈ بنک کے تمام جوان اِسی طرح ہر وقت ملک کی خدمت کے لئے تیار رہتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۹۶ پر دیکھئے)

اظہر افسر



# شمعِ منزل

## افراد:—

بوڑھا
ستیش منی
نوجوان
ساتھی

بادل گرج رہے ہیں۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی ہے۔ بڑے زور کی بارش ہو رہی ہے۔ ایک طرف ٹمٹماتے چراغ کی روشنی نظر آتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ کھلے میدان میں ایک جھونپڑی ہے، اُسی میں یہ چراغ جل رہا ہے۔ دو آدمی بھاگتے ہوئے اُس جھونپڑی کے چھجے کے نیچے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ دونوں پانی سے شرابور ہیں۔

نوجوان، (اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے) اُف کس قدر تیز بارش ہے۔

ساتھی، سمجھتے تھے کہ ایک آدھ چھینٹا پڑ جائے گا۔ یوں اچانک اِس قدر تیز بارش ہو جائے گی' یہ خیال ہی نہ تھا۔

نوجوان، اب بھی یہاں سے گاؤں ایک میل دُور ہے۔

ساتھی، دُور تک پھیلا ہوا میدان ہے۔ سر چھپانے کا کوئی آسرا نہیں۔

اندر سے آواز آتی ہے، آپ لوگ اندر آ جائیے نا۔

نوجوان: کون؟

ساتھی، کوئی جھونپڑی کے اندر سے ہمیں بُلا رہا ہے۔

نوجوان: چلو

بوڑھا، آؤ اندر آ جاؤ، بڑی سخت بارش ہے۔

نوجوان، جی— یہ آپ کی جھونپڑی ہے؟

ستیش منی، نہیں، یہ جھونپڑی ہماری نہیں ہے۔

بوڑھا، یہ میری بھتیجی ہے ستیش منی۔

نوجوان: نمستے۔

ستیش منی: نمستے۔

بوڑھا: بیٹھو بیٹھو ایک طرف بیٹھ جاؤ، کپڑے کتنے گیلے ہو گئے۔

ساتھی، آپ لوگ یہاں....

بوڑھا: بھائی ہم شام کی ٹرین سے اُتر کر گھنشیام پور جا رہے تھے۔ سوچا تھا جلدی پہنچ جائیں گے' راستے میں بارش شروع ہو گئی۔

ستیش منی، وہ بھی اس قدر تیز کہ پوچھو نہیں۔

نوجوان، جی ہاں۔

بوڑھا، آس پاس کوئی سر چھپانے کا آسرا نہ پا کر ہم یہاں آ گئے۔ دراصل اِس جھونپڑی کے ٹمٹماتے ہوئے

چراغ نے راستہ دکھایا۔

ستیش منی: آپ لوگ؟

نوجوان: جی بالکل ایک جیسی بات ہے۔ ہم بھی ٹرین سے اُتر کر گھنشیام پور جا رہے تھے کہ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو یہ جھونپڑی اور اس کا ٹمٹماتا ہوا چراغ نظر آیا۔

ساتھی: اور ہم اِدھر چلے آئے۔

نوجوان: لیکن کون رہتا ہے یہاں؟

ستیش منی: پتہ نہیں، ہم لوگ سوں سوں کرتے اندر گئے تو بس یہ چراغ جل رہا تھا۔ ایک چٹائی دیوار سے لگی تھی۔

بوڑھا: میں نے چٹائی کھینچ کر بچھا دی۔ جھونپڑی میں اور کوئی سامان بھی نہیں ہے۔

ستیش منی: بابا جھونپڑی والا آ جائے تو؟

بوڑھا: آنے دو، کیا وہ اس تیز بارش میں ہمیں یہاں سے چلے جانے کو کہے گا۔

نوجوان: نہیں نہیں، ہمیں کوئی جانے کے لئے نہیں کہے گا۔

ساتھی: ہم اس سے کہہ دیں گے بھئی بارش سے بچنے کو یہاں آ گئے ہیں۔ بارش تھم جائے تو ہم چلے جائیں گے۔

بوڑھا: ٹرین میں کوئی بتا رہا تھا اس علاقے میں بہت دنوں سے بارش نہیں ہوئی۔

نوجوان: جی ہاں لیکن یہ بارش تو بڑی بے موقع ہوئی۔

بوڑھا: ہونے دو بھائی ہونے دو۔ آدمی کیا، جانور بھی بارش کو ترس رہے ہوں گے۔

نوجوان: آپ گھنشیام پور کس کے پاس جا رہے ہیں؟

ستیش منی: دِنے بابو جبار میاں کے پاس۔

بوڑھا: سُنا ہے اِن دونوں بھائیوں نے مہاتما گاندھی کے اُصولوں پر گاؤں سُدھار کا کام شروع کیا ہے۔

نوجوان: پھر تو خوب ساتھ رہے گا، ہم لوگ بھی دِنے بابو جبار میاں جو شالی بھائی ہیں اُنہی سے ملنے

گھنشیام پور جا رہے ہیں۔

ساتھی: یہاں ایک تصویر بھی ٹنگی ہے۔

نوجوان: تصویر؟

ساتھی: ہاں یہ دیکھو۔

بوڑھا: مہاتما گاندھی کی تصویر ہے بڑی پُرانی تصویر ہے۔

ساتھی: نیچے کیا لکھا ہے؟

نوجوان: لکھا ہے' وہ شمع جس نے ہندوستان کی دو سو سالہ غلامی، جہالت، افلاس اور تعصّب کے تیرہ و تار اندھیارے کو اہنسا اور پریم کی ضیا پاشی سے، آزادی کے جگمگاتے اُجیارے میں تبدیل کر دیا۔

بوڑھا: اس جملے نے تو مجھے سنہ ۴۲ء کی یاد دلا دی۔

نوجوان: آپ کو بابا۔

بوڑھا: میں تحریکِ عدمِ تعاون میں اس مہاتما کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔

ساتھی: جملے کے آگے لکھا ہے ۲ / اکتوبر۔

نوجوان: کتنی عجیب بات ہے آج بھی ۲ / اکتوبر ہے۔

ساتھی: ہاں آج ۲ / اکتوبر ہے۔

نوجوان: وہ مبارک و مسعود دن جو ہندوستان کی تاریخ میں سدا یاد رہے گا۔

بوڑھا: ۲ / اکتوبر ۱۸۶۹ء کو کاٹھیاواڑ پوربندر میں راجکوٹ کے دیوان سورگباشی کرم چند گاندھی کے گھر ایک ننھا سا دیا جلا۔

نوجوان: موہن داس کرم چند گاندھی۔

ستیش منی: یعنی آج سے ٹھیک سو برس پہلے۔

بوڑھا: ہاں، مہاتما نے ابتدائی تعلیم کاٹھیاواڑ میں حاصل کی لیکن بیرسٹری کا امتحان لندن سے کامیاب کیا۔

ستیش منی: تیرہ سال کی عمر میں کستورا بائی کو جیون بھر ساتھ دینے کا وچن دیا۔

نوجوان: سنہ ۱۸۹۱ء میں بمبئی ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔

ساتھی: پریکٹس ہی کے سلسلے میں عبداللہ اینڈ کمپنی فرم

نے آپ کو جنوبی افریقہ روانہ کر دیا۔

بوڑھا، یہاں باپو جی سے جنوبی افریقہ کی زبوں حالی نہ دیکھی گئی۔

نوجوان، سنہ ۱۸۹۴ء میں بدیسیوں کے ظلموں سے تنگ آ کر پریٹوریا میں باپو جی نے ایک جلسۂ عام کو مخاطب کیا

ساتھی: سیاسی موضوع پر باپو جی کی یہ پہلی تقریر تھی۔

بوڑھا: اور اس تقریر کے بعد تو سیاسی جلسوں کا ایک سلسلہ سا بندھ گیا۔

نوجوان، اسی سال آپ نے نٹال انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈال دی۔

بوڑھا، سنہ ۱۹۰۱ء میں آپ ہندوستان واپس ہوئے۔

نوجوان، واپسی پر لوگوں نے جو قیمتی تحفے آپ کی نذر کئے آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ ان کی فروختگی سے جو آمدنی ہو وہ جنوبی افریقہ کے مظلوم و مجبور ہندوستانیوں کی حالت بہتر بنانے کے کام میں صرف کی جائے۔

بوڑھا، ہندوستان پہنچ کر باپو جی انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر بن گئے اور بطور ایک معمولی والینٹر، کام شروع کیا۔

ستیش منی، سنہ ۱۹۰۳ء میں اپنی دس ہزار کی بیمہ پالیسی فروخت کر کے باپو جی نے جوہانسبرگ کے کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور طاعون کی وبا سے تڑپ تڑپ کر جان دینے والے مریضوں کی بروقت امداد کی۔

نوجوان: اسی سال آپ نے "انڈین اوپی نین" کی ادارت بھی سنبھال لی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اخبار کے ٹامل، گجراتی اور ہندی ایڈیشن بھی شائع کرنے لگے۔

بوڑھا، سنہ ۱۹۰۶ء میں حکومت کی مخالفت کے سلسلے میں ستیہ گرہ کی اور جیل گئے۔

نوجوان، پھر تو جیل سے چھوٹنے اور اپنے اصولوں کی خاطر جیل جانے کا ایسا سلسلہ بندھا کہ جنوبی افریقہ کے بدیسیوں کو باپو جی کے آگے ہار ماننی پڑی۔

بوڑھا، یہ وہ پہلی لڑائی تھی جو اہنسا کے اصولوں پر لڑی گئی تھی، جس کے رو برو تشدد کے عظیم حامیوں کو بھی ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جانا پڑا۔

نوجوان، جنوبی افریقہ کی مہم سر کرنے کے بعد آپ انگلستان تشریف لے گئے۔

ستیش منی: یہاں آپ نے ڈاکٹر مہتا، مسز سروجنی نائیڈو اور دوسرے سرکردہ ہندوستانی لیڈروں سے آپ نے مشورے کئے۔

ساتھی، یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ لڑائی بڑے زور و شور سے جاری تھی۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ اس نازک وقت میں ہمیں انگریزوں کا ساتھ دینا چاہیے

بوڑھا: آپ نے نہ صرف ہزاروں سرفروشوں کو جنگ کے میدان کی طرف روانہ کیا بلکہ خود بھی کستوربا کے ساتھ فرسٹ ایڈ کا امتحان پاس کیا، تاکہ زخمیوں کی مدد کی جا سکے۔

نوجوان: انہی دنوں باپو جی پلوریسی کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اور ہندوستان واپس لوٹ آئے۔

بوڑھا: صحت یابی کے بعد سنہ ۱۹۱۵ء کے کنبھ کے میلے میں شرکت کی اور گندگی اور اچھوت پن کی لعنت کو دور کرنے کے لئے احمد آباد کے قریب ایک آشرم کی بنیاد رکھی۔

ساتھی، یہی وہ زمانہ تھا جب فخرِ قوم شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور نے باپو جی کو مہاتما سے خطاب کیا۔

بوڑھا: ۲۵ رمئی ۱۹۱۵ء کو ستیہ گرہ آشرم قائم کیا گیا، جس کے رہنے والے عہد کرتے تھے کہ . . . . .

ستیش منی: جھوٹ نہیں بولیں گے۔

نوجوان: اہنسا کا پرچار کریں گے۔

ساتھی، دنیا کی لذتوں سے پرہیز کریں گے۔

بوڑھا، سدا سودیشی چیزوں کا استعمال کریں گے۔

ستیش منی، چھوت چھات کا دلدر دور کریں گے۔

بوڑھا، سنہ ۱۹۱۷ء میں باپو جی ڈاکٹر راجندر پرساد سے ملے اور ضلع چمپارن کے مصیبت زدہ کاشتکاروں

کی امداد کے لئے انجمن بنائی۔

نوجوان: اچاریہ کرپلانی، مہادیو دیسائی اور دوسرے نیتاؤں اور اُن کی دھرم پتنیوں کے ساتھ مل کر بہار میں پہلی بار گرام سُدھار کی بنیاد رکھی، اور اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا۔

ساتھی: ۱۹۱۰ء میں پہلی بار کانگریس نے باپو جی کی رہنمائی میں پُرامن تعاون کی راہ پر چلنا شروع کر دیا۔

بوڑھا: ۱۹۲۲ء میں باپو جی چھ سال کے لئے جیل میں بند کر دئے گئے۔ الزام تھا حکومت وقت کے خلاف بغاوت!

نوجوان: جیل میں بھی آپ نے اپنا وقت بیکار بتانا مناسب نہ جانا۔ یہاں آپ نے اپنی جیون کہانی "تلاشِ حق" کے نام سے لکھی۔

ساتھی: سزا تو آپ کو چھ سال کے لئے ہوئی تھی مگر کمزوری اور بیماری کے سبب جلد ہی رہا کر دیا گیا۔

بوڑھا: ۱۹۳۰ء میں باپو جی نے نمک کے قانون کو توڑنے کے لئے والنٹیرز کے ساتھ دو سو میل کا سفر پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔

نوجوان: اِس پیدل یاترا میں جگہ جگہ باپو جی کا اِس قدر پُرجوش طریقے پر استقبال کیا گیا کہ انگریز حکومت گھبرا اُٹھی۔

ستیش منی: کھاروا کے مقام پر آپ کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔

بوڑھا: جنوری ۱۹۳۱ء میں انگریز سرکار نے باپو جی کو رہا کر دیا اور ہندوستان کے آئینی مستقبل پر غور کرنے کے لئے آپ کو گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔

نوجوان: ۱۹۳۲ء میں انگریز سرکار نے اپنی پُرانی چال چلی۔ ڈیوائیڈ اینڈ رُول اور اپنے فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان کر دیا۔

ساتھی: پھر تحریک شروع ہوئی اور باپو جی پھر سے جیل میں بند کر دیے گئے۔

بوڑھا: آخر ۱۹۴۲ء میں انگریز سرکار کے خلاف آخری اور فیصلہ کُن جنگ کا اعلان کر دیا۔

نوجوان: ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ہندوستان چھوڑ دو کا ریزولیشن پاس کر دیا۔

ستیش منی: دوسرے ہی دن ۹ اگست کو باپو جی نیتاؤں سمیت گرفتار کر لئے گئے۔

ساتھی: انگریز سرکار کے تشدد کے خلاف جیل ہی میں تین ہفتوں کا طویل برت رکھا۔

ستیش منی: جیل ہی میں ۲۲ فروری ۱۹۴۴ء کو کستورا بائی سورگباش ہو گئیں۔

بوڑھا: اور جب مئی ۱۹۴۴ء میں نحیف و نزار آپ رہا ہوئے تو ہندوستان کی فضا پر چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں کوئی روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی تو وہ اِسی شمع منزل کی تھی۔

نوجوان: جی ہاں یہ اسی شمع کی رہنمائی کا معجزہ تھا کہ چالیس کروڑ محکوم نہتے اور مجبور انسانوں نے پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے سب سے بڑے حکمراں انتہائی طاقت ور سامراج سے اپنی آزادی چھین لی۔

ساتھی: ہندو مسلم تعلقات کو بہتر سے بہتر بنانے کی غرض سے آپ نے ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو بھوک ہڑتال کا آغاز کیا تھا۔

نوجوان: یہ بھوک ہڑتال ۱۸ جنوری کو نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔

بوڑھا: ایک بار باپو جی کی تقریر ایک تھیٹر ہال میں ہونے والی تھی۔ باپو جی اپنی عادت کے مطابق ٹھیک مقررہ وقت پر تھیٹر ہال پہنچ گئے مگر اس وقت تک کچھ زیادہ آدمی جمع نہ ہو پائے تھے۔ جلسے کے بعض منتظمین بھی ابھی غائب تھے۔ باپو جی کسی کے لئے ٹھہرے نہیں۔ جیسے ہی ان کی تقریر کا وقت ہوا، انہوں نے اپنی تقریر شروع کر دی۔ تقریر کرنے کے بعد جب وہ جانے لگے تو لوگ جوق در جوق آنے لگے۔

ساتھی، جی۔
بڑھا، لوگوں نے اور کچھ منتظمینِ جلسہ نے باپو جی سے درخواست کی کہ وہ ٹھہر جائیں اور پھر سے اپنی تقریر شروع کر دیں۔
نوجوان: جی۔
بڈھا: باپو جی نے کہا، میں تو ٹھیک وقت پر اپنا کام کر چکا۔ اب آپ لوگ اپنا کام کیجئے اور وہ جلسہ گاہ سے چلے گئے۔ وقت کی اس کڑی پابندی کا ایسا اثر ہوا کہ باپو جی کی ہر تقریر پر لوگ وقت سے پہلے آ پہنچتے تھے۔
ستیش منی، شاید ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء کی بات ہے کہ کاشی میں ہندو یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ ملک کے سبھی راجہ مہاراجہ اور والیانِ ریاست اور رئیس و امراء زرق برق لباس میں سج دھج کر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس جلسے میں آئے۔
نوجوان، جی۔
ستیش منی، جب باپو جی کی تقریر کا موقع آیا تو باپو جی نے اپنی تقریر میں شان و شوکت اور عیش و آرام اور روپیے کے بے جا مصرف پر بڑی کڑی تنقید کی۔
بوڑھا: باپو جی نے جب تحریکِ عدم تعاون کی ابتدا کی اور طالب علم اسکولوں اور کالجوں سے باہر آنے لگے تو پٹنہ بہار ودیا پیٹھ قائم کیا گیا۔ ہمارے سابق راشٹرپتی راجندر پرساد اس ودیا پیٹھ کے پہلے صدر چنے گئے۔
ستیش منی، جب باپو جی ودیا پیٹھ کے افتتاح کے لئے پٹنہ آئے تو سبھی اس فکر میں تھے کہ بغیر کافی روپیے کے یہ تعلیمی ادارہ کیسے چلایا جاسکے گا، لیکن پہنچتے ہی باپو جی نے ساٹھ ہزار روپیے منتظمین کے حوالے کر کے ساری مشکلیں آسان کر دیں۔
بوڑھا، دوسرے ہی دن ہم لوگوں نے دیکھا کہ ماتا کستور با اپنے اور باپو جی کے استعمال کے کپڑے خود دھوتے جا رہی ہیں۔ اس سے مجھ پر اور سبھی دیکھنے والوں پر بے حد اثر ہوا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے اپنا کام آپ کرنے کا سبق یہیں سے سیکھا۔
ستیش منی: ایک بار آشرم کے کچھ نوجوانوں نے بغیر نمک کا کھانا کھانے کا عہد کر کے بھی باہر سے پوری کچوری اور مسالہ دار ترکاریاں منگوا کر کھائیں۔ باپو جی کو کسی طرح اس کی خبر ہو گئی۔ شام میں پرارتھنا کے وقت باپو جی نے ہر ایک سے پوچھا، مگر سب مکر گئے۔ کسی میں سچ بات کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔
بوڑھا، باپو جی نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "سچ ہے میں خود حق کو ابھی نہیں پا سکا ہوں، اس لئے میرے سامنے سچ کہتے لوگ ہچکچاتے ہیں اور پھر باپو جی نے اپنے گالوں پر آپ زور زور سے طمانچے لگانے لگے۔ سب حیرت میں گم سم یہ حال دیکھ رہے تھے آخر سب نے اعترافِ جرم کر لیا اور باپو جی سے معافی مانگی۔ اس طرح کے سیکڑوں واقعات سے باپو جی کی زندگی بھری پڑی ہے۔
نوجوان: آپ کا نام، آپ کا شبھ نام؟
بوڑھا، (ہنستا ہے) میرا نام عزیز الرحمٰن ہے۔
ساتھی، مگر آپ کی یہ بھتیجی؟
بوڑھا: (لمبا سانس لیتا ہے) میرا ایک دوست تھا، بڑا پیارا دوست ستیش۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا، صرف ایک لڑکی تھی۔ بیوی بے چاری لڑکی کی پیدائش کے ساتھ ہی خدا کو پیاری ہو گئی۔ جب وہ لڑکی چار سال کی ہوئی تو ستیش کو ہیضے کی وبا نے گھیر لیا اور وہ چل بسا۔ مرتے وقت اس نے اپنی لڑکی میرے حوالے کی۔ یہ وہی ہے۔ میں اسے ستیش منی پکارتا ہوں۔ چار سال کی عمر سے میرے ساتھ ہے جتنا میں پڑا، پڑھا لکھا بھی دیا ہے۔
ساتھی: اپنی بھتیجی کو آپ نے سیاسی شعور بھی خوب دیا ہے۔

بوڑھا: وہ تو آج کل کے ہر نوجوان لڑکے اور لڑکی کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی جانوروں کی زندگی ہے۔ تمہارا نام؟

ساتھی: جی میرا نام اعجاز ہے۔ یہ میرا دوست اور بہت ہی اچھا ساتھی رگھو ہے۔

بوڑھا: خوب۔

ساتھی: یہ دسنے بابو سے مل کر گھنشیام پور میں کوئی چھوٹی سی صنعت شروع کرنا چاہتا ہے۔

بوڑھا: ایک بار کسی نے باپو جی سے کہا، آپ کہتے ہیں چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے ذریعے تعلیم دی جائے اور اُستادوں کی تنخواہ طلبا کی بنائی ہوئی چیزوں کو بیچ کر ادا کی جائے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ بہت سے اُستاد طالب علموں سے زیادہ سے زیادہ کام لیں گے تاکہ اُن کی آمدنی بڑھ سکے۔

ساتھی: باپو جی نے کیا کہا؟

بوڑھا: اُس مہاتما نے کہا، ہمیں یہی ایک میدان نہیں، ہر میدان میں اپنے دشمن اور اپنی تحریکات کے خلاف دشمن عناصر سے جنگ کرنی ہے۔

نوجوان: لیکن کیسی عجیب و غریب جنگ لڑی گئی کہ نہ اس میں توپیں بندوقیں تھیں، نہ ٹینک اور بم۔

ساتھی: نہ ہوائی جہاز سے آتش بار گولے برسائے گئے، نہ خون آشام سنگینوں سے خون کی ہولی کھیلی گئی۔

بوڑھا: پھر بھی یہ ایسی لڑائی تھی جس نے ایک بار ساری دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ جسمانی طاقت ہی سب کچھ نہیں، روحانی طاقت بھی کوئی شے ہے۔ شرر فشانی ہی سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، شمع کی ٹھنڈی ضو بھی اندھیروں کو چیر کر منزل کی راہ بتا سکتی ہے۔

ستیش منی: ارے یہ تو صبح ہونے لگی۔

ساتھی: بارش بھی تھم گئی ہے۔

نوجوان: چلئے چلیں۔

بوڑھا: چلو۔ (سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ صبح کے دھندلکے میں نوجوان اور ساتھی اقبال کے یہ شعر پڑھتے ہوئے کھلے میدان میں گاؤں کی طرف چلے گئے ہیں ——)

نوجوان: اُس کی اُمیدیں قلیل | اُس کے مقاصد جلیل
ساتھی: اُس کی ادا دلفریب | اُس کی نگہہ دل نواز
نوجوان: نرم دم گفتگو | گرم دم جستجو
ساتھی: رزم ہو یا بزم ہو | پاک دل و پاک باز
نوجوان: شمعِ منزل ہے وہ | عشق کا حاصل ہے وہ
ساتھی: حلقۂ آفاق میں | گرمیٔ محفل ہے وہ

بوڑھا اور ستیش منی:
شمعِ منزل ہے وہ شمعِ منزل ہے وہ

(مختصر سا قافلہ دور ہوتا جا رہا ہے)
(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔)

---

## بقیہ ڈراما صفحہ ۱۹۰ ”رکت دان“

کیپٹن آنند: I appreciate their sincerety and sense of duty Thanks to Blood Bank.

(رنجیت سنگھ کے باپ اندر آتے ہیں اور ٹھٹک کے رہ جاتے ہیں)

رنجیت سنگھ: پاپا۔ چارلس میرا دوست جس نے مجھے خون دے کر میری جان بچائی تھی۔ آج وہ خود بارڈر پر زخمی پڑا ہے۔ اسے میرے خون کی ضرورت ہے۔ آگیہ دیجئے پتا جی۔ میں اس کے کام آسکوں

رنجیت کا پتا: ضرور جا پتر۔ اور اپنے بھائیوں کے لئے خون تو کیا اگر جان کی بھی ضرورت پڑے تو پیچھے نہ ہٹنا۔ واہگرو تیرے ساتھ ہیں (ڈبڈبائی آنکھوں سے بیٹے کی پیشانی چوم لیتا ہے۔ رنجیت سنگھ، کیپٹن آنند اور بلڈ بنک کے ڈاکٹر انچارج قدم سے قدم ملا کر باہر نکل جاتے ہیں۔

ابراہیم یوسف



# انگلستان میں ایک رات

افرادِ تمثیل :

مسٹر گاندھی . . . . . . .

میڈم : ایک بوڑھی خاتون

مِس ماریا : ایک نوجوان خاتون

منظر :

انیسویں صدی کا انگلستان۔ ایک متوسط طبقہ کے مکان کا کمرہ۔ رات کا وقت۔ کمرے میں آتش دان روشن ہے۔ کمرے کی آرائش عام انگلستان کے انیسویں صدی کے متوسط گھرانوں کی طرح ہے۔ میڈم آتشدان کے پاس کرسی پر بیٹھی ہیں۔ نوجوان خاتون مس ماریا کھڑکی کے پاس کھڑی ہے۔ بار بار پردہ ہٹاکر باہر دیکھتی ہے میڈم آتشدان میں اور لکڑیاں ڈالتی ہیں جس کے جلنے کی آواز کمرے کی خاموش فضا کے سکوت کو توڑتی ہے۔ نوجوان خاتون مس ماریا پلٹ کر میڈم کو دیکھتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ آتشدان کے پاس آتی ہے۔ آتشدان کی روشنی میں اس کے چہرے پر ایک مایوسی کی جھلک نظر آتی ہے جیسے وہ کسی کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چکی ہو۔ آتشدان کے پاس رکھی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ میڈم ماریا کا مایوس چہرہ دیکھ کر۔

میڈم : آج موسم غیر معمولی ہے۔

ماریا : کچھ زیادہ غیر معمولی نہیں۔ انگلستان کے عام موسم جیسا ہے۔

میڈم : پھر بھی میں محسوس کرتی ہوں کہ کچھ غیر معمولی ضرور ہے اس موسم میں اس قدر تند و تیز ہوائیں نہیں چلتیں۔

ماریا : ہاں آج کچھ سردی زیادہ ہے۔ شاید —— (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) مسٹر گاندھی کے لئے یہ موسم یقینی غیر معمولی ہوگا۔

میڈم : ہاں ہندوستانیوں کے لئے یہ موسم غیر معمولی ہے۔ وہاں سردی اس قدر سخت نہیں ہوتی، گرمیوں کا موسم ضرور زیادہ عرصے تک رہتا ہے اور سخت ہوتا ہے۔

ماریا : کس قدر خوش گوار زندگی ہوگی۔ ایک ہم انگلستان کے لوگ ہیں کہ سردی میں ٹھٹھرے جاتے ہیں۔

میڈم : میرے باپ جب ہندوستان سے ریٹائر ہو کر واپس آئے تھے تو کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کی گرمیاں جہنم سے کم نہیں۔ اکثر لوگ گرمی کی تاب نہ لاکر سڑکوں پر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ماریا : خدا کی پناہ۔ وہاں اس قدر سخت گرمیاں پڑتی ہیں؟ مگر پھر بھی مجھے ہندوستان دیکھنے کی خواہش ہے۔

سکتا ہے وہاں کے راجا نواب اور سپیرے خلاصے کی چیزیں ہیں۔ (چند سکنڈ خاموش رہ کر) مسٹر گاندھی سے آپ کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی؟

میڈم: (مسکرا کر) محض اتفاقیہ۔ (ماریا سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے) برائٹن کے ہوٹل میں۔

ماریا: برائٹن کے ہوٹل میں؟

میڈم: ہاں۔ ہوٹل میں وہ میری میز پر بیٹھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مینو دیکھ کر کسی الجھن میں ہے۔

ماریا: اچھا۔۔۔پھر؟

میڈم: جب میں نے اپنی خدمات پیش کیں کہ میں اس کی کیا مدد کر سکتی ہوں تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ فرانسیسی زبان نہیں جانتا اور مینو فرانسیسی زبان میں ہے۔

ماریا: اچھا۔ وہ فرانسیسی زبان نہیں جانتے؟ تعجب ہے۔

میڈم: تعجب کی کیا بات ہے۔ اکثر ہندوستانی طالب علم جو یہاں آتے ہیں، فرانسیسی زبان نہیں جانتے۔

ماریا: (مسکرا کر) تو گویا فرانسیسی زبان سے اُن کی لاعلمی آپ کی اور اُن کی ملاقات کا سبب بنی۔

میڈم: ہاں۔ (ہنس کر) مجھے تعجب اُس وقت ہوا جب اُس نے کہا کہ وہ گوشت ہرگز استعمال نہیں کرتا۔

ماریا: حیرت ہے۔ ہندوستان میں ممکن ہے سبزیوں پر آدمی زندہ رہ لے مگر انگلستان کی آب و ہوا میں تو یہ غیر ممکن ہے۔

میڈم: مگر اُس نے اس غیر ممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ اس نے ابھی تک گوشت استعمال نہیں کیا اور مجھے یقین ہے کہ وہ سچ کہتا ہے۔ اُس میں جھوٹ بولنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

ماریا: (مسکرا کر) ہر ہندوستانی میں جھوٹ بولنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ (ہنستے ہوئے) لڑکیوں سے بات کرنے میں مسٹر گاندھی عجیب شرمائے شرمائے سے رہتے ہیں۔

میڈم: یہ اُن کے اپنے سماج کی خصوصیت ہے۔ وہاں مردوں اور عورتوں کے سماج الگ الگ ہیں۔

ماریا: (حیرت سے) مردوں اور عورتوں کے سماج الگ الگ ہیں؟

میڈم: ہاں۔ وہاں لڑکیاں لڑکوں سے اِس طرح بے تکلفی سے نہیں ملتیں جیسے ہمارے انگلستان میں وہاں عورتیں پردہ کرتی ہیں۔

ماریا: پردہ! یہ پردہ کیا ہوتا ہے؟

میڈم: لڑکیاں مردوں کے سامنے نہیں آتیں اور اسی کو پردہ کہتے ہیں۔

ماریا: (ہنس کر) یہ کس قدر لغو ہے (دروازے کی گھنٹی بجتی ہے) شاید مسٹر گاندھی آگئے (میڈم اُٹھ کر جاتی ہے اور دروازہ کھولتی ہے)

میڈم: خوش آمدید مسٹر گاندھی، آئیے۔

(مسٹر گاندھی کمرے میں آتے ہیں۔)

گاندھی: گڈ ایوننگ میڈم۔ (ماریا کی طرف دیکھ کر) اوہ ہو گڈ ایوننگ۔

ماریا: گڈ ایوننگ مسٹر گاندھی۔ ہم لوگ آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔

گاندھی: شکریہ۔ مجھے کچھ زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟

ماریا: جی نہیں۔ ہم سوچ رہے تھے کہ یہ موسم آپ کے لئے غیر معمولی ہوگا۔ شاید آپ نہ آسکیں۔

گاندھی: موسم تو یقیناً غیر معمولی ہے، ہم ہندوستانی اس قدر سخت سردی کے عادی نہیں ہوتے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں نہ آؤں۔ (چند سکنڈ خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے) میں ہر اتوار کا کس بے چینی سے انتظار کرتا ہوں، اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتیں۔

ماریا: اوہ۔ شکریہ اس مہربانی کا۔

گاندھی: (میڈم کی طرف دیکھ کر) میڈم! آپ کا مزاج

کیسا ہے؟

میڈم، شکریہ مسٹر گاندھی، میں بخیر ہوں۔ آپ اِدھر آجائیے آتشدان کے پاس۔ کمرہ شاید کافی گرم نہیں ہوا ہے۔

گاندھی، (آتشدان کے پاس جاتے ہوئے) یہاں کس قدر سکون ہے۔ باہر تو بے حد سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔

میڈم: (کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تشریف رکھیئے ہم انگلستان والوں کے لئے یہ موسم کچھ غیر معمولی نہیں ہے۔

گاندھی: (مسکراکر) مگر میں تو ہندوستانی ہوں۔ میرے لئے تو غیر معمولی ہی ہے۔

میڈم، (اپنی کرسی پر بیٹھ کر) یقیناً۔ ہم دونوں ابھی موسم ہی کا ذکر کر رہے تھے۔

گاندھی: مزید یہ کہ میری صحت بھی کچھ واجبی سی ہے۔

میڈم: یہاں آپ اپنی صحت کا خیال رکھیئے۔ آپ نے شراب پینا شروع کردی ہو تو پیش کی جائے۔

گاندھی: شکریہ۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں شراب اور گوشت استعمال نہیں کرتا۔

میڈم، مگر ایکدن آپ کو اپنا یہ عہد توڑنا پڑے گا۔ انگلستان کے موسم میں کوئی بلا شراب اور گوشت کے نہیں رہ سکتا۔

گاندھی: (مسکراکر) اگر میں نے ایسا محسوس کیا تو انگلستان سے واپس چلا جاؤں گا، یہ میرے لئے آسان ہے

میڈم، خدا کی پناہ (ہنس کر) آپ بھی کس قدر ضدی ہیں۔

گاندھی: اصول کے لئے ضد کوئی بُری شے تو نہیں ہے۔

میڈم: (کھڑی ہوکر) میں آپ کے لئے کافی لاؤں۔ اُس سے آپ کو سکون ملے گا۔

(دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ مس ماریا چند منٹ بعد)

ماریا: آپ کو اپنی صحت کی خاطر اپنے اُصولوں میں کچھ تو لچک پیدا کرنی ہی چاہیئے۔

گاندھی: جس اُصول میں لچک ہو میں اُسے اصول ہی نہیں سمجھتا۔ (مسکراکر) میری صحت کا کوئی مذاق اُڑائے تو مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اُصول میں لچک پیدا کرنے پر کسی کی خفیف مسکراہٹ سے ہوتی ہے (ہنس کر) میری صحت کا کئی مرتبہ مذاق اُڑایا جا چکا ہے۔

(خفیف سی ہنسی کے بعد معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں۔ مس ماریا ان کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر)

ماریا: آپ کی صحت کا میں نے تو کبھی مذاق نہیں اُڑایا۔

گاندھی: یقیناً آپ ایک شائستہ خاتون ہیں مگر ہر عورت آپ کی طرح تو نہیں ہوسکتی۔

ماریا، کس خاتون نے آپ کا مذاق اُڑایا ہے۔؟

گاندھی: چھوڑیئے (مسکراکر) جس نے اُڑایا تھا، میں نے اُسے معاف کردیا ہے۔

ماریا، (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں نے آج کا موسم دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ شاید آپ نہ آسکیں۔

گاندھی: یہ کیسے ممکن ہے (مسکراکر) آپ کی دلکش صحبت کا تصور یہاں سے جانے کے بعد ہی شروع ہوجاتا ہے اور میں دن گننے لگتا ہوں۔

ماریا، (ایک خاص ادا سے مسکراکر) شکریہ مسٹر گاندھی۔ کاش میں آپ کو بتلا سکتی کہ میں آپ کے انتظار میں کس قدر بے چین رہتی ہوں۔

گاندھی، شکریہ۔ آپ جس طرح میرا خیال رکھتی ہیں وہ آپ کا احسان ہے۔

ماریا: واہ احسان کیا۔ (مسکراتے ہوئے) ہمارے یہاں انگلستان میں لڑکے لڑکیاں یونہی ایک دوسرے کا انتظار کرتی ہیں (گاندھی خاموش رہتے ہیں)۔ ہندوستان دیکھنے کی میری بڑی خواہش ہے سنا ہے بڑا عجیب ملک ہے۔

گاندھی، عجیب! نہیں تو۔ کئی دوسرے ملکوں کی طرح ہے۔ ہاں اگر کسی ملک کی غریبی کو عجیب کہا جائے

تو یقیناً بہت ہی عجیب ہے۔

ماریا، غریبوں کی انگلستان میں بھی کچھ کمی نہیں ہے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) سُنا ہے وہاں ایک عجیب رسم ہے جس کو آپ پردہ کہتے ہیں۔

گاندھی، جی ہاں۔ پردہ وہاں تہذیب اور شرافت کی نشانی ہے۔

ماریا، گویا لڑکے اور لڑکیاں آپس میں نہیں مل سکتے (ہنس کر) دونوں کی تنہائی کا تصور کس قدر رنگین ہے۔

گاندھی، جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی جیسا آپ کی سوسائٹی میں، نوجوانوں کا آپس میں بے تکلفی سے ملنا جلنا ہندوستانیوں کو رنگین معلوم ہوتا ہے۔

ماریا: (کچھ اس انداز سے جیسے وہ اس موضوع کو بدلنا چاہتی ہو) ہاں تو مسٹر گاندھی کس لڑکی نے آپ کی صحت کا مذاق اُڑایا تھا؟

گاندھی، چھوڑیئے۔ آپ معلوم کر کے بھی کیا کر لیں گی۔

ماریا: (ہنس کر) کم از کم یہ تو معلوم کر لوں کہ آپ میرے علاوہ اور کن کن لڑکیوں سے ملتے ہیں۔

گاندھی، یعنی آپ یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ . . . . .

ماریا، (بات کاٹ کر ہنستے ہوئے) آپ اسے میری رقابت نہ سمجھئے۔ ہماری سوسائٹی میں ہر نوجوان کو اپنی پسند کا دوست بنانے کی مکمل آزادی ہے۔ (چند سیکنڈ رک کر) ہاں تو کس لڑکی نے آپ کی صحت کا مذاق اُڑایا تھا۔

گاندھی، (مسکرا کر) جس خاندان میں میں مہمان کی حیثیت سے رہتا ہوں۔

ماریا، اوہ (ہنستے ہوئے) ذرا تفصیل سے واقعہ بیان کیجئے کہ میں بھی اُس کا لُطف لے سکوں۔

گاندھی، (ہنس کر) واقعہ کوئی خاص اور اہم نہیں۔ بس یونہی ایکدن ہم دونوں تفریح کی خاطر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ واپسی پر وہ دوڑتی ہوئی پہاڑ سے اُتر آئی مگر کچھ تو کمزور ہوں اور کچھ بزدل بھی، مجھے اُترنے میں بڑی دقت محسوس ہوئی۔ میں آہستہ آہستہ بلکہ بیٹھ بیٹھ کر اُترا۔ اس پر وہ بے طرح ہنستی رہی اور جب میں بدقت تمام نیچے آیا تو وہ اِس طرح شاباش شاباش کہنے لگی، جیسے میں چھوٹا سا بچہ ہوں۔

ماریا، اور اس پر آپ کو دِلی اذیت ہوئی۔

گاندھی، مجھے اپنی کمزوری کا احساس تھا، پھر اذیت کیوں ہوتی۔

ماریا، آپ بلا کے حقیقت پسند ہیں۔ کیا سب ہندوستانی آپ ہی کی طرح ہوتے ہیں۔

گاندھی: یہ کوئی ضروری نہیں۔ ہمارے یہاں تہذیبوں کی بڑی رنگا رنگی ہے۔ کئی مذہبوں کے ماننے والے ہیں جن کے اپنے اپنے خیالات ہیں۔ اپنے تصورات ہیں۔

ماریا: کئی مذہبوں کے ماننے والے؟

گاندھی: جی ہاں۔ وہاں ویدوں کے ماننے والے ہندو ہیں۔ وضعدار مسلمان ہیں جو محمدؐ صاحب کو اپنا رسول مانتے ہیں۔ سکھ ہیں جو گرو نانک کے پیرو ہیں۔ پارسی اور کرسچین ہیں۔ جین مذہب کے ماننے والے ہیں اور گوتم بُدھ تو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

ماریا، کیسی عجیب باتیں ہیں۔ آپ کا ہندوستان بالکل الف لیلائی مُلک ہے۔

گاندھی، (ہنس کر) یونہی سمجھ لیجئے۔ ہے مگر بہت خوبصورت۔

ماریا، میری خواہش ہے کہ میں آپ کے ساتھ رہ کر اس عجیب اور خوبصورت مُلک کو دیکھوں۔ (گاندھی خاموش رہتے ہیں۔ ماریا کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات پیدا ہوتے ہیں جیسے وہ گاندھی کی اِس خاموشی سے کچھ پریشان اور جھنجھلائی ہوئی ہے۔

کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا آپ نے کسی اور لڑکی کو اپنے ساتھ ہندوستان لے جانے کا وعدہ کر لیا ہے۔

گاندھی: جی نہیں۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں میڈم سے آج ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنے آیا تھا۔

(ماریا غور سے گاندھی کا چہرہ دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ کچھ دیر کمرے میں مکمل خاموشی رہتی ہے کہ میڈم کافی لے کر کمرے میں آتی ہیں، اور دونوں کو خاموش دیکھ کر)

میڈم: ارے تم دونوں اس قدر خاموش کیوں ہو؟ نوجوانوں کو یوں بوڑھوں کی طرح خاموش نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ (ہنس کر) ایسے فلسفیانہ چہرے تو بوڑھوں ہی کے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

ماریا: نہیں، ہم تو یونہی خاموش ہو گئے تھے۔ مسٹر گاندھی نے مجھے ہندوستان کے بارے میں بڑی اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ میں ان کی شکر گزار ہوں۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) مسٹر گاندھی آپ سے کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

میڈم: مجھ سے! (ہنس کر) جو بات نوجوانوں کو آپس میں کرنا چاہیئے وہ اس پر مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتے ہیں؟

ماریا: (کھڑی ہو کر) ممکن ہے وہ مسئلہ اسی نوعیت کا ہو (گاندھی کی طرف دیکھ کر) مجھے اجازت ہے مسٹر گاندھی؟ (گاندھی خاموش رہتے ہیں۔ ماریا دروازے کے پاس جا کر) شب بخیر۔

(دروازے سے باہر چلی جاتی ہے۔ میڈم کافی کی پیالی گاندھی کی طرف بڑھا کر)

میڈم: ہاں مسٹر گاندھی۔ آپ کس مسئلے پر مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ (کافی کی پیالی لیتے ہیں اور اس طرح خاموش رہتے ہیں جیسے وہ مسئلے کو پیش کرنے کی نوعیت پر غور کر رہے ہوں۔ میڈم گاندھی کا چہرہ دیکھ کر) ہاں مسٹر گاندھی کیا مسئلہ۔ (مسکرا کر) بھئی نوجوانوں کو اپنے مسائل آپس میں طے کرنا چاہیئے۔

گاندھی: مگر مسئلے کی نوعیت ایسی ہے کہ آپ ہی سے بیان کرنا ہے۔

میڈم: میں ایک بوڑھی عورت ہوں۔ آپ نوجوان مجھ سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ آپ کے مسائل میرے مسائل سے بہت مختلف ہیں۔ میں ان پر کیا رائے دے سکتی ہوں۔

گاندھی: (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ نے میری اس طرح خبر گیری کی ہے جیسے ایک ماں اپنے بیٹے کی کرتی ہے۔

میڈم: آپ کو اس کی فکر نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ یہاں اجنبی اور تنہا تھے آپ کی مدد کرنا میرا فرض تھا۔

(گاندھی کچھ دیر یوں خاموش رہتے ہیں جیسے اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے الفاظ کو ترتیب دے رہے ہوں۔ پھر کچھ دیر بعد آہستہ سے)

گاندھی: آپ نے ایک دن مجھے رائے دی تھی کہ میں اب شادی کر لوں۔

میڈم: ضرور۔ ضرور۔ آپ کو اب شادی کر لینا چاہیئے۔

گاندھی: آپ نے مس ماریا سے میری ملاقات کرائی جس کے لئے میں شکر گزار ہوں۔

میڈم: ماریا ایک بہت ہی نیک لڑکی ہے۔ وہ آپ کے کردار اور شرافت سے بے حد متاثر ہے اور ہندوستان جانے کی اس کی خواہش بے پناہ ہے

گاندھی: مگر میں اس سے

میڈم: (ہنس کر بات کاٹتے ہوئے) آپ کو جو کچھ کہنا ہے وہ اسی سے کہئے۔ ہماری سوسائٹی میں یہ معیوب نہیں ہے کہ لڑکا لڑکی سے اپنے دل کی بات کہہ دے۔

گاندھی: (کچھ اس انداز سے جیسے بڑی ہمت کر کے وہ یہ الفاظ اپنی زبان سے نکال رہے ہوں۔) مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ بات اور کچھ زیادہ آگے بڑھے

میڈم: (حیرت سے گاندھی کا چہرہ دیکھ کر) کیوں! کیا تم نے کسی اور کو پرپوز کر رکھا ہے۔

گاندھی: جی نہیں۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں آپ کی محبّت اور خلوص کے قابل نہیں ہوں۔

میڈم: اوہ، تو مسٹر گاندھی۔ مجھے آپ سے بے پناہ محبّت اور خلوص ہے۔

گاندھی: آپ کی اس مہربانی کا شکریہ۔ میں نے جب آپ کے یہاں آنا جانا شروع کیا تھا، اُسی وقت مجھے ایمانداری اور صفائی سے یہ بات کہہ دینا چاہیئے تھی۔

میڈم: کیا بات کہہ دینا چاہیئے تھی؟

گاندھی: کہ میں شادی شدہ ہوں۔

میڈم: (حیرت سے) شادی شدہ!

گاندھی: جی ہاں۔ بلکہ ایک لڑکے کا باپ بھی۔

میڈم: ایک لڑکے کے باپ! ابھی تو آپ کی طالب علمی کا زمانہ بھی ختم نہیں ہوا۔

گاندھی: میری شادی بچپن میں کر دی گئی تھی۔ ہمارے یہاں بچپن کی شادیاں عام ہیں۔

میڈم: واقعی یہ بہت فنّی ہے۔

گاندھی: جی ہاں میں اِس حقیقت کو آپ سے اور مس ماریا سے چھپاتا رہا۔ میں کس قدر گنہگار اور جھوٹا ہوں اور پھر یہ کس قدر کمینہ پن ہے کہ میں اُس سے تعلق بڑھاتا رہا جو مجھے نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

میڈم: (مُردہ دلی سے) نہیں مسٹر گاندھی اپنے متعلق غلط رائے قائم نہ کیجئے۔ شاید اور بہت سے ہندوستانی اِس حقیقت کو چھپاتے رہتے ہونگے۔

گاندھی: جی ہاں (کھڑے ہو کر) اب میں شاید آپ کی مہمان نوازی کا مستحق نہیں رہا۔

میڈم: اوہ مسٹر گاندھی ایسا ہرگز نہ سوچیئے (چند سکنڈ خاموش رہ کر) میں سوچ رہی ہوں کہ ہندوستان بھی کیسا عجیب ملک ہے جہاں اِس قدر کم عمری میں شادیاں کر دی جاتی ہیں جب کہ وہ شادی کا مفہوم بھی نہیں سمجھتے۔

گاندھی: اگر اب آپ مجھے دُھتکار کر بھی یہاں سے نکال دیں گی تو مجھے افسوس نہ ہوگا۔

میڈم: نہیں نہیں مسٹر گاندھی۔ آپ ایسا خیال بھی اپنے دل میں نہ لایئے۔ آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ آپ ہمیشہ کی طرح ہمارے مہمان رہیں گے۔

گاندھی: آپ کی یہ مہربانی میرے لئے مزید مسرّت کا باعث ہوگی۔ مگر میں اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا ہوں۔ مس ماریا سے آپ میری طرف سے معذرت چاہ لیجئے گا کہ میں نے اپنی بُزدلی کی وجہ سے اُنہیں غلط فہمی میں مُبتلا کر رکھا۔ شاید اُنہیں، میرے اس رویّے سے دُکھ ہوگا۔

میڈم: ہرگز نہیں۔ وہ بڑی خوش دل لڑکی ہے آپ کی بچپن کی شادی کے بارے میں سُنکر (ایک دو) قہقہے لگائے گی۔

گاندھی: شاید اب میں یہاں نہ آسکوں گا۔

میڈم: خدارا مسٹر گاندھی ایسا نہ کیجئے گا۔ اگلے اتوار کو ضرور آیئے گا۔

گاندھی: مگر

میڈم: (بات کاٹ کر) میں کوئی بات نہیں سُنوں گی۔ آپ اگلے اتوار کو ضرور آ رہے ہیں۔ ہم آپ کی بچپن کی شادی کے واقعات سُنیں گے۔ ماریا بھی ہمارے ساتھ ہوگی۔

گاندھی: آپ اپنی اس مہربانی اور شفقت سے مجھے زیرِ بارِ احسان کر رہی ہیں۔

میڈم: ہرگز نہیں (ہنستے ہوئے) اگر ہم آپ کی بچپن کی شادی کا مضحکہ اُڑائیں تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟

گاندھی: (مسکراتے ہوئے دروازہ کے پاس جاکر) گُڈ نائٹ میڈم۔

میڈم: گُڈ نائٹ مسٹر گاندھی۔ اتوار کو آنا نہ بھول جایئے گا۔

# مہاتما گاندھی

## کے چند اہم

# معاصرین

شری آر۔ آر۔ دِواکر



# لوک مانیہ تلک

بھارت کو برطانوی حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کی جد وجہد کی تاریخ کو اور اِس مقصد کے حصول کے لئے عوام کی مجاہدانہ قوم پرستی کے جذبے کو ایک طاقت ور آلۂ کار میں تبدیل کرنے کی کہانی میں شری لوک مانیہ تلک اور گاندھی جی کا نام ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اِن دونوں رہنماؤں کی زندگی جذبۂ ایثار و قربانی کا مثالی نمونہ تھی اور ان دونوں بزرگوں نے یہ مسلک محض بھارت کو آزاد کرانے کے لئے ہی نہیں بلکہ عوام کے دلوں میں بھارت کے شاندار ماضی اور اس کی ثقافتی قدروں کے بارے میں فخر و ناز کا جذبہ پیدا کرنے اور سوراج کے حصول کے لئے بنیادی اوصاف کو فروغ دینے کے لئے اختیار کیا تھا۔ یہ دونوں ہستیاں غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ ترین کردار کی مالک تھیں۔ اُن کی دیانت داری اور صداقت پرستی ضرب المثل تھی۔ اِن دونوں رہنماؤں نے بھارت کے نشاۃ الثانیہ اور بھارتی عوام کی ہمہ گیر ترقی کے لئے مسلسل جد وجہد کی۔ یہ دونوں روحانی طاقتوں پر عقیدہ رکھتے تھے جو انسانوں اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرتی ہیں۔ اِس عقیدے اور بھارتی عوام پر اپنے اعتمادِ محکم کی بدولت وہ سوراج اور جمہوریت کے بے باک علمبردار بن گئے۔

شری تلک اور گاندھی جی دونوں نے ایک عظیم مقصد اور اعلیٰ جذبۂ خدمت کے ساتھ اپنی عوامی زندگی کا آغاز کیا۔ عوام کی خدمت کرنے میں اُنہوں نے کبھی تامّل نہیں کیا اور مصیبتوں سے کبھی دامن بچانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہمیشہ قربانی دینے کے لئے تیار رہتے تھے اور عوام کی خدمت کے لئے اپنی زندگی تک قربان کر دینے میں اُنہیں ذرا تامّل نہ تھا۔ وہ عوام سے بے حد خلوص رکھتے تھے اور ان کے مفاد سے اُنہیں گہری دلچسپی تھی اور اِسی جذبے کی بدولت ان دونوں میں ہر طرف سے مُنہ موڑ کر عوام کی بے لوث خدمت کرنے کی بے مثل طاقت اور صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔

## یکساں مقصد

شری لوک مانیہ تلک ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے اور سوراج کے لئے جد وجہد کرتے ہوئے ۱۹۲۰ء میں اُنھوں نے وفات پائی۔ گاندھی جی شری تلک کی پیدائش کے ۱۳ برس بعد پیدا ہوئے تھے اور خوش قسمتی سے اُنہوں نے ۱۹۴۷ء میں سوراج کو اپنی زندگی ہی میں قائم ہوتے دیکھ لیا۔ گاندھی جی "عدم تشدد کے ذریعے سچائی" کی راہ پر چلتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں شہید ہوئے۔ ایک طرح ۱۹۱۵ء تک گاندھی جی اور لوک مانیہ تلک دونوں ہمعصر رہے اور اِس دوران میں یہ دونوں مختلف علاقوں میں عوام کی رہنمائی کر رہے تھے اور اِن کی زندگی کا واحد مقصد عوام کی فلاح و بہبود کے لئے انتھک

جدوجہد کرتا تھا۔ جب گاندھی جی نے ۱۹۱۵ء میں مستقل طور پر بھارت میں سکونت اختیار کی اور بھارتی سیاست اور عوامی معاملات میں سرگرم حصہ لینا شروع کیا تو اس کے بعد سے شری تلک اور گاندھی جی وقت اور مقام، خیالات اور عمل ہر اعتبار سے صحیح معنوں میں ہمعصر بن گئے۔ یہ دونوں یکم اگست ۱۹۲۰ء تک معاصرین کی حیثیت سے نہایت سرگرمی اور تندہی کے ساتھ عوام کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں شری تلک کی وفات کے بعد گاندھی جی اس میدان میں واحد رہنما کی حیثیت سے رہ گئے۔ ان دونوں رہنماؤں نے پانچ سال اور سات ماہ تک معاصرین کی حیثیت سے بھارت کی سیاست اور عوامی خدمات کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

بھارت جو دونوں کے لئے ایک ہی میدانِ عمل تھا۔ اُس میں ان دونوں شخصیتوں نے بہت مختصر سی مدت میں متعدد کارہائے نمایاں سرانجام دیئے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک کا یہ زمانہ بھارت کی تاریخ میں مختلف نظریوں کے ماتحت خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ اِسی زمانے میں پہلی جنگِ عظیم کے باعث دنیا ایک بحران میں مبتلا تھی۔ اِسی زمانے میں بھارتی عوام میں بیداری کی ایک لہر پیدا ہوئی تھی اور یہی وہ وقت تھا جب کہ بھارت ایک انقلابی دَور سے گذر رہا تھا اور حصولِ آزادی کی جنگ کے طریقۂ کار میں بھی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ اِس نازک موقع پر اِن دونوں عظیم ہستیوں نے بھارتی عوام کے مسائل کے حل کے لئے مشترکہ طور پر جو جدوجہد کی ہے اُسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

شری تلک اور گاندھی جی، دونوں کا مقصد ایک ہی تھا، یعنی سَوراج کا حصُول اور بھارت کی عظمتِ رفتہ کا اِحیاء لیکن بھارتی عوام کے مسائل کے حل کے لئے ان دونوں کے طریقۂ کار میں کافی فرق تھا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ گاندھی جی اور شری تلک دونوں میں کچھ نظریاتی اختلاف تھے اور یہ دونوں بغیر کسی جھجک کے اُن کا اظہار بھی کرتے تھے لیکن ان کی حقیقی عظمت کا راز اِس بات میں پوشیدہ ہے کہ ان دونوں نے اپنے نظریات اور آدرشوں کے اختلافات کو کبھی اپنے عزائم کے اختلاف کی شکل اختیار نہیں کرنے دی۔ اِس لئے کہ اس سے دونوں میں پھُوٹ پڑ جاتی۔ وہ دونوں ہی اِس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ اس کا نتیجہ تباہ کن ہوگا۔ اس معاملے میں شری تلک اور گاندھی جی نے جس تحمل اور احتیاط سے کام لیا، وہ اُن کی باطنی تہذیب اور سیاسی شعور کی پختگی کا نتیجہ تھی۔

<u>باہمی جذبۂ احترام</u>:-

ایسے متعدد مواقع آئے کہ جب شری تلک اور گاندھی جی نے ایک دوسرے کے لئے صدقِ دلی کے ساتھ خلوص، ستائش اور احترام کے جذبات کا اظہار کیا اور وقتاً فوقتاً انہوں نے جو مؤقف اختیار کیا، اُس میں ایک دوسرے کی حمایت کی۔ گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں جو جدوجہد کی تھی شری تلک اپنے اخبار "کیسری" کے کالموں میں اس کی حمایت پہلے ہی کر چکے تھے۔ سری تلک نے گاندھی جی اور ماتا کستوربا کو ذاتی طور پر خراجِ تحسین پیش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ حکومت بمبئی کی پولیس رپورٹوں میں اِس بات کا ذکر ہے کہ ہیرا باغ بمبئی میں ۱۳ر جنوری ۱۹۱۵ء کو گاندھی جی اور کستوربا ماتا کے استقبال کے لئے نیشنل یونین کی طرف سے ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔ شری تلک اگرچہ اس جلسے میں مدعو نہیں کئے گئے تھے لیکن اِس کے باوجود انہوں نے اِس میں تقریر کی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ بھارت کے شہریوں کا یہ فرض ہے کہ وہ گاندھی جی اور ماتا کستوربا کا احترام کریں اِس لئے کہ اُنہوں نے ایک دُور دراز ملک میں بھارت کی عزت کے لئے سخت جدوجہد کی ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ بھارت کو ایسے بہت سے سُورما پیدا کرنے چاہئیں

گاندھی جی نے شری تلک کے اس خراج تحسین کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ بمبئی میں شری تلک سے مل کر انہیں بڑی مسرت ہوئی اور جب وہ پونہ جائیں گے تو شری تلک کے بارے میں اپنے احترام کا اظہار کریں گے۔ اس کے بعد گاندھی جی پونہ گئے اور وہاں اپنی ایک تقریر میں شری تلک کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے شری جی۔ کے۔ گوکھلے کے مقابلے میں شری تلک کو ایک سمندر کی مانند بتایا اور شری گوکھلے گاندھی جی کی نظر میں گنگا کی مانند تھے۔

شری تلک سے بات چیت اور خط و کتابت کے دوران گاندھی جی ہمیشہ انہیں تلک مہاراج کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ گاندھی جی نے اپنے احمد آباد کے آشرم میں ایک پرارتھنا کے دوران کہا تھا۔ بھارت میں صرف ایک ہستی ایسی ہے جس پر کروڑوں انسان فدا ہیں اور جس پر کروڑوں اہل وطن اپنی جانیں قربان کر سکتے ہیں اور وہ ہستی تلک مہاراج کی ہے۔

شری تلک کو جنگ سے متعلق کانفرنس میں وفاداری کی تجویز پر تقریر کی اجازت نہ دینے کے سلسلے میں گاندھی جی نے بمبئی کے گورنر کو اعلانیہ طور پر تنبیہہ کی تھی، اس موقع پر شری تلک کی جو توہین کی گئی تھی اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے گاندھی جی نے گورنر کو کھلے عام معافی مانگنے کا مشورہ دیا تھا۔ شری تلک کی وفات پر اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں گاندھی جی نے آنجہانی شری تلک کے متعلق جن الفاظ میں اظہار تعزیت کیا ہے وہ ایک شاہکار ہے جس میں گاندھی جی نے شری تلک کی مجاہدانہ صفات کی بے حد تعریف کی ہے۔

گاندھی جی نے جب عملی سیاست میں قدم رکھا، اس وقت شری تلک کی سیاسی شہرت اپنے نقطۂ عروج پر تھی لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ شری تلک بڑے دانشمند اور صاحب بصیرت انسان تھے اور انہوں نے بھارت کے سیاسی افق پر جگمگانے والے اس ستارے کی تابانی کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ گاندھی جی سیاست کے میدان میں ابھی نو وارد تھے۔ سیاست، زندگی اور عوامی مسائل کے حل کے طریقۂ کار کے بارے میں اُن کے خیالات نئے تھے لیکن اس کے باوجود شری تلک نے ایک سن رسیدہ مدبر کی حیثیت سے گاندھی جی میں چھپی ہوئی عظیم طاقت کا اندازہ کر لیا تھا اور اسی لئے انہوں نے اپنے ایک با صلاحیت اور قابل ساتھی کی حیثیت سے گاندھی جی کا اعلانیہ طور پر خیر مقدم کیا تھا۔ گاندھی جی کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات اور گفت و شنید کے بعد شری تلک نے کرناٹک کے شری گنگادھر راؤ سے کہا تھا کہ گاندھی جی دوسروں سے بہت آگے نکل جائیں گے اور ان کا یہ قول گاندھی جی نے اپنے عمل سے ثابت کر کے دکھا دیا۔ شری تلک اگرچہ خود بہت بڑے عالم اور فلسفی تھے لیکن اس کے باوجود وہ گاندھی جی کو درویشانہ کردار کا حامل اور روحانیت کا پیکر سمجھتے تھے جس کی قوت روحانی ریاضت کی وجہ سے اور بھی زیادہ تھی۔ اونیکابائی گوکھلے کی لکھی ہوئی گاندھی جی کی سوانح عمری میں شری تلک نے جو دیباچہ لکھا ہے اس میں انہوں نے گاندھی جی کے متعلق انتہائی پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس دیباچے میں شری تلک نے گاندھی جی کے اعلیٰ اخلاق اور کردار کے لئے انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اُن کے بلند کردار کو اُن کی عظمت کا راز بتایا ہے۔ مشکلات کے باوجود حق پر قائم رہنا ایک روحانی صفت ہے۔ شری تلک نے کہا، یہ صفت گاندھی جی میں بدرجۂ اتم موجود ہے ستیہ گرہ سے متعلق گاندھی جی کے نظریے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے شری تلک نے کہا ہے کہ ایسی صورت حال میں جب کہ ملکی قانون کی تعمیل یا خلاف ورزی کا مسئلہ در پیش تھا، گاندھی جی نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ اسے انہوں نے ستیہ گرہ کا نام دیا اور یہ انہیں کی ایجاد ہے۔ انہوں نے ریاضت کے عمل سے اس طریق کار کو اور بھی مقدس بنا دیا۔ یہ دراصل ایک روحانی طاقت ہے۔

میں نے ابھی تک جو کچھ کہا ہے اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کچھ معاملات میں گہرے اختلافات کے باوجود شری تلک اور گاندھی جی ایک دُوسرے کا بہت احترام کرتے تھے۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ بعض معاملات میں شری تلک اور گاندھی جی جو مؤقف اختیار کرتے تھے اُس میں وہ دونوں ایک دُوسرے کی حمایت کرتے تھے۔ شری تلک نے ۱۹۱۵ء میں منعقدہ بیلگام سیاسی کانفرنس میں اعتدال پسندوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی جو کوشش کی تھی گاندھی جی نے اُس کی حمایت کی تھی۔ اگرچہ گاندھی جی مصلحت آمیز معاہدوں یا محض سیاسی سمجھوتے کے حق میں نہ تھے۔ گاندھی جی بنیادی طور پر اتحاد کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں بمبئی کے گورنر کے ساتھ سخت رویّہ اختیار کیا۔ اگرچہ جنگ کے لئے بھرتی کے معاملے میں وہ شری تلک سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ گاندھی جی نے ۱۹۱۸ء میں تلک پرس فنڈ کی مہم کی حمایت کی تھی، حالانکہ کیرول کیس میں تلک نے برطانوی عدالتوں سے جو انصاف چاہا تھا، وہ فعل گاندھی جی کی نظر میں معیوب تھا۔ اِسی طرح شری تلک نے گاندھی جی کو نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم پر آگے بڑھنے کا ہر موقع دینے کی کوشش کی، حالانکہ اُنہیں گاندھی جی کے جداگانہ طریقۂ کار کا بخوبی علم تھا۔ اِس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شری تلک گاندھی جی کو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ایک عظیم اور اُبھرتی ہوئی طاقت تصوّر کرتے تھے۔ گاندھی جی کی کھیڑا ستیہ گرہ اور ایسے تمام معاملات میں جنہیں صرف گاندھی جی چلا رہے تھے، شری تلک نے اُن کی پُر زور حمایت کی۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے کانگریس اجلاس میں شری تلک بعد گاندھی جی کے نظریات کے سلسلے میں ایک مصالحت آمیز رویّہ اپنا لیا گیا۔

## نظریاتی اختلافات

زندگی کے بارے میں تلک اور گاندھی جی دونوں کے نظریات میں نمایاں اختلاف تھا۔ تلک کا نظریۂ زندگی روایتی انداز کا تھا اور بھارت کی روایتی تہذیب کے پس منظر پر مبنی تھا۔ دوسری طرف گاندھی جی نے اپنی انگلینڈ کی زندگی ہی سے ایک آدرش وادی اور روحانی نقطۂ نظر اختیار کر لیا تھا اور اپنے رُوحانی آدرشوں کو عملی شکل دینے کی جو خواہش اُن کے دل میں انگڑائی لے رہی تھی اُس نے اُنہیں ایسے تجربات کرنے پر مجبور کر دیا جن کی تکمیل کو وہ بہتر اور مناسب خیال کرتے تھے۔ زندگی کے اِسی میلان کی وجہ سے وہ ایک طبع زاد نقطۂ نظر اور ایک جُداگانہ فلسفۂ حیات کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے فلسفیانہ موضوعات پر قلم نہیں اُٹھایا اور نہ فلسفۂ حیات پر کوئی مخصوص اظہار خیال کیا، مگر یہ بات قطعی واضح ہے کہ انہوں نے ایک ایسے فلسفۂ حیات کی تشکیل کی جسے طرزِ حیات بھی کہا جا سکتا ہے۔ آج کے دَور میں اسے ہم 'ستیہ گرہی طرزِ زندگی' کا نام دے سکتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں عمل پر کافی زور دیا، کیونکہ اُنہوں نے یہ محسوس کیا کہ ہر شخص بُرائی، ناانصافی اور بداطواری کی طرف مائل ہے۔ ساری دنیا اِن بُرائیوں کی طرف سے مطمئن اور بے حس ہو کر رہ گئی ہے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اگر اِس صورتِ حال کا خاتمہ کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا تو یہ نہ صرف ایک فرد کی فرض شناسی کے منافی ہوگا بلکہ سماج کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اگرچہ تلک اور شری اروند دونوں بالترتیب ۱۹۰۶ء اور ۱۹۱۰ء میں مثبت مزاحمت اور عدمِ تعاون کا درس دیتے رہے لیکن یہ گاندھی جی ہی تھے جنہوں نے تشدّد اور اخلاق کی مضبوط بنیاد پر اِس تکنیک کی تشکیل کی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تلک کو مہاتما گاندھی سے اُس وقت اختلاف ہوا جب کہ مجالسِ قانون ساز اور اسی قسم کے دوسرے سیاسی نظام کے لئے برطانوی حکمرانوں سے مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ تلک نے عدم تشدد پر مبنی عدمِ تعاون کے نظریہ کی تعریف کی، پھر بھی انہیں اس بات میں قدرے شک تھا کہ بھارت جیسے وسیع و عریض ملک میں

اس نظریے کو کس طرح عملی شکل دی جا سکتی ہے، اس بات پر گاندھی جی کی رائے اُن سے مختلف تھی۔ اُنہیں یقین تھا کہ عوام ایک ہتھیار کو نہایت خوبی اور کامیابی سے استعمال کر سکیں گے۔ بھرتی کے مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے ۱۹۱۸ء میں گاندھی جی نے جو مخصوص طریقِ کار اپنایا، وہ بھی تلک کے نظریے سے مختلف تھا۔ اِس سارے اختلافات کا منبع وہ جداگانہ فلسفۂ حیات تھا جس کی پیروی گاندھی جی اور تلک دونوں اپنی اپنی جگہ کر رہے تھے۔

حالانکہ تلک نے اِسی بات کو تسلیم کیا تھا کہ سچائی اور عدم تشدد کا فلسفہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے۔ پھر بھی اُن کا یہ خیال تھا کہ روزمرہ کی زندگی میں اسے عملی شکل نہیں دی جا سکتی۔ اُن کا یہ خیال بھی تھا کہ صرف سادھو اور سنت ہی اِس راستے کو اختیار کر سکتے ہیں اور اس فلسفے پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

گاندھی جی اور تلک کی حُب الوطنی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے مگر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آگے چل کر گاندھی جی بین الاقوامیت اور انسان دوستی کے نظریے کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ "میں محبِ وطن ہوں کیونکہ میں انسان ہوں اور مجھے انسانیت سے ہمدردی ہے"۔ تلک کی حُب الوطنی اور سیاسی خیالات مغربی اصولوں سے متاثر تھے، جب کہ گاندھی جی کی حب الوطنی محض سیاسی نقطۂ نظر کے ماتحت نہیں تھی۔ شری اروند کی طرح اُن کا بھی یہ خیال تھا کہ بھارت کے پاس ایک مقصد اور ایک پیغام ہے جو اُسے ساری دنیا تک پہنچانا ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ اگر بھارت عدم تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کر لیتا ہے تو وہ نسلِ انسانی کو ایک سبق دے سکتا ہے۔

تلک کے ذہن میں بھارت کی آزادی کا تصور بہت پہلے سے واضح تھا۔ وہ مغربی طرز کی جمہوریت کے حق میں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بھارت کے شہری کو بھارت میں وہی حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو انگلینڈ میں ایک انگریز کو حاصل ہیں۔ جہاں تک گاندھی جی کا سوال ہے، اُنہیں برطانوی حکومت کے انصاف پر مکمل اعتماد تھا لیکن بھارت میں جنرل ڈائر اور مائیکل اوڈوائر جیسے برطانوی افسروں اور گورنروں کے مظالم برداشت کرنے کے بعد اُنہوں نے سوچا کہ برطانوی حکومت ایک لعنت ہے اور اِس بُرائی کا خاتمہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ انگریزوں سے جدوجہد کے دوران اُنہوں نے ستیہ گرہ کا پُرانا طریقہ استعمال کیا جسے انہوں نے جنوبی افریقہ میں ایجاد کیا تھا اور جسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کیا تھا۔ اِس کے برعکس گاندھی جی نے اِس بات پر زور دیا کہ سادھو سنتوں اور عام مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ اور مختلف فلسفوں کی تشکیل نہ تو ممکن ہی ہے اور نہ ایسا ہونا چاہئے۔ گاندھی جی سچائی کے اخلاقی اصولوں اور عدم تشدد کی عملی شکل کو دو مختلف شاخوں میں تقسیم کرنے یا ان کے لئے دو مختلف معیار قائم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ زندگی کی تمام بُرائیاں یعنی انسانی سماج میں مروجہ ناانصافی یا کسی کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے رجحانات انہیں دو مختلف معیاروں کی دین ہیں جو عوام کے درمیان موجود ہے اور جسے اخلاقی قانون کا نام دیا جاتا ہے۔ گاندھی جی اور تلک کے نظریاتی اختلافات پوری طرح سے اس وقت منظرِ عام پر آئے جب گاندھی جی نے یہ لکھا کہ "تلک اور مسز بسنٹ سیاست کے میدان میں ہر چیز کو روا سمجھتے ہیں"۔ تلک نے اِس بیان کی سخت تردید کی اور کہا کہ اُنہوں نے اِس قسم کے فلسفے کی کبھی تبلیغ نہیں کی۔ تلک نے یہ بھی کہا کہ عدم تشدد کے فلسفے کی قطعیت میں میرا ایمان رہا ہے۔ دوسری طرف میں نے سیاست کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور باہمی تعاون کی تلقین کی ہے۔ گاندھی جی نے اپنے مخصوص و بے مثال عاجزانہ لہجے میں کہا کہ جہاں تک گوکھلے کی علمی قابلیت اور مذہبی کتابوں کی تشریح و تفسیر پر اُن کے عبور کا تعلق ہے، میں اُن کی برابری نہیں کر سکتا، لیکن میرا باطنی احساس واضح طور پر مجھے یہ بتاتا ہے کہ میں ایک گناہ گار سے بھی محبت و خلوص سے پیش آؤں۔ اکثر

(باقی صفحہ ۲۱۷ پر دیکھئے)

بمبئی

ڈاکٹر ایچ۔ این۔ کنزرو



# گوپال کرشن گوکھلے

گوپال کرشن گوکھلے، بھارتی نشاۃ الثانیہ کے علمبردار راجہ رام موہن رائے اور دادا بھائی نوروجی کے بڑے ہونہار روحانی فرزندوں میں سے تھے۔ اپنی تمام زندگی میں وہ علم کے متلاشی رہے۔ سخت محنت و مشقت کی بدولت، اپنے گرو مہادیو گووند راناڈے کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر انہوں نے اپنے اندر ایک بلند اخلاقی طاقت پیدا کی۔ ان کا دل حب الوطنی کے جذبات سے معمور تھا اور عوام کی پست حالت کو بہتر بنانے کی شدید خواہش ان کی زندگی کا مقصد بن گئی تھی۔

ان کی زندگی کا آغاز دکن کی تعلیمی سوسائٹی کی لائف ممبری سے ہوا۔ یہ سوسائٹی تلک، آگرکر اور دوسرے لوگوں نے قائم کی تھی جو بھارتی قوم پرستی کی ایک علامت تھی۔ گوپال کرشن گوکھلے کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ۲۰ سال کی عمر ہی میں راناڈے جیسے پاک باطن شخصیت اور متبحر عالم سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ راناڈے سیاسی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں نہایت وسیع معلومات رکھتے تھے۔ ان صفات کی بنا پر وہ مہاراشٹر میں کئی برس تک ایک رہنما کی حیثیت اختیار کئے رہے۔ گوکھلے نے بارہ برس تک اپنے گرو راناڈے کے قدموں میں بیٹھ کر ان کی تعلیمات سے فیض اٹھایا اور اسی زمانے میں انہوں نے اپنے درخشاں مستقبل کی بنیاد ڈالی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تعلیمی اور انتظامی فرائض کی انجام دہی میں گوکھلے اس قدر مصروف رہتے تھے کہ دن میں انہیں کوئی وقت نہیں ملتا تھا، اس لئے راناڈے جیسے مشقت پسند استاد کی خوشنودی کے لئے کالج کے اوقات کے بعد رات میں کافی دیر تک گوکھلے ان کی ہدایات میں عوامی مسائل پر غور و فکر کیا کرتے تھے۔

گوکھلے نے ہمیشہ اس بات کی اہمیت پر زور دیا کہ تعلیم یافتہ بھارتی افراد کو عام طور پر اور مقتدر اشخاص کو خاص طور پر عوامی مسائل کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ آزادی حق رائے دہندگی کی توسیع اور حصول آزادی کے بعد پیدا ہونے والے نئے سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسائل کی وجہ سے اس نوع کے مطالعے کی ضرورت پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ بڑھ گئی۔

اس کے علاوہ گوکھلے اوسط درجے کی ذہنی صلاحیت رکھنے والے مردوں اور عورتوں کی علمی سطح اور صلاحیت کو بہتر بنانے کے مسئلے پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ اس وقت ایسے متعدد بھارتی موجود تھے جو لیاقت میں انگریزوں کی برابری کر سکتے تھے، لیکن محض یہی کافی نہیں تھا۔ ۱۹۰۴ء میں مدراس کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے گوکھلے نے کہا تھا: "ملک کی اصل قوت اوسط درجے کے مردوں اور عورتوں کی زندگی اور ان کے خیالات اور ان کے کارناموں میں مضمر ہے۔" ۱۹۰۴ء میں بمبئی کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ جمہوری طرز کی خود مختار حکومت کا

حصول ہمارے عوام کی طاقت اور کردار اور ان کی صلاحیت پر منحصر ہے کیونکہ خود مختار حکومت کی عمارت ہماری طاقت ہی پر قائم رہ سکتی ہے۔

<u>نظریات کی یکسانیت</u> : گوکھلے بھارت کی آزادی پر یقین کامل رکھتے تھے۔ اُن کی یہ فیصلہ کن رائے تھی کہ آزادی آئینی تحریک کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عوام کو تعلیم یافتہ بنانے اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے لئے انتھک کوشش کی جائے اور رائے عامہ کا اثر حکام پر ڈالا جائے۔ گوکھلے کو تشدد کسی بھی شکل میں گوارا نہ تھا کیونکہ وہ اسے ملک کے مفاد کے حق میں غیر موثر اور نامناسب سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی اور گوکھلے کے خیالات میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ گوکھلے کی وفات کے بعد ان کی پہلی برسی کے موقع پر اپنے پیغام میں گاندھی جی نے کہا تھا "یہ حقیقت ہے کہ جب تک ہماری سیاسی صورت حال بہتر نہیں ہو جاتی، ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے کہ اگر نامناسب طریقوں کو اپنا کر اپنی سیاسی صورت حال میں تبدیلی لائی جائے تو اس صورت میں بھی ہم ترقی کر سکیں گے۔ اگر ہمارے وسائل درست نہیں ہوں گے تو تبدیلی کی رفتار ترقی کی سمت میں نہیں ہوگی بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کا رُخ بالکل مخالف سمت میں ہو جائے۔ صرف جائز وسیلوں یعنی پُر امن اور موثر وسیلوں ہی سے ہم حقیقی ترقی کی سمت میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔"

گوکھلے کی آئینی تحریک کا مفہوم ان کے ہمعصر رہنماؤں کے مفہوم کی بہ نسبت کہیں زیادہ وسیع تھا۔ اس موضوع پر فروری ۱۹۰۷ء میں الہ آباد میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ حصولِ انصاف کے لئے التجائیں اور درخواستیں ایک طرف ہیں اور دوسری طرف شکایتوں کا ازالہ نہ ہونے کی صورت میں عدم تشدد پر مبنی مزاحمت ہے جس میں ٹیکسوں کی عدم ادائیگی تک شامل ہے۔ ان کا یہ کہنا محض ایک خطیبانہ حسنِ بیان ہی نہیں، کیونکہ ۱۹۰۷ء میں بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ گاندھی جی کی عدم تشدد کی تحریک نہایت مناسب ہے۔ جب کہ شکایتوں کے ازالے کی تمام صورتیں ناکام ہو چکی ہوں اور ہم میں سے اگر کوئی شخص ان دنوں ٹرانسول میں ہوتا تو وہ یقیناً گاندھی جی کی رہنمائی میں نہایت خوشی کے ساتھ اس جدوجہد میں حصہ لیتا اور اس مقصد کے لئے خندہ پیشانی کے ساتھ تکالیف برداشت کرتا۔" وہ گاندھی جی کے کس قدر مداح تھے، اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۰۹ء میں کانگریس کے اجلاس میں کی۔ انہوں نے اس تقریر کے دوران میں کہا تھا۔ "مسٹر گاندھی ان انسانوں میں سے ہیں جو خود انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں اور محبت، سچائی اور انصاف جیسے اعلیٰ اصولوں پر عمل کرتے ہیں اور سماج کے زبوں حال عوام کے سامنے ایک نئی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک عظیم انسان، بے مثال محبِ وطن اور باعثِ فخر انسان ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ذات میں بھارتی انسانیت اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے۔

<u>جنوبی افریقہ کا دورہ</u> : گوکھلے نے غیر ممالک میں رہنے والے بھارتی باشندوں کے مسائل میں کافی دلچسپی لی۔ گوکھلے ہی کی بدولت ان مزدوروں کا ترکِ وطن کر کے ناٹال جانا ممنوع قرار دیا گیا۔ جن سے کام سیکھنے کا اقرار نامہ لکھوایا جاتا تھا، انہی کی وجہ سے ان مزدوروں کو ترکِ وطن کر کے فجی، جمیکا، ٹرینی ڈاڈ اور گواٹا جانے سے روکا گیا۔ گاندھی جی کے اصرار پر گوکھلے نے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جنوبی افریقہ کا دورہ کیا، تاکہ وہاں رہنے والے بھارتی باشندوں کی مشکلات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں اور ان ناانصافیوں اور مظالم کا جائزہ لیں جو وہاں کے بھارتی باشندوں کو برداشت کرنا پڑتے تھے۔ گوکھلے کے اعزاز میں دیئے گئے ایک استقبالیہ میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ "گوکھلے کا نام ہی میرے لئے قابلِ احترام ہے۔ سیاسی میدان میں وہ میرے اُستاد ہیں۔ جنوبی افریقہ میں رہنے والے اپنے ہموطنوں کی جو کچھ بھی خدمت

میں کر سکا ہوں، وہ رشی گوکھلے ہی کا فیض ہے۔" گوکھلے نے ایک مہینے تک جنوبی افریقہ کا دورہ اور دسمبر ۱۹۱۲ء میں بمبئی واپس لوٹ آئے۔ ۱۴؍ دسمبر ۱۹۱۲ء کو بمبئی کے ٹاؤن ہال میں ایک جلسے میں انہوں نے بتایا کہ دورۂ جنوبی افریقہ کے دوران میں گاندھی جی ان کے ہمراہ رہے اور ان کے ساتھ مشرقی افریقہ بھی گئے۔ گوکھلے نے یہ بھی کہا کہ گاندھی جی نے میرے پرائیوٹ سکریٹری کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی، لیکن درحقیقت وہ میرے رہنما، فلسفی اور دوست تھے۔ جب جنوبی افریقہ کی حکومت نے گوکھلے سے کئے ہوئے وعدے توڑ دیئے تو گاندھی جی کو تحریک کا دوبارہ آغاز کرنا پڑا۔ گوکھلے نے عوام سے چندہ دینے کی اپیل کی اور گاندھی جی کی درخواست پر ۱۹۱۳ء کے آخر میں ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم انہیں بھیجدی۔ یہ اسی جد وجہد کا نتیجہ تھا کہ جنوبی افریقہ کی حکومت نے گاندھی جی کی تمام شرائط منظور کرلیں اور اس کے فوراً بعد گاندھی جی بھارت واپس آ گئے۔

گوکھلے نے شدت سے محسوس کیا کہ اب ہماری سیاسی زندگی میں ایک ایسا مقام آگیا ہے جب کہ عوام کے فلاحی کاموں پر مسلسل توجہ دی جائے اور مقصد کے لئے کوئی منظم ادارہ ہو۔ ۱۹۰۴ء میں مدراس کے ایک جلسے میں انہوں نے کہا کہ وہ دن اب نہیں رہے جب سیاست اس ملک میں ایک شوقیہ شغل سمجھی جاتی تھی۔ حالات کے تقاضوں کو کسی قدر پورا کرنے کی غرض سے انہوں نے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی۔ سوسائٹی کے ممبروں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ سادہ زندگی گذارنے کا عہد کریں۔ تمام بھارتیوں کو اپنا بھائی سمجھیں اور قومی خدمت ایک مذہبی فریضے کی طرح انجام دیتے رہیں۔ سوسائٹی کے ممبر مختلف فرقوں کے درمیان تعاون اور مفاہمت کے جذبے کو فروغ دینے کی کوشش کرتے تھے اور سیاسی سرگرمیوں میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہریجنوں کی تعلیم اور انہیں دوسرے لوگوں کے برابر لانے کے لئے بھی کوشاں تھے۔ گاندھی جی اور گوکھلے کے خیالات کی مطابقت اس قدر واضح ہے کہ کوئی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں ایسی شخصیتیں تھیں جو آپس میں غیر معمولی طور پر مربوط تھیں۔

<u>عوام کی فلاح کا جذبہ</u> : گوکھلے کو عوام کی فلاح و بہبود کی اتنی ہی فکر تھی جتنی کہ ملک کی آزادی کی۔ ان کا اقتصادی فلسفہ ان کے اور گاندھی جی اور موجودہ نسل کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے خیالات مضبوط اور جامع ہیں۔ مارچ ۱۹۰۲ء میں جب سپریم لیجسلیٹو کونسل میں گوکھلے نے بجٹ سے متعلق اپنی پہلی تقریر کی تو عوام کے اندر روز بروز بڑھتے ہوئے افلاس، زراعت کی ابتر حالت، نمک ٹیکس کے بوجھ کو کم کرنے کی ضرورت عوام کی تعلیم کے بارے میں زور دیا۔ وہ سال بہ سال عوام کی معاشی حالت کی مسلسل تباہی کا شدت کے ساتھ ذکر کرتے رہے۔ اسی طرح دوسرے ایسے مسائل کی طرف جن کا تعلق خصوصاً عوام کی فلاح و بہبود سے تھا، انہوں نے ہر سال کسی نہ کسی صورت میں اشارہ ضرور کیا، لیکن ۱۹۰۶ء میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار مکمل طور پر کر دیا۔ دوسری باتوں کے علاوہ گوکھلے نے مطالبہ کیا کہ زمین سے متعلق حکومت کے مطالبے پر پابندی لگائی جائے، آب پاشی کے ذرائع میں توسیع کی جائے۔ کسانوں کو کم شرح پر قرضہ فراہم کیا جائے۔ دیہاتوں کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے زیادہ اور موثر اقدامات کئے جائیں۔ زراعت میں جدید اور سائنسی طریقے اختیار کئے جائیں۔ صنعتی اور تکنیکل تعلیم کو فروغ دیا جائے تاکہ زمین سے کاشت کئے جانے کا بوجھ کم ہو سکے۔

انہوں نے ایک ایسے ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا بھی مطالبہ کیا جو کسی مرکزی مقام پر قائم کیا جائے اور جو تمام ساز و سامان سے پوری طرح آراستہ ہو اور اس ادارے کی شاخیں مختلف صوبوں میں ہوں۔ انہوں نے

یہ بھی ہدایت تھی کہ چند برسوں کے اندر عوام کے لئے لازمی اور بلا معاوضہ تعلیم کا انتظام کیا جانا چاہیئے۔
حقیقت یہ ہے کہ گوکھلے کا یہ ایمان تھا کہ آزادی اور خوش حالی کو قدم بہ قدم چلنا چاہیئے۔ گوکھلے کے قول کے مطابق وہ آزادی کچھ بھی نہیں ہے جو عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر نہ بنا سکے۔ ۱۹۰۶ء میں گوکھلے نے بجٹ پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ حکومت کی کہم کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف تو وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے مفاہمت پیدا کرے اور دوسری طرف دیہاتی عوام کے معاشی حالات کو بہتر بنائے اور ان تمام باتوں کو انہوں نے سارے زندگی اپنا مقصد بنائے رکھا۔
یہی وہ بات تھی جس سے متاثر ہو کر گاندھی جی گوکھلے کی طرف راغب ہوئے اور جیسا کہ خود گاندھی جی نے کہا ہے ان دونوں کے درمیان اختلاف رائے بھی تھا۔ مگر یہ اختلاف گاندھی جی کے راستے میں رکاوٹ بنا اور نہ گوکھلے ہی کی راہ میں۔ سب سے اہم چیز وہ جذبہ تھا جس کے ماتحت عوامی فلاح کا کام سرانجام دیا جاتا تھا۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے دستور کے دیباچے میں گوکھلے نے جو کچھ کہا تھا، گاندھی جی اس سے پوری طرح متفق تھے۔ گوکھلے نے کہا تھا کہ عوامی زندگی کو روحانیت کا جامہ پہنا دینا چاہیئے۔" گوکھلے کی وفات کے بعد گاندھی جی نے اُن کے بارے میں کہا تھا کہ اُن کے خیالات میں، قول اور عمل میں ملک کے لئے اُن کی قربانی پوشیدہ تھی۔
یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ جس وقت گاندھی جی نے ستیہ گرہ تحریک شروع کی۔ اُس وقت اگر گوکھلے زندہ ہوتے تو وہ دونوں کہاں تک ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر سکتے۔ ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ اظہارِ خیال کیا تھا۔ اگر اس وقت گوکھلے زندہ ہوتے تو اُن کی رہبری میں کام کرتے۔ اس سلسلے میں پورے یقین کے ساتھ کوئی رائے نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ایک حقیقت ہے کہ گوکھلے مہاتما گاندھی کی رُوحانی بلندی اور اُن خدمات سے جو انہوں نے جنوبی افریقہ میں بھارتی باشندوں کے لئے سرانجام دی تھیں، اتنے متاثر ہوئے تھے کہ وہ کسی بھی حالت میں گاندھی جی کا ساتھ نہ چھوڑتے، اور یہ بھی بہت ممکن تھا کہ ستیہ گرہ تحریک کی جزویات میں اعتدال پیدا ہو گیا ہوتا۔

---

ڈاکٹر بھبانی بھٹاچاریہ



# رابندر ناتھ ٹیگور

معجزے اگرچہ شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں، پھر بھی اُن کا رُونما ہونا ایک امر واقعی ہے۔ بھارت کی حالیہ تاریخ میں ایک حقیقی معجزہ رُونما ہوا۔ ایک ہی عہد میں دو ایسے شہرۂ آفاق انسانوں نے جنم لیا، جو لامتناہی عظمت کے مالک تھے۔
گاندھی جی رابندر ناتھ ٹیگور کی پیدائش کے آٹھ برس بعد پیدا ہوئے اور ٹیگور کی وفات کے بعد تقریباً آٹھ ہی برس تک اور زندہ رہے۔ اگرچہ دونوں کا طریق کار عرصۂ دراز تک دنیا کی نظروں سے اوجھل رہا، پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں نے دو متوازی خطوط پر اپنی زندگی کے بہترین کارنامے انجام دیئے۔ جیسے ہی ٹیگور نے زندگی کے تیسویں سال میں قدم رکھا، شہرت اُن کے قدم چومنے لگی ـــ اُن کی جہد مسلسل اور سعیٔ پیہم نے اُس عظمت میں چار چاند لگا دیئے جو قدرت نے انہیں پیدائش ہی سے عطا کی تھی۔ اِس کے برعکس گاندھی جی کا خمیر اُس عام مٹی سے اُٹھا تھا جس پر آہنی عزم و استقلال کی ایک رُوح مضمر تھی۔ اُس رُوح نے ان کے جسم کو اپنی مرضی کے مطابق سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ اِس عمل نے ایک ایسی شدید جد و جہد کا آغاز کیا، جو بعد میں ایک بے نظیر اور عظیم فتح ثابت ہوئی۔ اِن سب باتوں کے نتیجے میں ایک ایسا گاندھی نمودار ہوا جو شاید انسانی خود سازی کی تاریخ میں ایک معنی خیز مثال ہے۔
بیسویں صدی کے پہلے دس برسوں میں ٹیگور نے اپنی چند نفیس ترین نظمیں لکھیں، جن کے سبب ۱۹۱۳ء میں انہیں نوبل پرائز عطا کیا گیا۔ اُن ہی دنوں میں گاندھی جی جنوبی افریقہ میں نہایت سبک رفتاری سے ایک ایسے فلسفۂ حیات کی تشکیل کر رہے تھے جو جد و جہد کی انقلابی تکنیک میں نمایاں طور پر نمودار ہونا چاہتی تھی۔ جس زمانے میں ٹیگور نے گیتانجلی کی تصنیف کی، گاندھی جی کا ستیہ گرہ بھی اُسی زمانے میں وجود میں آیا تھا۔ چند مٹھی بھر افراد نے ایک نئے طرز کی مدافعتی تحریک کا آغاز کرنے کا عہد کیا، جس نے اُن کے دلوں کو بے خوفی اور خود آزاری کے جذبے سے معمور کر دیا۔ اُن لوگوں نے اس بات کا اقرار صالح کیا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کریں گے اور اپنی بے باکی کا ثبوت دیں گے۔ انہوں نے اس بات کی قسم کھائی کہ جب بھی اور جہاں کہیں خون بہے گا وہ ستیہ گرہی کا اپنا خون ہوگا نہ کہ مخالفین کا۔
جس تحریک کا آغاز جنوبی افریقہ میں ہوا تھا، وہ نظریاتی بنیاد پر مبنی تھی جسے بجا طور پر انقلابی کہا جا سکتا ہے۔ اِس تجربے کو جسے گاندھی جی نے سچائی کے تجربے کا نام دیا تھا، سمجھنے اور اُس کی حقیقت جاننے کے لئے دنیا کو ایک

عرصہ دراز تھا۔ یہ وہ تجربہ تھا جس نے جنوبی افریقہ کی سرزمین پر خاطر خواہ کامیابی حاصل کی اور جس کے نمایاں نتائج برآمد ہوئے۔ اور یہ حقیقت ساری دنیا پر آشکار ہے کہ جب گاندھی جی اپنی بیس سال کی غیر حاضری کے بعد بھارت لوٹے تو کس طرح اس تجربے نے ایک مضبوط اور طاقت ور صورت اختیار کر لی۔

## پہلی ملاقات

گاندھی جی اور ٹیگور کے براہ راست تعلقات اُس وقت اُستوار ہوئے جب ۱۹۱۵ء میں گاندھی جی اپنے معتقدوں کے ساتھ جنوبی افریقہ سے واپس لوٹے۔ ٹیگور کی دعوت پر انہوں نے شانتی نکیتن میں عارضی رہائش اختیار کی۔ جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ کی تحریک جاری تھی ٹیگور اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ گاندھی جی کے نام ایک مراسلے میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ "یہ جدوجہد نوع انسان کے لئے وہ زینہ ہے جسے عبور کرنے کے لئے تزکیۂ نفس کا اعلیٰ جذبہ درکار ہے۔ تشدد اور خون خرابے کے ذریعے اس بلندی تک نہیں پہنچا جا سکتا۔"

ان دو عظیم ترین ہندوستانیوں کی پہلی ملاقات بھارت کی ثقافتی تاریخ میں ایک ناقابلِ فراموش لمحہ تصور کی جاتی ہے۔ ان کی دوسری ملاقات ۱۹۱۷ء میں کلکتہ میں ہوئی، جہاں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اجلاس کے پہلے دن ٹیگور نے اپنی مشہور نظم "انڈیاز پریئر" (بھارت کی دُعا) پڑھی۔ ایک سال بعد گاندھی جی نے سی ایف اینڈریوز کو ایک خط میں لکھا کہ "آپ اور گرودیو اپنی زندگی کا بہترین کام سرانجام دے رہے ہیں۔" آپ جو نظمیں تحریر کر رہے ہیں وہ حقیقی اور زندۂ جاوید نظمیں ہیں۔"

پھر ایک ایسا جذباتی لمحہ آیا جس نے گاندھی جی اور ٹیگور کو ایک دُوسرے سے اور بھی قریب کر دیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ۱۹۳۲ء میں گاندھی جی نے یراوُدا کی جیل میں "کمیونل ایوارڈ" کے سوال پر مرن برت رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ برت رکھنے سے قبل اُنہوں نے ٹیگور کو اپنے ارادے سے باخبر کیا اور اُن کی نیک خواہشات چاہیں۔ گاندھی جی نے لکھا تھا کہ آپ کی دُعائیں مجھے سہارا دیں گی اور میری مدد کریں گی۔ اگر آپ میرے اس عمل سے راضی نہیں ہیں تو میں ہر قیمت پر اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار ہوں۔" لیکن ابھی یہ خط ڈاک کے سپرد بھی نہیں ہوا تھا کہ گاندھی جی کو ٹیگور کا ایک تار موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ "بھارت کے اتحاد و سالمیت اور اُس کی سماجی یکجہتی کے لئے جان دینا ایک عظیم اور بے مثال قربانی ہے۔ ہمارے رنجیدہ دل آپ کی اِس عقوبتِ نفس کا ہمیشہ احترام کریں گے۔" کچھ دنوں بعد ٹیگور گاندھی جی کی تیمارداری کے لئے پُونا پہنچ گئے۔ انہوں نے گیتانجلی کی ایک نظم گاندھی جی کو سُنائی:

"دل کی خشک اور جھلسی ہوئی وادی کو اپنے رحم و کرم کی بارش سے سیراب کر دو۔"

ٹیگور کی تمام نظموں میں یہ نظم گاندھی جی کو بے حد پسند تھی۔

## وِشو بھارتی

جب کبھی وشو بھارتی اقتصادی بحران سے دوچار ہوئی، گاندھی جی نے اُس کے لئے چندہ اکٹھا کیا اور حتیٰ الامکان مالی امداد بہم پہنچائی۔ ٹیگور کی وفات کے بعد گاندھی جی نے آخری بار شانتی نکیتن کا دورہ کیا۔ آشرم میں رہنے والوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "گرودیو نے ساری دنیا میں بھارت کا نام روشن کیا ہے۔ اگرچہ آج ہم اُن کی شفقت و سرپرستی سے محروم ہو گئے ہیں پھر بھی ہمیں مایوس و غمگین نہیں ہونا چاہیے۔ سنگِ مرمر، تانبے یا سونے کے مجسمے عظیم انسانوں کی یادگار نہیں ہوتے۔ انہیں یاد رکھنے کا واحد اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم

اُن آدرشوں پر جو ہمیں اُن سے ورثے میں ملے ہیں، صدقِ دل سے عمل پیرا ہوں اور اُن کی اشاعت و تبلیغ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں۔

## نظریاتی اختلافات

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گاندھی جی اور ٹیگور کے نظریات و خیالات کے درمیان اختلافات کی ایک خلیج حائل تھی۔ سی ایف اینڈریوز کا کہنا ہے کہ اگرچہ دونوں کی دوستی کی اخلاقی بندشیں ہمیشہ مضبوط اور ایک دوسرے سے مربوط رہیں، پھر بھی دونوں کا ایک نقطۂ مفاہمت پر پہنچنا بہت مشکل تھا۔ ایک مشہور و معروف امریکی جان ہینس ہومز نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے: "وہ دونوں ایک دوسرے سے اُتنے ہی مختلف تھے جتنے اِراسمس اور لوتھر۔ گاندھی جی اور ٹیگور دو ایسے انسان تھے جنہوں نے تاریخ عالم میں ایک ایسے دَور کا آغاز کیا جسے انسانی تاریخ کا ایک روشن باب کہا جا سکتا ہے۔"

یہ اختلاف یکایک پھوٹ پڑا۔ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی اور ٹیگور نے جلیانوالہ باغ کے مظالم کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ ٹیگور نے حکومت برطانیہ کا عطا کردہ "نائٹ ہُڈ" کا خطاب واپس کر دیا اور جلیانوالہ باغ کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے وائسرائے کو ایک خط لکھا کہ "یہ وہ مظالم ہیں جن کی مثال مُہذّب حکومتوں کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔" وائسرائے کو خط لکھنے سے قبل انہوں نے گاندھی جی کو ایک خط بھیجا، جس میں اُن کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "عوام کے عظیم قائد کی حیثیت سے ہمارے درمیان رہ کر آپ نے اُس آدرش میں اپنے یقین کا اعلان کیا، جسے آپ بھارت کا آدرش سمجھتے ہیں۔ گوتم بُدھ نے اپنے دَور کے انسانوں اور آنے والی نسلوں کو جو پیغام دیا تھا، وہی پیغام آپ کا بھی ہے۔ گوتم بُدھ نے کہا تھا "غصے پر نرمی، منکسر المزاجی اور خندہ پیشانی سے فتح حاصل کرو اور بُرائی پر فتح پانے کے لئے نیکی اور اچھائی کا سہارا لو۔" جو لوگ رُوحانی زندگی میں ایمان رکھتے ہیں، وہ یہ جانتے ہیں کہ ایسی بُرائی کے خلاف جدوجہد کرنا جسے مادّی طاقت کی پُشت پناہی حاصل ہو، خود ایک فتح ہے۔ اس کے ساتھ ہی ٹیگور نے یہ تنبیہ بھی کی: "میں اکثر و بیشتر یہ دُعا کرتا ہوں کہ جذبۂ شہادت کسی بھی صورت میں ہو، تعصب و تشدّد کی شکل اختیار نہ کرنے پائے۔"

دو سال بعد ہی ٹیگور کے تمام اندیشوں نے حقیقت کا رُوپ اختیار کر لیا۔ بھارت میں ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ اُس وقت ٹیگور یورپ اور امریکہ کے چَودہ مہینے کے دَورے پر گئے ہوئے تھے۔ اُن کا مقصد وِشو بھارتی کو بین الاقوامی یونیورسٹی بنانے کے لئے غیر ملکی امداد حاصل کرنا تھا۔ بھارت میں ستیہ گرہ کے آغاز نے اُن کے دل میں جذبات کی ایک لہر سی دَوڑا دی۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں اُنہوں نے ایک خط میں تحریر کیا: "ستیہ گرہ کا آغاز میرے لئے ایک پیغامِ مسرّت ہے۔ یہی حقیقی آزادی ہے۔ اخلاقی قوت، بہیمانہ طاقت سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے۔ حالات کا عین تقاضہ یہ ہے کہ گاندھی جی جو جسمانی طور پر ناتواں ہیں اور مادی وسائل سے محروم ہیں، وہ حلم و انکسار کی بے پایاں قوت کو برُوئے کار لائیں۔"

مگر جب بھارت سے مزید خبریں اُن کو موصول ہونے لگیں تو یہ طلسم جلد ہی ٹوٹ گیا۔ جب اُنہیں معلوم ہوا کہ بھارت میں ستیہ گرہ کی مقبولِ عام تحریک نے ایک نئی کروٹ لی ہے تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ اُنہوں نے سوچا کہ قسمت کا یہ کیسا مذاق ہے کہ ایک طرف تو وہ مشرق و مغرب کے ثقافتی تعاون کی تبلیغ کر رہے ہیں اور دُوسری طرف بھارت

نے مغربی ثقافت نیز مغربی تعلیم کو مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔

## گاندھی جی کا جواب

'ینگ انڈیا' کے ایک مضمون 'شاعر کی تشویش' کے تحت گاندھی جی کا جواب شائع ہوا جس میں انہوں نے بڑے نرم انداز میں ٹیگور کے تمام اندیشوں کو دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ عدم تعاون کی تحریک کو ٹیگور تنگ نظری اور انتہاپسندی کا ایک منفی نظریہ سمجھتے تھے۔ لیکن اُن کے یہ سارے اندیشے بے بنیاد اور لایعنی تھے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ عدم تعاون کا مقصد بھارت اور مغربی ممالک کے درمیان تفرقے اور اختلافات کی دیوار کھڑی کرنا نہیں ہے بلکہ یہ تحریک ایسے باعزت اور رضاکارانہ تعاون کا باعث ہوگی جو باہمی عزت و اعتماد کے جذبات پر مشتمل ہوگا۔ "ایسا بھارت انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، جو خود یورپ کے قدموں میں جھکا ہوا ہو۔"

ٹیگور نے اس کا جواب "دی ماڈرن ریویو" میں 'دعوتِ حق' کے عنوان سے ایک مضمون میں دیا جس میں انہوں نے ستیہ گرہ کی تحریک کی عظمت کا اعتراف کیا تھا۔ اُس وقت تک عوام پوری طرح بیدار نہیں ہو پائے تھے۔ پھر مہاتما گاندھی میدانِ عمل میں اُترے اور بہ نفسِ نفیس اُن کروڑوں بھارتیوں کے پاس گئے جو افلاس و کسمپرسی کی زندگی گذار رہے تھے۔ اُن کی وضع قطع اور اندازِ گفتگو سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اُن لوگوں سے مختلف ہیں۔ . . مہاتما کا جو لقب انہیں اُن کے شیدائیوں نے دیا، وہ اُن پر پوری طرح صادق آتا تھا۔ گاندھی جی کے علاوہ کیا کسی اور شخص نے بھی یہ محسوس کیا تھا کہ بھارتی باشندے اُن کے اپنے عزیزوں کی طرح ہیں۔ سچائی نے سچائی کو بیدار کیا اور اُس کے جسم میں ایک نئی رُوح پھونکی۔

بھارت کی اس عظیم بیداری کی خبریں سات سمندر پار ٹیگور تک پہنچ چکی تھیں۔ ٹیگور کا قیام وہیں رہا۔ جب بھی انہیں یہ خیال آتا کہ بھارت کی رُوح کی حقیقی قوت بار آخر کامیاب ہو کر ہی رہے گی تو اُن کا دل مسرت و شادمانی سے جھوم اٹھتا تھا۔ لیکن جلد ہی اُن کی یہ ساری خوشیاں خاک میں مل گئیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ اس بیداری کی پشت پر وہی تعصب و تشدد کارفرما ہے جس کا انہیں اندیشہ تھا، تو انہیں کافی صدمہ ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ عوام اندھی تقلید پر زور دے رہے ہیں، دل و دماغ کی آزادی نے دم توڑ دیا ہے، سوراجیہ کے حصول کے لئے جو طرزِ عمل اپنایا گیا ہے وہ حد سے زیادہ سادہ ہے۔ خوش آئند مستقبل کا تقاضہ یہ ہے کہ عوام متحد ہو جائیں۔ ٹیگور نے یہ محسوس کیا کہ عوام کے اندر جو برہمی پھیل رہی ہے وہ بہتر دنیا کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دے گی۔

اس کے جواب میں گاندھی جی نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا 'عظیم نگہبان'۔ یہ وہ لقب تھا جو خود انہوں نے ٹیگور کو دیا تھا۔ گاندھی جی نے ٹیگور کی اس بات کو تسلیم کیا کہ استدلال کو اندھی تقلید پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ انہوں نے لکھا کہ "محبت کے تئیں اندھی خود سپردگی بعض اوقات ظالم کی مدافعت و مزاحمت سے بھی زیادہ فتنہ انگیز ثابت ہوتی ہے۔ چرکھے کو اپنانے کا سب سے بڑا جواز بھارت کی روز افزوں غربت اور فاقہ کشی ہے۔ بھارت کو اپنے زوال، مفلسی اور بیماریوں سے بچنے کے لئے دنیا کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔ دنیا میں شاستروں کی تبلیغ کرنے کا اُس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک ہم خود اُن کی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہوں۔ ملت پروری اور وطن دوستی صرف بھارت کے لئے ہی مخصوص نہیں اور نہ ہی اُس کے پیچھے کسی قسم کی تباہکاری

سا کوئی عنصر یا جذبہ پوشیدہ ہے"۔ گاندھی جی نے کہا کہ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ کبیر کے گیت سے مریضوں کو شفا نہیں ہو سکتی۔ ہزاروں بھوکے عوام صرف ایک ہی نظم کا سوال کرتے ہیں۔ وہ نظم ہے "کھانا"۔ ایک ایسا کھانا جو اُن کا پیٹ بھر سکے اور اُن کے ناتواں جسموں میں ایک نئی رُوح پھونک سکے۔

## حقیقی پس منظر

گاندھی جی اور ٹیگور کی زندگی کے اِس خلا کو حقیقی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔ جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ "دو انسانوں کے مزاج اور خیالات میں اتنا زیادہ فرق کہیں اور نہیں مل سکتا، جتنا فرق گاندھی جی اور ٹیگور میں تھا مگر اِس کے باوجود دونوں نے بھارت کے مختلف لیکن یکساں پہلوؤں کی نمائندگی کی اور اِس سلسلے میں ایک دوسرے کے عمل کی تکمیل کی۔ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوتے ہوئے بھی ان دونوں میں کس قدر یکسانیت تھی"۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی اختلاف اُن کے ذاتی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوا اگرچہ گاندھی جی اور ٹیگور دو مختلف نظریات کے نمائندے تھے، پھر بھی یہ نظریئے ایک دوسرے سے مربوط و مخلوط تھے، ایک ہی عہد اور ایک ہی ملک میں دو مختلف نظریوں کے ان نمائندوں کی موجودگی اور باہمی اختلاط ایک معجزہ نہیں تو اور کیا تھا۔!

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

---

## بقیہ — لوکمانیہ تلک — صفحہ ۲۰۸

وہ یہ جملہ دُہرایا کرتے تھے کہ مکار اور فریبی سے بھی میں شرافت کا برتاؤ کروں گا"۔

## نیک اثرات

گاندھی جی اور تلک دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے صحت مندانہ اور نیک احساسات موجود تھے۔ بھارت کے مفاد کی خاطر دونوں کے خیالات ایک دُوسرے سے کافی متاثر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آزادی کی جدوجہد میں دونوں نے متحد ہو کر حصّہ لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن دونوں عوام پر اِن دونوں کے اثرات جُداگانہ تھے۔ تلک کے بعض ماننے والوں کا رویّہ گاندھی جی کے لئے اہانت آمیز تھا۔ یہ رویّہ نہ صرف تلک کی زندگی میں بلکہ اُن کے انتقال کے بعد بھی برقرار رہا، حالانکہ تلک نے اپنے پیروؤں کو متنبّہ کر دیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف گاندھی جی کی جدوجہد میں کوئی رخنہ نہ ڈالیں۔

جہاں تک جدید بھارت کی تاریخ اور واقعات پر گاندھی جی اور تلک کے اثرات کا تعلق ہے، یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب گاندھی جی کی شخصیت بھارتی اُفق پر اُبھری، اُس وقت تک تلک عوام کے ذہنوں تک ہی محدود تھے۔ عوام کے ذہنوں پر گاندھی جی کا اثر ۱۹۱۹ء کے بعد مرتب ہونا شروع ہوا۔ ویرم گام، چمپارن اور کھیڑا کے مسائل حل کرنے اور احمد آباد کے مزدوروں کے اختلافات دُور کرانے میں گاندھی جی کو جو نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں اُن ہی کی وجہ سے گاندھی جی نے عوام کے دِلوں میں گھر کر لیا۔ لوگوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ گاندھی جی کا طریق کار اُن کے لئے سُود مند ثابت ہوگا بشرطیکہ وہ اُس پر عمل کریں۔ اس بات کا سہرا تلک کے سر ہے کہ اُنہوں نے ۱۹۱۹ء ہی میں اندازہ کر لیا کہ گاندھی جی میدانِ عمل میں اُترنے والے ہیں۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی



# امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق      ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ــــ آہ، انہیں مرحوم کہتے ہوئے کتنا دکھ ہوتا ہے! ــــ بیسویں صدی کے ہندوستان کی اُن شخصیتوں میں شامل ہیں جنہیں ہمارے ملک کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی اور اگر فراموش کرے گی تو سب سے بڑی احسان فراموشی کا ثبوت دے گی!

مولانا کی شخصیت عجیب و غریب تھی۔ وہ سیاست دانوں کی محفل میں سب سے بڑے عالم اور علماء کی مجلس میں سب سے بڑے سیاست دان تھے۔ یہی اُن کے ایک عجیب و غریب شخصیت ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اربابِ علم و فکر عزلت گزیں اور تنہائی پسند ہوتے ہیں اور سیاستدان ہجوم اور ہنگامۂ محفل کے قائل، لیکن مولانا وہ عالم سیاستدان تھے جو تنہائی میں انجمن ہوتے تھے اور ہجوم میں تنہا۔

صاحبانِ علم کو زندگی کی ابدی صداقتوں اور کائنات کے لازوال حقائق سے دلچسپی ہوتی ہے اور سیاست دانوں کو آئے دن کی بوقلمونیوں یا زندگی کے اُن سطحی واقعات سے تعلق ہوتا ہے جو روزمرہ متغیّر ہوتے رہتے ہیں ــــ مولانا زندگی کی ابدی اور سرمدی حقیقتوں میں روزمرہ کی زندگی کے قوانین تلاش فرماتے تھے اور روزمرہ کی سطحی زندگی سے حقیقتوں کا پتہ چلاتے تھے۔

مولانا جیل خانہ کی سختیوں اور پریشانیوں میں اتنے مطمئن ہوتے تھے کہ کتابیں لکھتے تھے اور گھر کی پُرسکون چار دیواری میں اتنے پریشان خاطر اور بے چین رہتے تھے کہ مشکل ہی سے کوئی علمی اور فکری کارنامہ انجام دے سکتے تھے!

مولانا انتہائی پُرسکون اور باوقار نظر آتے تھے لیکن اُن کے دل میں ہمیشہ انقلاب کا لاوا پکتا رہتا تھا ــــ وہ ایک دریا تھے جو سطح پر تو پُرسکون نظر آتا ہے لیکن جس کی تہہ میں طوفان پلا کرتے ہیں!

وہ ایک پرانے مسلم گھرانے کے فرد تھے۔ ان کے والد مولوی بھی تھے اور پیر بھی۔ انہوں نے گھر ہی پر تعلیم و تربیت حاصل کی اور یہ تعلیم جیسی ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے۔ خاندانی ماحول اور گھریلو تعلیم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ ایک قدامت پسند مولوی ہوتے، پیر ہوتے، سجادہ نشین ہوتے، ہر پرانی اور بوسیدہ روایت کے امین ہوتے، تاریک خیالی، واہمہ پرستی اور عجائب پسندی کے داعی ہوتے لیکن تعلیم، تربیت، ماحول اور خاندان کے تمام تقاضوں کے برخلاف وہ ایک

مصلح تھے ایک روشن خیال انسان تھے اور جہاں عہدِ قدیم کی تہذیب کا مکمل نمونہ تھے وہیں دورِ جدید کے تقاضوں کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔

مولانا اس وقت سیاست کے میدان میں داخل ہوئے جب مسلمانوں میں یا تو سیاست سے بیگانگی کا وہ فلسفہ عام تھا جیسے سر سید احمد خاں نے رائج کیا تھا اور یا پھر علٰحدگی پسندی کا وہ رجحان عام تھا جیسے سر آغا خاں کی مسلم لیگ نے پیدا کیا تھا۔ مولانا نے بے تعلقی اور علیحدگی پسندی کے اس طلسم کو توڑ کے مسلمانوں کو پہلی مرتبہ قومی اور وطنی سیاست میں حصّہ لینے کی دعوت دی۔ انکی آواز میں ایک کڑک تھی، ایک گرج تھی، ایک للکار تھی، جس نے سوئے ہوئے مسلمانوں کو جھنجھوڑا، انہیں ایک نئی دنیا کی سیر کرائی اور ان میں انقلاب کی وہ چنگاریاں پیدا کر دیں جو تحریکِ خلافت کے زمانے میں شرارہ بن کر نمودار ہوئیں اور جنکے نتیجے میں ہندوستان میں وہ عدیم المثال تحریکِ ترکِ موالات شروع ہوئی جس نے محض دو سال کی مدت میں استقلال و استبداد کے حصنِ حصین میں ایسے شگاف ڈال دیئے جنکے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں یہ قلعہ ہمیشہ کے لئے زمین بوس ہو گیا۔

مولانا کی زندگی کے یہ گوشے دلچسپ بھی ہیں اور فکر آفریں بھی!

مولانا ایک بڑے مسلمان عالم تھے، مفسّر تھے، علمِ کلام کے ماہر تھے لیکن اُن کی مذہبی تصانیف یا مضامین میں کہیں قدامت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ وہ اسلام کا جو تصوّر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ روایت سے زیادہ درایت پر، تقلید سے زیادہ اجتہاد پر اور اسلاف پرستی سے زیادہ عقلیت پر مبنی ہوتا ہے وہ سر سیّد کی طرح اسلام کو یورپی افکار کے سانچے میں نہیں ڈھالتے۔ وہ اس تجدد کے بھی قائل نہیں ہیں جو اسلام کے حسن اور سادگی پر یورپی افکار کا غازہ مل کر اسے مسخ کر دیتا ہے بلکہ وہ صرف ان حقائق کا اعلان کرتے ہیں جو اسلام کی حقیقی روح ہیں اور ان الفاظ میں کرتے ہیں جو دل میں اترتے چلے جاتے ہیں، وہ عقل اور دین کا ایسا امتزاج پیش کرتے ہیں جو جدید ذہنوں کی بھی تسکین کر دیتا ہے اور اس روح کو بھی قائم رکھتا ہے جو قرآن کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔

ادب کے میدان میں بھی مولانا منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ انکی تحریر میں ایسا جادو ہوتا ہے جو پڑھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے، الفاظ کی نشست، جملوں کی ترکیب، بیان کا شکوہ اور تحریر کی تاثیر میں وہ اپنی آپ مثال تھے۔ انکی تحریروں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں لفّاظی اور خطابت کا زور و شور حد سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ اعتراض کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ ادب بہرحال الفاظ کا فن ہے اور کسی ادیب پر یہ اعتراض مہمل ہے کہ وہ اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لئے کتنے اور کس قسم کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس کے الفاظ مناسبِ حال ہیں یا نہیں؟ ادیب کے مفہوم کی پوری وضاحت کرتے ہیں یا نہیں؟ اور ان میں جوش اور تاثیر کا وہ عنصر موجود ہے یا نہیں جو قارئین کے ذہنوں کو متاثر کر کے حسنِ زبان اور لطفِ بیان کا وہ طلسم آراستہ کر دیتا ہے، جس کا نام ادب ہے۔ جب اس پیمانے پر مولانا کی تحریروں کو جانچا جاتا ہے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مولانا کو اپنے مفاہیم کی مناسبت سے موزوں الفاظ کے انتخاب کا بڑا سلیقہ حاصل تھا اور اس اعتبار سے وہ ایک ایسے ادیب تھے جس کے مقابلے میں شاید محمد حسین آزاد کے علاوہ کسی دوسری شخصیت کو لانا محال ہے۔ مولانا نے اپنی تحریروں میں ہزاروں نئے عربی اور فارسی الفاظ استعمال کئے اور اس طرح انہوں نے توسیعِ زبان کا وہ فریضہ انجام دیا جس کی صرف ایک عبقری ہی سے توقع کی جا سکتی ہے۔ شعراء میں یہ فخر صرف شیخ ناسخ کو حاصل ہے کہ

انہوں نے فارسی کے دہ تمام الفاظ جو اُن سے پہلے اُردو میں مستعمل نہیں تھے اپنے کلام کی مدد سے اُردو میں داخل کر کے توسیعِ زبان کا فریضہ انجام دیا۔ شیخ کے بعد مولانا دوسری شخصیت ہیں جس نے عربی اور فارسی کے ہزاروں لفظوں کو اِس خوبصورتی اور خاموشی سے ہماری زبان میں داخل کر دیا کہ پڑھنے والے یہ محسوس بھی نہیں کرتے کہ یہ لفظ اُردو ادب میں پہلی مرتبہ استعمال ہو رہے ہیں۔ مولانا کا یہ ایک ایسا احسان ہے جس کا اندازہ ابھی تک ادبی دنیا کو نہیں ہو سکا ہے اور ایک ایسی خدمت ہے جس کی خاطر ان کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہنا چاہیئے۔

نثر کو موثر بنانے کے لئے اشعار کا استعمال ہمارے ادب میں کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن مولانا کو اس فن میں جو خصوصی کمال حاصل تھا اس کی نظیر ہماری ادبی تاریخ میں دستیاب نہیں ہوتی۔ عبارت میں شعر اس طرح استعمال کرتے تھے گویا نگینہ جڑ دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر نے اسی موقع کے لئے شعر کہا ہے۔ مولانا کے دماغ کے خزانے میں ہزاروں شعر محفوظ تھے اور یہ انکی ذہانت کا کمال تھا کہ وہ حافظے کے ایوان سے اسی شعر کو چھانٹ کر حاضر کر دیتی تھی جس کی مولانا کو حاجت ہوتی تھی۔ بعض لوگوں کو یہ خیال ہے کہ مولانا اس سلسلے میں بڑی تلاش و جستجو اور بڑی کدوکاوش سے کام لیتے تھے لیکن یہ بظاہر درست نہیں ہے اس لئے کہ قید خانوں میں لکھے ہوئے مضامین میں بھی اشعار کی مناسبت کا یہی عالم ہے اور ظاہر ہے کہ وہاں مولانا کے پاس نہ دواوین تھے اور نہ کتابیں۔ ایسی حالت میں یہی ماننا پڑتا ہے کہ انکا یہ کمال ان کی ذہانت اور ان کے بے پناہ حافظے کا نتیجہ تھا اور یہی وہ دو صفات تھیں جو تحریر میں ان کی معاون ہوا کرتی تھیں۔

مولانا جہاں ایک بڑے سیاست داں، بڑے عالم اور بڑے ادیب تھے وہیں بڑے انسان بھی تھے۔ چاہتے تو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لاکھوں روپے کماتے، جواہرات میں کھیلتے، موتیوں میں تولے جاتے لیکن انہوں نے فقر و درویشی کی زندگی قبول کی اور کسی کا مرہونِ کرم ہونا پسند نہیں کیا۔ وہ پیری مریدی کے قائل تو نہیں تھے لیکن فقر و استغنا کی اس منزل پر ضرور فائز تھے جس پر اولیاء فائز ہوا کرتے ہیں، اُن کے صبر کا یہ عالم تھا کہ زندگی کی تلخ سے تلخ منزلوں میں بھی کسی نے اُن کا چہرہ اُترا ہوا نہیں دیکھا۔ بلند نگاہی کی یہ کیفیت تھی کہ لوگ انہیں بُرا کہتے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی اس کا کوئی اثر نہیں لیا اور اپنے سخت سے سخت دُشمن پر بھی کوئی جوابی حملہ نہیں کیا۔ جوابی حملے تو در کنار انہوں نے کبھی اپنی مدافعت میں بھی ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ حلم اور وقار کا ایک پہاڑ تھے، استقلال و استقامت کا ایک کوہِ گراں تھے اور دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں تھی جو انہیں ان کی طے شدہ راہ سے ہٹا سکتی۔ وہ شدید سے شدید مشکل میں بھی نہ صرف یہ کہ ہمت نہیں ہارتے تھے بلکہ ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لیکر ایک فیصلہ کرتے تھے اور پھر اس فیصلے پر اٹل ہو جاتے تھے۔ خوف یا حزن اُن کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ ان کے کردار کی یہی خوبیاں تھیں جنہوں نے اُن کے مخالفین کو بھی ان کا احترام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مولانا کی سیاسی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ وہ اس وقت سیاست کے میدان میں داخل ہوئے۔ جب جنگ بلقان نے ہندوستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب برطانوی سلطنت اپنے عروج و کمال پر تھی اور انگریزوں کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مولانا ابو الکلام اس وقت کوئی بہت بڑے سیاسی رہنما نہیں تھے، صرف ایک صحافی تھے لیکن انہوں نے انتہائی جرأت سے کام لیتے ہوئے حکومت کی مخالفت شروع کی اور اسوقت جیل گئے جس وقت انڈین نیشنل کانگریس کے قائدین سرکارِ برطانیہ کی وفاداری کی تجاویز پاس کیا کرتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم

چھڑی تو اُس وقت بھی ابوالکلام قید و بند کا شکار ہوئے۔ یہ وہ دَور تھا جب گاندھی جی سرکاری فوجوں میں سپاہی بھرتی کرا رہے تھے اور اس خدمت کے صلے میں قیصرِ ہند میڈل سے نوازے جا رہے تھے۔ معاذاللہ میری مُراد گاندھی جی یا کسی دوسرے قومی رہنما پر تعریض نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اُس وقت بھی جب ہماری قومی تحریک میں انقلاب کے شرار بیدار نہیں ہوئے تھے مولانا اُسی مسلک پر گامزن تھے جس پر وہ آخر عمر تک گامزن رہے۔ اِس کے بعد وہ کانگریس کے قائدین کی صفِ اوّل میں شامل ہوئے اور شاید یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ۱۹۲۱ء سے لیکر ۴۷ء۱۹ تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جتنی اہم تجاویز منظور کیں، اُن سب کا مسوّدہ مولانا کا تیار کیا ہوا ہے۔ پہلے مولانا اُردو میں تجویز مرتب فرماتے تھے اور اسکے بعد عام طور پر جواہر لال جی اُس کا انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ شائع ہونے کے بعد تمام مسلمان کانگریس سے ہٹ گئے لیکن مولانا بلا خوفِ لومۃ الائم کانگریس میں شریک رہے۔ یہ وہ دَور تھا جب جمعیۃ علما کے قائدین بھی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تھے لیکن مولانا نے کسی کی پروا نہیں کی اور اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب مسٹر جناح کی سرکردگی میں مسلم لیگ کی نشاۃ الثانیہ ہوئی۔ یہ مولانا کے لئے انتہائی صبر آزما دَور تھا۔ مسلمان گالیاں دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ انہیں نمازِ عید کی امامت سے بھی علیحدہ ہونا پڑا۔ لیکن واقعات شاہد ہیں کہ انہوں نے کبھی اپنے مخالفین کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر نہیں آنے دیا۔ وہ سب کچھ سُنتے رہے اور برداشت کرتے رہے۔ اس نازک دَور میں اُنہوں نے جس صبر و استقامت اور جس حلم و وقار کا مظاہرہ کیا، اُس کی مثال کمتر ہی دستیاب ہو سکتی ہے۔

مولانا تقسیم ہند کے سخت مخالف تھے اور آج یہ حقیقت سبھی کو معلوم ہے کہ گاندھی جی اور مولانا ہی دو ایسے شخص تھے جو تقسیم کی تجویز کو ماننے پر تیار نہیں تھے لیکن چونکہ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نہ صرف یہ کہ تقسیم پر مُصر تھے بلکہ اُنہوں نے اپنے اثرات سے کام لے کر پوری ورکنگ کمیٹی کو بھی اِس تجویز کے ماننے پر آمادہ کیلیا تھا، اِسلئے مولانا کو مجبوراً اپنے قلب و ضمیر کے فیصلے کے خلاف اِس تجویز کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے، جو ورکنگ کمیٹی کے اس جلسے میں موجود تھے جس میں تقسیم ہند کا فیصلہ ہوا تھا۔ اپنی کتاب "تقسیم ہند کے مجرم" میں اس اجلاس کی جو چشم دید تفصیلات دی ہیں اُن سے اس وقت مولانا کی مجبوری کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے لیکن ایک جمہوریت پسند قائد کی حیثیت سے جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ورکنگ کمیٹی کی اکثریت نے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کا ساتھ دیتے ہوئے تقسیم کا فیصلہ کر دیا ہے تو انہوں نے کسی ناراضی کا اظہار کئے بغیر اس فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب جمعیۃ علماء کے قائدین کھُلم کھُلا کانگریس کے فیصلے سے اظہار بیزاری کر رہے تھے لیکن مولانا یہ ثابت کر رہے تھے کہ وہ ایک حقیقت پسند سیاستدان ہیں اور بلا وجہ کی جذباتیت کا مظاہرہ کر کے حالات کو قابو سے باہر نہیں جانے دینا چاہتے۔ اسکے بعد وہ منزل آئی کہ مولانا کا خواب پُورا ہوا۔ ہندوستان آزاد ہوا اور مولانا نے وزارتی ذمہ داریاں قبول فرمائیں۔ یہ انہیں کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کو نہ صرف یہ کہ سیکولر اسٹیٹ قرار دیا گیا بلکہ اُس انتہائی جذباتی فضا میں بھی جبکہ لوگ دیوانے ہو رہے تھے، دستور ہند میں اقلیتوں کے لئے تمام ضروری تحفظات کا بندوبست کیا گیا۔ یہ اُنکی ایک بڑی خاموش خدمت تھی جسکی قدر و قیمت کا خیر آج کو کسی کو اندازہ نہیں لیکن ایک دو نسلیں گزرنے کے بعد مستقبل کے مورّخ ضرور اِس کی اہمیت محسوس کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

یہ وہ دور تھا جب پاکستانی پروپیگنڈہ کے نتیجے میں ممالکِ اسلامیہ میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ ہندوستان سے

یا تو سارے مسلمان ہجرت کر گئے یا مار ڈالے گئے۔ اِس کا اثر ہندوستان کی خارجی سیاست پر بہت برا پڑ رہا تھا۔ مولانا نے پھر اس منزل پر ملک کی دستگیری فرمائی۔ ثقافۃ الہند جاری کر کے مسلمانوں اور عربوں کے تعلقات بہتر بنائے، وفود روانہ کئے اور خود بھی بعض مسلم ممالک میں تشریف لے جا کر ہندوستان اور دنیائے اسلام میں ایسا رابطہ قائم کر گئے جو زمانہ کے انقلابات اور خود بھی ہندوستانی سیاسی جماعتوں کی مخالفانہ روش کے باوجود آج تک قائم، مضبوط اور پائیدار ہے۔

ہندوستان کے سیاسی قائدین میں مولانا جس شخصیت کا سب سے زیادہ احترام فرماتے تھے وہ گاندھی جی کی شخصیت تھی۔ سردار پٹیل سے اُن کے اختلافات رہے۔ پنڈت نہرو پر بھی انہوں نے انتہائی بے باکی سے تنقید کی ہے لیکن جس شخصیت کا اُنہوں نے ہمیشہ احترام کیا، وہ گاندھی جی تھے۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہو کہ یہ دونوں قائدین کردار کی پختگی کی اعلیٰ ترین منزل پر فائز تھے اور مولانا چونکہ دولت، نام یا شہرت کے بجائے محض کردار سے متاثر ہوا کرتے تھے اِس لئے گاندھی جی کی اُنکی نگاہ میں بے پناہ عزت تھی۔ گاندھی جی بھی کانگریس کے دوسرے تمام قائدین کے مقابلے میں مولانا کا زیادہ احترام کرتے تھے اُنکی ہر بات کو توجہ سے سُنتے اور فوراً قبول کر لیتے تھے یہ شرف کانگریس کے کسی دوسرے لیڈر کو حاصل نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب جواہر لال جی بھی گاندھی جی سے کوئی بات منوانا چاہتے تھے تو مولانا کا سہارا لیا کرتے تھے۔

آج نہ گاندھی جی ہیں، نہ مولانا۔ لیکن اِن دونوں کا کردار اور اِن دونوں کا باہمی احترام آج کے قائدین کے لئے اگر سبق آموز نہ سہی تو موجبِ تنبیہ اور دعوتِ فکر ضرور ہے۔ ▲

---

## بقیہ صفحہ ۱۶۲ — "ایک نئی معنویت"

ہے کہ لکھنے کی زبان بولنے کی زبان سے قریب تر رہے۔ یہ کوشش افسانوں اور ناولوں میں اور کسی حد تک نظموں اور غزلوں میں بھی ہو رہی ہے لیکن ابھی تک ہمارے اخبار اور رسالے اِس طرف غفلت برت رہے ہیں۔ وقت کی خلیج کا پاٹنا اور اور زمانے کی ہوا کا رُخ پہچاننا اچھے صحافیوں کا پہلا مقصد ہونا چاہیئے۔

زمانی اعتبار سے مہاتما گاندھی ابھی ہم سے قریب ہیں لیکن دنیا اِتنی تیزی سے بدل رہی ہے کہ اُن کی تعلیمات کے بہت سے پہلو دُور کے معلوم ہونے لگے ہیں۔ کوئی پیغام اِن معنوں میں آفاقی نہیں ہوتا کہ ہر فردِ بشر پر یکساں منطبق ہو اور اِن معنوں میں دوامی بھی نہیں ہوتا کہ اُس کا ہر جُزو ہر زمانے اور ہر عہد میں بے کم و کاست قابلِ اخذ ہو۔ گاندھی جی اُن فعال شخصیتوں میں تھے جن کے دائرۂ کار میں زندگی کے بہت سے ایسے شعبے بھی آگئے ہیں جن کی طرف عام سیاستدانوں یا روحانی رہنماؤں کی توجہ مبذول نہیں ہوتی۔ انہوں نے بہت سے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اِن سب سے اتفاق کرنا کسی کے لئے بھی ضروری نہیں ہے۔ خود جواہر لال نہرو نے اُن سے کئی باتوں میں اختلاف کیا، لیکن گاندھی جی کی تعلیمات کے بنیادی اُصولوں کو سمجھنا اور اُن کی سائنسی طریقے پر پرکھ ہمارے دانشوروں کا فرض ہے۔ عہدِ حاضر کے ہندوستان کے مسائل و عزائم کو سمجھنے کے لئے بھی گاندھیت کا سمجھنا ضروری ہے۔ اِس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گاندھیت کا کوئی اٹل اور منطق کی حد بندیوں میں گھرا ہوا عقیدہ نہیں، کوئی جامد نظریہ نہیں ہے۔ یہ صرف ایک سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ سمت یقیناً ترقی اور امن کی شاہراہ ہے۔ ▲


منتخبات
گاندھی
درشن

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم



# گاندھی جی

(مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند نے ۳۰ جنوری کو اس پُراثر تقریر سے بچوں کے ایک مجمع کو مخاطب کیا تھا)

دیس کے نونہالو! جانتے ہو کہ آج تم سب کیوں جمع ہوئے ہو؟ آج ایک ایسے دن کی یاد ہمیں یہاں لائی ہے، جس کا خیال کرکے ہم سب ہمیشہ اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں صدیوں تک نہیں، رہتی دنیا تک شرم سے آنکھیں نیچی اور دکھ سے آنکھیں نم کرتی رہیں گی۔ آج ہی کی تاریخ تو تھی، ۲۰ برس پہلے جب ہمارے ہی ایک نادان بدنصیب بھائی نے ایک ایسی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا جس سے ہماری غلامی کے اندھیارے میں آزادی کی روشنی آئی تھی، اُس زندگی کو ختم کر دیا تھا جس سے ہم، ہمارا دیس، ساری دنیا کے بچّے اور اچھے زندگی کی گندگیوں میں نیکی اور سچّائی کو ٹٹولنے کا ڈھنگ سیکھ رہے تھے۔ جس نے بزدلوں کو بہادر سُورما بنا دیا تھا، جس نے نہتوں کو توپ اور مشین گن سے غریب بے سروساماں محکوموں کو ایک مہا سامراج کی طاقت سے ٹکرا دیا تھا، ممولے کو شہباز سے لڑایا تھا اور معرکہ میں محکوموں، غریبوں کو فتحیابی تک پہنچایا تھا۔ ممولے کو شہباز پر جتایا تھا۔

کیسی شاندار موت تھی یہ اُس مردِ خدا کی، اس شہید کی جس نے محبّت اور سیوا سے بھری ہوئی زندگی کو یوں پُورا کیا، جان دے کر اپنی ساری زندگی کی سچّائیوں پر تصدیق کی مُہر لگائی۔ جو اُسے اپنا دشمن بتاتے تھے اُن کو ہلاکت سے بچانے کی خاطر اپنی جان دی اور اپنے خون سے، اپنے محبت بھرے خون سے نفرت اور دیوانگی کی اُس آگ کو بجھایا، جو دیس میں بھڑک اٹھی تھی۔ کوئی کیسے بھولے کہ اس پاک زندگی کو آج کی تاریخ میں ۲۰ برس پہلے ہم نے اپنے ہاتھوں کھویا۔ وہ ہمیں معاف کرچکا ہوگا، اس لئے کہ اس نے کسے معاف نہیں کیا؟ پر آنکھیں تو نیچی رہیں گی اور وہ خود بھی، پیار سے انہیں پونچھے گا تو بھی آنسو تو نہ سُوکھیں گے۔ یہ شرم اور دُکھ تو ہمارے حصّے میں لکھ ہی گیا ہے پر یہ شہید کی موت شرم اور رنج کے ساتھ ساتھ ہماری اکیلی زندگیوں کا سہارا بھی ہے اور ہماری قومی زندگی کا سرمایہ بھی۔ اس شہادت کی یاد سے، اُس شہید کے نام سے، کام سے، جیون کتھا سے، ہمارے دل میں اور رہتی دنیا تک آنے والوں کے دل میں اُمید کا ایک چراغ روشن رہے گا۔ بے لاگ سچائی اور بے غرض سیوا کا ایک لہراتا جھنڈا رہے گا۔ لغزشوں پر گمراہیوں پر ندامت کا ایک کانٹا دل میں کھٹکتا رہے گا۔ جس کی یاد سے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا ملے گا۔ بھٹکتے ہوؤں کو راہ ملے گی جب جی چھوٹیں گے تو اس کی یاد ہمت بندھائے گی۔ جب دل ڈوبیں گے تو یہ طاقت اور توانائی بخشے گی

یہ کون آدمی تھا؟ نرالا انوکھا آدمی۔ پیارے بچو! یہ آدمی آج سے ۷۰، ۷۵ سال پہلے تم ہی جیسا ایک نونہال تھا خاندانی نام گاندھی، باپ کا نام کرم چند، خود بچے کو موہن داس نام دیا گیا۔ موہن داس کرم چند گاندھی پورا نام پڑا۔ پوربندر کی ریاست میں ۱۸۶۹ء میں جنم لیا۔ ایک کم اسّی برس کی عمر پائی۔ تمہاری ہی طرح کا ایک نونہال تھا یہ ایک شرمیلا شرمیلا سا لڑکا، ذرا الگ الگ رہنے والا، نہ کھیل کود میں لڑکوں کے بہت ساتھ نہ ان کی شرارتوں میں۔ ایسا بھی نہ تھا کہ پڑھنے لکھنے میں سب سے آگے ہو اور دیکھو یہ شرمیلا لڑکا کس بلندی پر پہنچا؟ کوئی چیز ایسی نہ تھی اس میں جو دوسرے معمولی لڑکوں میں نہیں پائی جاتی۔ تم سب اس بلندی کو پہنچ سکتے ہو اور یہی اس مہاتما، مہاپُرش کا خاص وصف ہے کہ ایک معمولی لڑکا ہو کر اس نے اپنی سچائی سے، سچائی پر اڑنے کی عادت سے، اپنی محنت سے، جس کام میں ہاتھ ڈالا، اس کا حق ادا کرنے سے یہ درجہ حاصل کیا۔ ادب سے، ہمیشہ اچھائی کی تلاش سے، دوسروں کی نیکیاں اور خوبیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے سے، ان کی کمزوریوں سے درگذر کر کے اپنی کمزوریوں پر کڑی پکڑ کر کے اس نے اپنے جیون کی گود نیکیوں سے مالامال کر لی۔ اپنی کمیوں کو ایک ایک کر کے چھانٹ ڈالا اور اپنے کو اس اونچے مرتبے پر پہنچا دیا۔ اس کی بڑائی کچھ پیدائش کے اتفاق پر ذرہ بھر نہ تھی۔ قدرت کی بے حساب دین نہ تھی۔ یہ ایک ہمت والے محنتی آدمی کی عمر بھر کی کوشش کا نتیجہ تھی، اپنے ہاتھوں اپنی تعلیم کا پھل تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی کچی دھات کو محبت کی بھٹی میں تپا تپا کر، سچائی کے ٹھنڈے پانی میں بجھا بجھا کر اور بےغرض سیوا اور محنت کے ہتھوڑے سے پیٹ پیٹ کے ایک ایسی کھری، ایسی پکی، ایسی وزن دار، ایسی حسین، ایسی دمکتی زندگی بنائی تھی۔ جو صدیوں میں کسی کو نصیب ہوتی ہے مگر جس کی ریس کا حوصلہ ہر سچا اور نیک اور محنتی آدمی کر سکتا ہے۔ پیارے بچو! تمہاری سب کی زندگیاں تمہارے سامنے ہیں۔ انہیں بنانے کی ذمہ داری تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔ زندگی کی کچی دھات تمہارے ہاتھ میں ہے۔ فیصلہ کرو کہ اس کا کیا بناؤ گے۔ زندگی کے اس بڑے کاریگر کی جیون کہانی پڑھو اور سمجھو۔ اس کا انمول ہنر سیکھو اور اپنی زندگیاں بناؤ۔

زندگی بنانے کے اس گمبھیر کام میں گاندھی جی کے جیون سے بہت کچھ سبق ملتے ہیں، انہیں سیکھو۔ یہ وقت بات بڑھانے کا نہیں ہے۔ پر دو ایک باتیں کہنے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی بنانے میں سب سے پہلے ارادے کی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گاندھی جی کے جیون سے سبق ملتا ہے کہ ارادے کو آزاد ہونا چاہیئے۔ آدمی ارادہ یہ کرے۔ یہ نہ ہو کہ دوسرے کر کر کے اس کے سر تھوپ دیں۔ گاندھی جی ارادہ کرنے میں دوسروں کا منہ نہیں تکتے تھے۔ خود سوچتے تھے، فیصلہ کرتے تھے اور اس کا پورا بوجھ اپنے اوپر رکھتے تھے۔ وہ جلد فیصلہ کر سکتے تھے۔ اگر مگر میں فیصلے کو ٹالنے والا ارادہ نہیں کر پاتا اور زندگی نہیں بنا پاتا۔ گاندھی جی کا ارادہ مضبوط ہوتا تھا جب کر لیتے تھے تو نہ ان کے اندر سے کوئی چیز اسے آسانی سے ہلا پاتی تھی، نہ باہر سے۔ گاندھی جی اپنے ارادے پر جمتے تھے اور مدّت تک جم سکتے تھے اس لئے کہ ہر ارادے کے پورا ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی طرح نہ تھے جو کسی کام کو بڑے زور سے اور اس سے زیادہ شور سے اٹھاتے ہیں اور چند دن ہی میں کڑھی کا یہ اُبال ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ نہیں جانتے، گاندھی جی جانتے تھے کہ کسی بڑے کام کی سرسوں ہتھیلی پر نہیں جمتی۔

دوسری چیز جو مجھے گاندھی جی کے جیون میں دکھائی دیتی ہے وہ ان کی ٹھیک سوجھ بوجھ ہے ان کی چترائی ہے۔ زندگی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ٹھیک سوچ سکے، سمجھ سکے۔ زندگی کے سفر میں یہ سوجھ بوجھ

راستہ کا اونچ نیچ بتاتی ہے، نظر کو دور تک لے جاتی ہے اور آدمی اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر نہیں چلتا۔ ٹھیک سوجھ بوجھ کی عادت ڈالنے سے پڑتی ہے، اپنے آپ نہیں پڑجاتی۔ طرح طرح کی چیزیں اس میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ کہیں خود غرضی فریب دیتی ہے۔ کہیں غصّہ کا طوفان دھیان کو ادھر سے اُدھر کر دیتا ہے۔ کہیں لالچ دھکے دیتا ہے کہیں جلد بازی قدم کو پھسلاتی ہے، کہیں تعصب اندھا کرتا ہے۔ نجات کے سستے نسخے بیچنے والے، وقت کی سہانی راگنیاں گانے والے بہکاتے ہیں، ضدیں اور ہٹ دھرمیاں ٹھوکریں کھلاتی ہیں۔ گاندھی جی نے اپنے جیون میں ان رکاوٹوں سے بچنے اور صحیح سوجھ بوجھ کی عادت کی مشق کے بے شمار سبق دیئے ہیں۔

زندگی کے بنانے میں ایک اور چیز جو بہت کام آتی ہے، وہ آدمیوں کی پہچان ہے۔ یہ خاص سمجھ ہوتی ہے جس سے آدمی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کے دل میں پہنچ گیا، دوسروں کو جھٹ بھانپ لیتا ہے۔ ان کی بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اُن سے ہمدردی کر سکتا ہے، اُن کو سمجھ سکتا ہے۔ لکھے پڑھے لوگوں میں یہ صفت بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ کتاب کے کیڑے اصلی آدمیوں کی دنیا سے اتنے الگ رہتے ہیں کہ اس کو برتنے کے قابل نہیں رہتے۔ جن کا دھیان اپنی غرض پر جما ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سے محروم ہوتے ہیں۔ گاندھی جی نے زندگی کی ریل پیل میں، سچے میل ملاپ سے، بے غرض سیوا سے یہ ہنر حاصل کیا تھا۔ تمہارے لئے بھی اس کے حاصل کرنے کا یہی راستہ ہے۔

زندگی کے بنانے میں ایک چیز اور بڑی کار آمد ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آس پاس کے واقعات سے آدمی کے دل میں جو اثر ہوتا ہے وہ کس قسم کا ہوتا ہے۔ ٹھہرتا ہے یا بہہ جاتا ہے۔ پھیلتا ہے یا مرجھا کر ختم ہو جاتا ہے۔ گاندھی جی جس چیز کا اثر لیتے تھے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی تھی۔ عمر بھر کے کام کا سامان بن جاتی ہے۔ ہم وطنوں کی بے بسی کا تجربہ جو دکھنی افریقہ میں ہوا، اس کی تان دیکھو کتنے عرصے بعد آکر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں ٹوٹی اور ساری عمر اسی ایک غم کے دور کرنے کی تدبیروں میں بیت گئی۔ اپنی جذباتی زندگی میں یہ گہرائی اور ٹھہراؤ بھی ہمیں گاندھی جی سے سیکھنا چاہیے۔

بچو! گاندھی جی کو اپنے دیس کے سب بچوں سے یہ امید تھی کہ وہ اپنا جیون اچھا بنائیں گے اور تم جانتے ہو کہ وہ آسانی سے مایوس نہیں ہوتے تھے۔ سچ کے سیوک بڑا مشکل ہی سے مایوس ہوتے ہیں۔ تمہارے سامنے ان کی ایک تصویر ہے جس میں وہ کہہ رہے ہیں کہ "میری کون سنے گا؟" بچو! یہ مایوسی کا سوال نہیں ہے۔ یہ اُن کی للکار ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ تم میں کون ہے جو میری سنے؟ یہ ہم سے تم سے اُن کا سوال ہے، اپنے نا تمام کام کے متعلق اُن کا سوال ہے۔ اُن کا کام ایسا بڑا کام تھا، ایسا ہمیشہ چلنے والا کام تھا کہ اس کا پورا کرنا اُن جیسے بڑے آدمی کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ اچھے آدمی بننا اور اچھا سماج بنانا، اچھے آدمیوں کو اچھے سماج کی سیوا میں لگانا، اچھے سماج کو سارے سنسار کی سیوا میں لگانا، یہ کچھ ایک دو کی زندگیوں میں پورا ہونے والا کام نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ کہ کبھی بھی ختم ہونے والا کام نہیں ہے۔ یہ تو برابر کئے جانے اور برابر ہوتے جانے والا کام ہے۔ ہمیں اس کام کے کرنے کا موقع دینے کے لئے گاندھی جی نے ہمارے دیس کی آزادی چاہی تھی۔ آزادی ہوتی ہے بندھنوں سے، بیڑیوں سے، پابندیوں سے۔ مگر بندھن ٹوٹ جائیں، بیڑیاں کٹ جائیں، پابندیاں ہٹ جائیں مگر یہ پتہ نہ ہو کہ جانا کدھر ہے یا پتہ ہو تو سستی اور کاہلی قدم نہ اٹھانے دیں کہ ہم تو آزاد ہیں، جب چاہیں چل

کھڑے ہوں گے تو یہ آزادی اکارت ہے۔ آزادی ہوتی ہے کسی کام کے لئے، کسی مقصد کے لئے۔ گاندھی جی نے ہمیں آزادی کس لئے دلائی تھی؟ اس لئے کہ ہمارا ارادہ آزاد ہو، ہم جو بن سکتے ہیں وہ بنیں۔ اچھے آدمی بن سکیں، اچھا سماج بنا سکیں۔ اچھا آدمی بننے اور اچھا سماج بنانے کے جو راستہ انہوں نے بتایا ہے وہ میں سمجھتا ہوں تین لفظوں میں بیان ہو سکتا ہے: اہنسا، وگیان اور کام۔

ہمارے غلامی سے بگڑے ہوئے اور کھوکھلے لفظوں میں الجھاؤں میں پھنسے ہوئے دماغ نے اہنسا کو بھی ایک معمہ بنا دیا ہے۔ اہنسا کے اہم مسئلے یہ نہیں ہیں کہ ملیریا کے مچھروں کو مارا جائے یا نہ مارا جائے یا جب کوئی تمہارے بھائی کو تمہارے سامنے ذبح کرے تو تم اُسے روکو یا نہ روکو۔ جو لوگ ہر بڑے سے بڑے میدان میں بھی حاشیے ہی پر رہنا پسند کرتے ہیں، انہیں یہ سوال مبارک ہوں۔ اہنسا کا راستہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں محبت کا راستہ ہے، رواداری کا راستہ ہے، آدمیت کے احترام کا راستہ ہے، آدمی کو آدمی کے ظلم سے بچانے کا راستہ ہے، امداد باہمی کا راستہ ہے، سماجی ناانصافیوں کو ہٹانے کا راستہ ہے، سمجھ کا راستہ ہے، سیوا کا راستہ ہے، دلوں کی صفائی کا راستہ ہے، بھائی کو بھائی سے ملانے کا راستہ ہے، دشمن کو دوست بنانے کا راستہ ہے، سچ پر بھروسے کا راستہ ہے، امن کا، صلح و آشتی کا راستہ ہے۔

بچو! تمہیں اس راستے پر چل کر ایک نیا دیس، ایک نیا سماج بنانا ہے۔ جب تک اس دیس میں آدمی آدمی ظلم کرتا ہے، جب تک اس دیس میں بسنے والے ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے، جب تک یہاں کے بسنے والے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اپنے کو بھائی بھائی نہیں جانتے اور نہیں مانتے، جب تک یہاں کا امیر غریب کو اور طاقت ور کمزور کو ابھرنے نہیں دیتا، جب تک یہاں کسی کی محنت مشقت سے کوئی دوسرا بے جا لابھ اٹھاتا ہے، اُس وقت تک یہ دیس گاندھی جی کے وچاروں کا دیس نہیں ہے۔ ان کا کام باقی ہے اور تمہیں پورا کرنا ہے۔ اس کو پورا کرنے کے لئے تمہیں آزادی ملی ہے۔

پھر دوسرا راستہ وگیان کا ہے۔ گاندھی جی کا سچ پر اڑنا، سماجی اخلاقی معاملوں میں بھی تھا اور قدرت سے فائدہ اٹھانے کے معاملے میں بھی، دونوں میدانوں میں سچ کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے۔ ایک جگہ اخلاق کا راستہ ہے، دوسری جگہ سائنس کا راستہ ہے۔ جب تک ہمارے دیس میں کروڑوں آدمیوں کو جیتے جی پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔ جب تک کروڑوں آدمیوں کو دکھ درد میں دوا نصیب نہیں ہوتی، جب تک ہمارے دیس میں آدمی کی جان مکھی اور کھٹمل کی طرح سستی ہے، جب تک ہمارے دیس میں کروڑوں آدمی ان پڑھ ہیں اور کروڑوں بچوں کو مدرسے میں جانا نصیب نہیں ہوتا اس وقت تک انگریز راج سے آزاد ہو جانا کافی نہیں۔ بچو! تم اس دیس کے پہاڑ کاٹو گے، سمندر پاٹو گے، اس کے دریاؤں کو موڑو گے، اس کے ریگستانوں کو گلزار بناؤ گے، اس کے پیٹ میں جو دولت بھری پڑی ہے اُسے نکال کر اس کے باسیوں میں بانٹو گے، جب یہاں سے جہالت کو ختم کر دو گے، غریبی کو مٹا دو گے، بیماری کو دور کر دو گے، سب کے لئے امن چین سے رہنے کا سامان کر دو گے اور ایک کو دوسرے پر شیر نہ ہونے دو گے، تب یہ دیس گاندھی جی کی آرزوؤں کو پورا کرنے والا دیس ہوگا۔

مگر بچو، اہنسا اور وگیان خالی خیالی باتیں بھی ہو سکتی ہیں، کتابی چیزیں بھی ہو سکتی ہیں اور بہتوں کے لئے ہیں۔ گاندھی جی کا اہنسا اور گاندھی جی کا وگیان خیالی اور کتابی نہ تھا۔ (ماہنامہ آجکل دہلی)

آسیہ فیضی



# گاندھی جی اور اقلیتیں

گاندھی جی کا جنم ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ انہوں نے ہندوستان اور انگلستان میں تعلیم پائی۔ محبت، صداقت اور عدم تشدد کے اصولوں کا پرچار کیا۔ عدم تعاون کا بے مثل ہتھیار وضع کیا اور ہندوستان سے دنیا کی ایک بہت بڑی اور انتہائی طاقتور حکومت کا خاتمہ عدم تشدد کے ہتھیار ہی سے کیا اور ۷۹ برس کی عمر میں جب اُن کا کام مکمل ہوا اور ہمارا ہندوستان آزاد ہوا تو ایک ہندوستانی نے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو اُن کا کام تمام کر دیا اور اس طرح دنیا کی ایک عظیم ہستی ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئی۔

"اُن کی زندگی حلم و خاکساری کا نمونہ تھی۔ اُن کی ذات میں اوصافِ حسنہ اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ قدرت خود کھڑی ہو کے بے اختیار کہہ اٹھی کہ انسان یہی تھا۔" (جولیس سیزر)

ایک اعلیٰ و مکمل انسان کی زندگی کا یہ انتہائی مناسب انجام تھا۔ نجات دہندہ نے ہندوستان کے گناہوں کے لیے اپنی جان دے دی تھی۔ اس لئے کہ "خدا اپنے خادموں کی رُوح کو نجات دیتا ہے اور اس میں یقین رکھنے والوں میں کوئی بھی اکیلا و واماندہ نہیں ہوگا۔" (سام ۳۴۔ ۲۲)۔ اور جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے۔ "اللہ تعالیٰ کی راہ میں جانیں قربان کرنے والوں کو مرے ہوؤں میں شمار نہ کرو۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور میں زندہ ہیں اور اُسی سے روزی پاتے ہیں۔" (۱۱۔ ۶۴)۔ اُن کی موت مسلمانوں کے لئے خاص طور سے اہمیت رکھتی ہے کیونکہ گاندھی جی نے انہیں کے لئے اپنی جان قربان کی۔

گاندھی جی اپنے بارے میں کہتے ہیں۔ "جن مذہبی آدمیوں سے میری ملاقات ہوئی ہے، اُن میں سے بیشتر بھیس بدلے ہوئے (یا اندر سے) سیاست دان تھے اور میں جو بظاہر ایک سیاست دان کے بھیس میں ہوں دل سے مذہبی انسان ہوں۔" (مائنڈ آف مہاتما گاندھی۔ سرورق)

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے گاندھی جی کے کردار کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"شاذ و نادر ہی کوئی ایسی ہستی عام سطح سے اوپر اٹھتی ہے جو پرماتما کے بارے میں اتنی گہرائی کے ساتھ سوچ بچار کر کے اس کے اعلیٰ مقصد کو سمجھتی اور ایزدی ہدایت پر بڑی جرأت سے عمل کرتی ہے۔ اس کے وجود کی مثال روشنی کے مینار کی سی ہے جو تاریک اور انتشار کی شکار دنیا میں

مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ گاندھی جی کا تعلق پیغمبروں کی اُس نسل سے ہے جو دل سے بلند حوصلہ تھی، جن کی رُوح مجسم اخلاق تھی اور جو منڈلا کر قہقہہ لگا سکتی تھی۔ اپنی زندگی اور تعلیمات میں وہ اُن اقدار کے شاہد و امین رہے جو صدیوں سے اِس ملک کا خاصّہ اور حصّہ ہیں۔ یہ اقدار ہیں ــــ رُوح میں اعتقاد، اُس کے اسراروں کا احترام، تقدّس حُسن، فرائض کی قبولیت، کردار کی راستی ــــ اور یہ قدریں قومی ہیں اور نہ بین الاقوامی بلکہ آفاقی ہیں۔" (ایضاً۔ پیش لفظ)

گاندھی جی عدم تشدّد میں گہرا عقیدہ رکھتے تھے۔ اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

"عدم تشدّد میرے عقیدے کی پہلی شرط ہے اور یہ میرے مسلک کی آخری شرط بھی ہے۔"

"میری عوامی زندگی میں ایسے متعدد مواقع پیش آئے جب میں جوابی کارروائی کر سکتا تھا، لیکن میں نے اُس سے احتراز کیا اور اپنے دوستوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اپنی زندگی کو اس اصول کی تبلیغ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اِس اصول کا درس میں نے دنیا کے سبھی عظیم مبلّغوں ــــ زرتشت، مہاویر، ڈینیل، عیسیٰ، محمدؐ، گورو نانک اور متعدد دوسرے مبلّغوں کی تعلیمات سے لیا ہے۔"

یہاں یہ امر لائقِ ذکر ہے کہ حال میں مارٹن لوتھر کنگ نے امریکہ میں انہیں اصولوں کے لئے شہادت پائی۔ مارٹن لوتھر کنگ اپنے آپ کو گاندھی کا پیروکار کہا کرتے تھے اور مسلمانوں کے لئے یہ امر غور طلب ہے کہ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان عدم تشدّد میں گہرا یقین رکھتے ہیں۔ اگر اسلام کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کا مسلک تشدّد کا مسلک نہیں۔ بلکہ یہ ممکن حد تک عدم تشدّد کی تعلیم دیتا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا ہے کہ آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے دشمن کو ستّر بار معاف کر دیں اور جب کوئی چارہ کار نہ رہے تو مجبوراً اپنے دفاع میں معمولی طاقت سے کام لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ اِس بات کی وضاحت ہندوستان میں قرآنِ کریم کے سب سے بڑے مفسّر مولانا ابوالکلام آزاد نے بخوبی کی ہے۔

گاندھی جی کہتے ہیں ــــ "عدم تشدّد ایک بہت بڑی قوت ہے جس سے بنی نوعِ انسان کام لے سکتا ہے۔ انسان نے اپنی طباعی سے کام لے کر تباہی و بربادی کا جو سب سے زیادہ طاقت ور ہتھیار بنایا ہے، یہ اُس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔ تباہی قانونِ انسانی نہیں۔ انسان آزادانہ طور پر زندگی بسر کرتا ہے اور ضرورت ہو تو اپنے بھائی کے ہاتھوں مرنے کے لئے تیار رہتا ہے، اُسے مارنے کے لئے نہیں۔ ہر قتل جو کیا جاتا ہے۔ ہر زخم جو لگایا جاتا ہے، خواہ اُس کی وجہ کچھ بھی ہو، انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے۔"

گاندھی جی کی تعلیم کا ایک بنیادی اصول تمام مذاہب کا یکساں احترام تھا۔ آج مارکسی عقیدے کے حامیوں، اِس عقیدے سے انکار کرنے والوں، ہندوؤں اور مسلمانوں، اچھوتوں اور غیر اچھوتوں اور حد تو یہ ہے کہ سنّیوں اور شیعوں میں مذہبی کشمکش کا چرچا عام ہے۔ ایسے حالات میں ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم اپنی توجہ کا مرکز گاندھی کے مذہب کو بنائیں۔ وہ تمام مذاہب کو مساوی سمجھتے تھے۔ گورو نانک کے بیش بہا لفظوں میں "نہ کو مسلمان ہے نہ کو ہندو ہے"۔ ہندو مت، عیسائیت اور اسلام کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات کیا اور کیسے ہیں؟ یہ میں آپ کو بتاؤں گا۔ میری ناچیز رائے میں وہ بہت سے ہندوؤں سے بہتر ہندو، بہت سے عیسائیوں سے بہتر عیسائی اور بہت سے مسلمانوں سے بہتر مسلمان تھے۔ فی الواقع وہ سچّے شہید تھے۔ انہوں نے بالخصوص مسلمانوں کے لئے اپنی جان قربان کی۔ اِس سلسلے میں گاندھی جی نے خود یہ کہا ہے: "ہندو مت کوئی جداگانہ مذہب نہیں ہے۔

ہندو مت ہر کسی کو اپنے عقیدے کے مطابق خدا کی عبادت اور دوسرے تمام مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ پُرامن طریقے پر رہنے کی تلقین کرتا ہے۔"

-۹ "ہندو مت کا بنیادی عقیدہ ہے کہ کُل کائنات کا ایک آفاقی سرچشمہ ہے۔ آپ اُسے اللہ، خدا یا پرمیشور بھی کہہ سکتے ہیں۔"

میرا عقیدہ ہندو مت فرقہ پرستی پر مبنی نہیں۔ میرے علم کے مطابق اس میں اسلام، بُدھ مت، عیسائیت اور زرتشتیت کے تمام اوصاف، شامل ہیں۔ ستیہ (سچائی) میرا مذہب ہے اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ اہنسا ہے۔ تشدد کے عقیدے کو میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسترد کر دیا ہے۔"

"میں ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے ایک سی محبت رکھتا ہوں۔ میرے دل میں جتنی ہمدردی ہندو کے لئے ہے اتنی ہی مسلمان کے لئے بھی ہے۔ اگر میں اپنا سینہ چاک کر کے دکھا سکتا تو آپ دیکھتے کہ میرے دل میں کوئی خانے نہیں بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔" اس امر کے پیشِ نظر کہ ہندو مت کے بیشتر فرقے خدائے واحد میں یقین رکھتے ہیں اور ہندوستان میں رام، کرشن اور بُدھ جیسے پیغمبر پیدا ہوئے ہیں۔ ایک مسلمان رہنما ہمایوں کبیر (مرحوم) ہندوؤں کو "اہلِ کتاب" میں شمار کرتے ہیں۔ مسلم پولٹیکس کلکتہ۔ مکھوپادھیائے۔ ۱۹۶۹ء صفحات ۱۳۱-۳۳)

عیسائیت اور حضرت عیسٰیؑ کے لئے گاندھی جی کے دل میں خاص جگہ تھی۔ لوئی فشر نے ایک بڑا خوبصورت واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ بات ۱۹۴۲ء کی ہے۔ میں ہفتے بھر کے لئے گاندھی جی کا مہمان تھا۔ گاندھی جی کی کچی مٹی کی دیواروں والی جھونپڑی میں آرائش کی فقط ایک شے تھی اور وہ حضرت عیسٰیؑ کی ایک تصویر تھی جس کے نیچے لکھا تھا "وہ ہمارا امن ہے"۔ میں نے اس کے بارے میں گاندھی جی سے پوچھا۔ بولے "میں عیسائی ہوں اور ایک ہندو اور مسلمان اور ایک یہودی بھی ہوں"۔ (لائف صفحہ ۳۶)

وہ کہتے ہیں۔ میری رائے میں آج یورپ خدا یا عیسائیت کی روح کا نہیں، شیطان کی روح کا مظہر ہے۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں دولت کے بُت کی پرستش ہوتی ہے۔ یہاں اونٹ کے لئے سوئی کے ناکے سے گذرنا آسان ہے لیکن ایک امیر آدمی کے لئے حکومتِ الٰہی میں بار پانا مشکل ہے۔ حضرت یسوع مسیح نے ایسا ہی کہا تھا۔۔۔"

"میں الوہیت یا تقدس کو صرف حضرت عیسٰی کی ذات سے منسوب نہیں کر سکتا۔ وہ اتنے ہی مقدس ہیں جتنے کہ کرشن، یا رام یا محمدؐ یا زرتشت ہیں۔۔۔ میرے نزدیک بائبل اتنی ہی مقدس کتاب ہے جتنی مقدس گیتا اور قرآن ہیں۔"

(مائنڈ آف مہاتما۔ ۳-۹۲)

"میں اسلام کو اُسی طرح امن کا مذہب سمجھتا ہوں جس طرح کہ عیسائیت، بُدھ مت اور ہندو مت کو مانتا ہوں۔۔۔ میں اپنی اس رائے کا اظہار کر چکا ہوں کہ اسلام کے پیروکار تلوار کے استعمال میں ذرا زیادہ آزاد رہے لیکن یہ قرآن کی تعلیم کا نتیجہ نہیں۔ یہ نتیجہ ہے اُس ماحول کا جس میں اسلام نے جنم لیا تھا۔ قرآن نے بہ زورِ شمشیر اسلام کی توسیع کی تعلیم کبھی نہیں دی۔ مقدس کتاب میں یہ بات صاف صاف لفظوں میں درج ہے۔ مذہب میں کسی جبر کی گنجائش نہیں" (لا اکراہ فی الدین) اور حضرت محمدؐ کی ساری زندگی مذہبی معاملوں میں جبر کی نفی کرتی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے کسی مسلمان نے جبر و زبردستی کو پسند نہیں کیا ہے۔ اگر اسلام نے توسیع و تبلیغ کے لئے طاقت پر تکیہ کیا ہوتا تو ظاہر ہے کہ یہ ایک عالمی مذہب نہ بن پاتا۔"

ہندوستان کی قومی تہذیب کو اسلام کی ممتاز دین خدا کی وحدت کا تصور ہے یعنی اُس کی ذات میں کوئی شریک

نہیں ہے اور یہ کہ سارے انسان برابر اور بھائی بھائی ہیں۔ اسلام نے اِس کا عملی مظاہرہ کیا۔۔۔ میرے نزدیک یہ دونوں باتیں اسلام کا ممتاز ترین عطیہ ہیں۔

یہ نظریہ ہندوستان میں اسلام کے بڑے بڑے شارحین بشمول مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے اور یہی نظریہ مغرب کے اُن تمام لوگوں کا ہے جنہوں نے سائنسی بنیادوں پر اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ گاندھی جی دن کا آغاز متعدد مقدس صحیفوں کے پاٹھ سے کیا کرتے تھے۔ اِس سے اُن کی مُراد اپنے پیروکاروں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ تمام مذاہب کو ایک جیسا مقدس اور ایک سا سچا سمجھتے اور مانتے ہیں اور یہی درس ہے جو وہ آج ہمیں دیتے ہیں۔ اگر ہم اِس پر عمل کر سکیں اور اُسے محض موضوعِ سخن نہ بنائیں۔

گاندھی جی بڑی نیک نیتی اور ایمانداری کے ساتھ ہندو مُسلم اتّحاد کے حامی تھے۔ اُن کی ساری زندگی اِس مقصد کے لئے وقف رہی اور پھر موت بھی اس مقصد کی تکمیل کرتے ہوئے پائی۔

مسٹر جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کا مطالبہ تقسیم زور پکڑتا جا رہا تھا۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء سے ۲۷ ستمبر ۱۹۴۴ء تک مُسلسل ۱۹ دن گاندھی جی مسٹر جناح کے مکان پر جاتے رہے اور ملکی مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ یہ اقدام اُن کی اِنکساری اور خلوصِ نیّت کی ایک روشن مثال ہے۔ انجام کار دونوں میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ بات چیت بند ہو گئی اور ان کے خطوط شائع کر دیئے گئے۔ یہ مُراسلت حالیہ برسوں کی نہایت اہم سیاسی دستاویزوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِن دونوں کی شخصیت میں کتنا فرق تھا۔ جناح ایک عظیم مُدبّر اور بہت بڑے وکیل تھے لیکن بدقسمتی سے اُنہیں ایک ایسے شخص سے واسطہ پڑا تھا جو ایسے ہتھیار استعمال کرتا تھا جو نہ عدالتوں میں استعمال ہوتے تھے نہ جنگ کے میدانوں میں۔ بظاہر مسٹر جناح کی جیت ہوئی لیکن اُن کی یہ جیت ہندوستان کی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

آزادی ملی مگر اس کی قیمت ملک کی تقسیم کی صورت میں چُکانی پڑی۔ ہند و پاکستان میں ہندو مُسلم فسادات بھڑک اُٹھے۔ ہزاروں مارے گئے، جائداد تباہ ہوئی اور عورتوں کی عصمت دری گئی۔ ہندوستان میں ایک فرد تھا جو ایک اور غیر منقسم ہندوستان کا حامی تھا۔ جو سیکولر اور جمہوری نظام چاہتا تھا۔ جو محبّت، عفو اور درگزر اور بدلہ نہ لینے کا سبق پڑھاتا تھا۔ وہ گاندھی تھا۔ لیکن جنونی فرقہ پرستوں کے ایک طبقے کے لئے یہ باتیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو برلا ہاؤس میں شام کے ۵ بجے پونا کے ایک ہندو نے اُنہیں اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس طرح اس عظیم انسان کی زندگی کا خاتمہ ہوا جو ہندوستان نے گذشتہ ایک ہزار برس میں پیدا کیا تھا۔

پیار، عفو اور درگزر سے متعلق اُن کے خیالات سُنیئے:

میں نے تلوار ایک طرف پھینک دی ہے اور صرف میرے پاس محبّت سے بھرا ہوا ایک پیالہ ہے جو میں اپنے مخالفوں کو پیش کر سکتا ہوں۔ عفو اور درگذر رُوح کی خاصیت ہے اور اِس لئے ایک مُثبت صفت ہے۔ یہ کوئی منفی رویہ نہیں ہے۔ بُدھ نے کہا تھا۔ غصّے پر غصّہ نہ کر کے قابو پاؤ۔ غصّہ نہ کرنا کیا ہے، یہ ایک مُثبت صفت ہے اور محبّت جیسی عظیم خوبیوں کی مظہر ہے۔ محبّت کا یہ جذبہ مسلسل کوشش کے ذریعے پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اپنی سیاسی زندگی کی ابتداء ہی سے گاندھی جی ہریجنوں کی حالت زار سے بے حد متاثر تھے۔ اُنہوں نے ایک ہریجن لڑکے کے ساتھ دوستی کی جس کے ساتھ وہ کھیلا کرتے تھے۔ اُن کی بیوی کستوربا نے بھی اِس دوستی کو پسند کیا۔ بعد میں

شاہد بمبئی

انہوں نے لکشمی نامی ایک ہریجن لڑکی کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ لوئی فشر کے الفاظ میں اُن کا یہ فعل اِس طرح کا تھا جیسے کوئی امریکی خانہ جنگی سے پہلے کے زمانے میں جنوبی حصے کی کسی خاتون کے محل میں ایک نیگرو رہنے آ گئے۔

اچھوتوں، پس ماندہ ذاتوں اور دبے کچلے لوگوں کو انہوں نے ہریجن ـــ خدا کے بچے کہا۔ اچھوتوں کے جداگانہ طرز انتخاب کے سوال پر انہوں نے ۱۹۳۲ء میں برت رکھا جس کی وجہ سے اُن جگہوں کی تخصیص ہو گئی مگر وہ جداگانہ انتخاب کی مضرت رسانیوں سے بچ گئے۔ یہ اُن کی تعلیمات اور ذاتی مثال کا بھی نتیجہ تھا کہ ہریجنوں کو مندروں میں داخلے کا دستوری حق ملا۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے ہریجنوں کی خدمت کے لئے ہریجن سیوک سنگھ قائم کیا۔ غرضیکہ مہاتما گاندھی کی طرح کا دوسرا کوئی شخص نہیں تھا جس نے اچھوتوں کے حقوق کے لئے اتنا کچھ کیا ہو۔

تقسیم ملک کے بعد گاندھی جی کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے متضاد خیالات سننے میں آتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ مسلم اقلیت کے زبردست حامیوں اور مخلص دوستوں میں تھے۔ مذہبی معاملوں میں اُن کے خیالات نانک اور کبیر کی طرح کسی مخصوص عقیدے تک محدود نہ تھے اور مذہب کی ظاہری شکلیں اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ اُن کے معمولات ہر روز صبح تین چار مذہبی کتابوں کی تلاوت سے شروع ہوتے تھے۔ دراصل وہ سارے مذاہب میں یقین رکھتے تھے۔

بہت سے مسلمانوں سے اُن کے ذاتی تعلقات تھے۔ جس شخص نے پہلے پہل انہیں افریقہ میں کام دیا وہ مسلمان تھا۔ طیب جی خاندان سے اُن کے خاص تعلقات تھے۔ میرے خالو عباس طیب جی ان کے گہرے دوست تھے۔ بار دولی ستیہ گرہ کے زمانے میں وہ پہلے شخص تھے جنہیں لیڈر نامزد کیا گیا تھا۔

فشر اور اُن کے دوسرے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مہاتما گاندھی کو یقین تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سوراج ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان کے اتحاد کے لئے وہ عمر بھر کام کرتے رہے۔ اُن سے ایک دو غلطیاں سرزد ہوئیں مگر اِس کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ تمام سمجھ دار مسلمانوں کی رائے میں وہ مسلمانوں کے گہرے دوست اور مددگار تھے۔ ملک کے بہت سے مسلمانوں نے اُن کے ساتھ اور اُن کی رہنمائی میں ملک کی آزادی کے لئے سختیاں جھیلیں۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے سرحد کے پٹھانوں کو منظم کیا۔ اِس تنظیم کے کارکن خدائی خدمت گار کہے جاتے تھے۔ اُن کی ہمت اور عدم تشدد پر مکمل اعتماد کے واقعے میری نوجوانی کے زمانے میں بڑے مشہور تھے۔ مسلم خاتون امتہ الاسلام اور عباس طیب جی کی طرح کے بہت سے سیاسی کارکنوں کو اُن سے تحریک ملی تھی۔

اُن کی زندگی رواداری، وسیع المشربی اور انسان دوستی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی مشترک زبان کی حیثیت سے ہندوستانی کو جو ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے، اپنانے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے ملک کو فرقہ وارانہ تشدد اور خون خرابی سے بچانے کیلئے مرن برت رکھا۔ پاکستان سے خوشگوار تعلقات نہ ہونے کے باوجود انہوں نے حکومت ہند پر دباؤ ڈالا کہ پاکستان کو وہ روپیہ ادا کر دیا جائے جو ایک معاہدے کے ذریعے ... طے ہو گیا تھا۔ غرضیکہ ایسی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے جن سے مہاتما گاندھی کی روشن خیالی کا پورا پورا اظہار نہ ہوتا ہو۔

ہمارے خوابوں کے ہندوستان کی ترقی اہنسا، سچائی اور نظم و ضبط کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ میرا پیغام ہے، جو آپ تک پہنچایا جا رہا ہے اور جو میں نے گاندھی جی سے سیکھا ہے۔ ▲

(انگریزی سے ترجمہ) آجکل دہلی۔

خواجہ غلام السیدین



# تقدیس کی راہ

مجھے گاندھی جی سے کئی مرتبہ ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے؛ عام طور پر کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں اور کبھی کبھی درشنوں کے لئے۔ بھارت میں ہزاروں ایسے افراد ہیں جنہوں نے گاندھی جی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور جنہیں ان کے ہمراہ کام کرنے کا اکثر موقع ملا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ گاندھی جی کے بارے میں زیادہ مستند اور معتمد طور پر کچھ لکھ سکتے ہیں۔ اس لئے میں ایک ایسے شخص کے بارے میں صرف ایک ذاتی تاثر ہی پیش کروں گا جس کے لئے آئن اسٹائن نے کہا تھا کہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں اس بات پر کم ہی یقین کریں گی کہ ہمارے دورِ حیات میں ایک ایسا عظیم انسان اس دھرتی پر موجود تھا۔

گاندھی جی کی سب سے بڑی صفت جس نے مجھے بے حد متاثر کیا، وہ اُن کی انسانیت تھی۔ گاندھی جی یا تو ملک کے بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے میں مصروف رہے یا پھر طہارتِ نفس میں مشغول رہتے تھے جب کہ اُن کے جیسے درجے کا رہنما جو ایک سنت کا رُتبہ بھی رکھتا تھا، تمام دنیاوی جھنجھٹوں سے الگ رہ سکتا تھا۔ گاندھی جی کی عظمت میں پیغمبروں جیسی وُسعت تھی۔ اُنہوں نے ہمیشہ عوام سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ گاندھی جی کی طاقت کی بُنیاد عام مردوں اور عورتوں پر تھی۔ وہ اُن کی ضروریات سے واقف تھے۔ اُنہیں اُن کی آرزوؤں اور تکالیف کا ذاتی تجربہ تھا۔ اُن سے کوئی بھی شخص آسانی کے ساتھ ہر وقت مل سکتا تھا۔ اُن کی زندگی کوئی پوشیدہ چیز نہ تھی اور وہ کسی بھی شخص سے حیرت ناک بے باکی کے ساتھ مل سکتے تھے۔ چاہے وہ قطعی اجنبی شخص کیوں نہ ہو۔ اُن میں کچھ ایسا جادو تھا کہ اجنبی بھی پہلی ملاقات میں اُن سے کھل کر بات چیت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی شخصیت میں ایک اور صفت بھی تھی اور وہ تھا حقیقی مزاح کا احساس۔ وہ خود اپنے اُوپر بھی ہنس سکتے تھے۔

## پہلی ملاقات:

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اُن سے پہلی بار ۱۹۳۷ء میں بُنیادی تعلیمی کمیٹی کے ایک ممبر کی حیثیت سے ملا تھا۔ گاندھی جی جیسی عظیم شخصیت سے پہلی مرتبہ ملتے ہوئے مجھے خوف اور جھجک سی محسوس ہوئی، لیکن اُن کے طرزِ عمل کی نرمی اور عاجزی، دُوسروں کے نقطہ ہائے نظر سمجھنے کے لئے ان کا انہماک اور مُستعدی، اختلافات کو برداشت کرنے کی صلاحیت، اُن کی بچوں جیسی مُسکراہٹ اور اُن کی نرم دلی نے اور اُن کے پیدا کردہ اِس احساس نے کہ وہ ہم میں

بہت ایک ذہین اور اپنی عظمت کی بنا پر ہماری دسترس سے دور کوئی شخصیت نہیں ہیں۔ ان تمام خصوصیات نے جن کا احساس مجھے خود بخود ہوا۔ بعد کی ملاقاتوں میں گاندھی جی کی ان خصوصیات کے بارے میں میرے خیالات پختہ ہو گئے۔ خوف اور جھجک کی جگہ محبت اور عقیدت نے لے لی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ گاندھی جی ایک ایسے انسان تھے جن کے سامنے کوئی بھی معمولی شخص دل کھول کر رکھ سکتا تھا۔ جو کچھ ان سے کہا جاتا، اگر وہ ٹھیک ہوتا تو وہ اس کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ اگر کوئی آدمی اچھا کام کرتا تو گاندھی جی اس کی تعریف ضرور کرتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اس وقت رحمدلی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے جب کہ وہ کسی مقصد کو اپنی منزل بنا لیتے اور یہ مقصد عام انسان کی ہمت اور عزم سے کہیں بلند ہوتا تھا۔ وہ انسان کی خوبی اور صلاحیت بہت جلدی پہچان لیتے تھے اور بڑی فراخدلی سے اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

گاندھی جی نے ان تمام لوگوں کے کردار کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا جن سے ان کا واسطہ پڑا۔ ان لوگوں کی صلاحیت کے مطابق انہیں ذمہ داریاں سونپیں اور اس طرح گاندھی جی نے درجہ بدرجہ ان کے کردار کو بلند کیا اور ان کی کام کرنے کی قوت کو بڑھایا۔ ان کے نزدیک کام سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ لہذا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کے برتاؤ میں کسی قسم کے حسد یا امتیاز کا جذبہ نہیں آتا تھا۔ ایسا کوئی بھی شخص جو کسی بھی صورت میں دوسروں کی خدمت میں مصروف ہوتا، گاندھی جی کو عزیز تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کا کوئی دشمن نہیں تھا یا یوں کہیے کہ وہ کسی کو بھی اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔

ایک بات اور بھی ہے جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ گاندھی جی کی ذات میں ہمیں کرم یوگی اور دھیان یوگی کا ایک عجیب و غریب امتزاج نظر آتا ہے یعنی ایک مردِ باعمل اور مردِ عبادت گذار کا امتزاج۔ ایک ایسا انسان جو اپنے بھائیوں کی خدمت میں محو رہتا اور بیک وقت ایشور یا سچائی کی خدمت کے لئے خود کو وقف کئے رہتا۔ ان کے نزدیک ان دونوں چیزوں میں کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ ایک ربط و تعلق اور تسلسل موجود تھا۔ ان کے مطابق خدا کی جستجو حق کی تلاش ہے جسے انسانوں خصوصاً پسماندہ لوگوں کی خدمت کے ذریعے ہی پایا جا سکتا ہے۔

حال ہی میں اقوامِ متحدہ کے سابق جنرل آنجہانی ہیمرشولڈ کی ایک کتاب 'مارکنگس' شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ایک اہم جملہ لکھا ہوا ہے "ہمارے دور میں تقدیس کی راہ یقیناً عمل کے راستے سے ہو کر گذرتی ہے"۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تبصرہ نگار نے سوال کیا ہے کہ کیا اس بات کو ہم اپنے معاملے میں اپنے دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر نہیں دیکھ سکتے یعنی یہ کہ عمل کا راستہ تقدیس کی راہ سے ہو کر گذرتا ہے۔ انسانیت کی رہنمائی صرف وہی روح کر سکتی ہے جو اپنے ضمیر کی آگ میں تپ کر نکھری ہو۔

گاندھی جی کی خارجی اور داخلی زندگی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے ان دونوں دنیاؤں کی دیواروں کو ڈھا دیا تھا۔ ان کی اپنی اندرونی روحانیت ان کے عمل کو قوت اور معنی بخشتی تھی اور ان کی روحانی طاقت کا سرچشمہ ان کا بے لوث عمل تھا۔ اسی بنا پر انہیں وہ اعلیٰ کردار حاصل ہوا جس کی بدولت وہ بنی نوعِ انسان کے رہنما بنے۔ ▲

گوپی ناتھ امن



# گاندھی جی کے چند مسلمان ساتھی

گاندھی جی کا پہلا تعارف حکیم اجمل خاں سے اُس تار کے ذریعے ہوا جو اُنہوں نے گاندھی جی کو دلّی کے واقعات کے بارے میں بھیجا تھا۔ خلافت کی تحریک ۱۹۱۸ء میں شروع ہو چکی تھی۔ گاندھی جی نے اُس میں نمایاں حصّہ لیا۔ پھر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں جو کانگرس کا اجلاس ہوا، اُس میں مسٹر جناح نے گاندھی جی کی ترکِ موالات کی تجویز کی مخالفت کی۔ لیکن یہ تجویز کثرتِ رائے سے پاس ہو گئی۔ خلافت تحریک میں گاندھی جی اِس طرح گھل مِل گئے تھے کہ مسلمانوں کے جلسوں میں اُن کے نام کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ اگرچہ یہ تحریک خلیفۂ ترکی سے متعلق تھی جنہیں بعد میں تخت سے اُتار بھی دیا گیا، لیکن چونکہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات اُن دنوں بہت مشتعل تھے اِس لئے گاندھی جی نے اُن کا ساتھ دیا۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے سلطانِ ترکی کو تخت سے اُتار دیا تو یہ تحریک سرد پڑ گئی۔

خلافت کی تحریک کے زمانے میں مولانا محمدؐ علی و مولانا شوکت علی سے گاندھی جی کی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں بھائی پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہونے پر چھندواڑہ میں نظر بند کر دیئے گئے تھے ۱۹۱۹ء میں اُن کی رہائی ہوئی اور رہا ہوتے ہی یہ امرتسر کانگریس میں شریک ہوئے جہاں ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ گاندھی جی اور علی بھائیوں کا ہندوستان کا دورہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس سے تحریکِ خلافت اور کانگریس کو بہت تقویت پہنچی۔ اِسی سال امرتسر میں کانگرس کا اجلاس ہوا، کیونکہ مولانا محمدؐ علی کا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کانگرس میں شریک ہوئے اس لئے انہوں نے ۱۹۲۳ء میں جب وہ کانگرس کے صدر ہوئے تو فخر یہ کہا کہ اتنے تھوڑے عرصے کانگرس سے وابستہ رہنے کے بعد کوئی اور شخص کانگرس کا صدر نہیں ہوا۔ گاندھی جی کی ملاقات دلّی کانگرس کے اجلاس یعنی ۱۹۱۸ء میں حکیم محمدؐ اجمل خاں سے بھی ہوئی۔ یہی حکیم صاحب ۱۹۲۱ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر ہوئے۔

خلافت کی تحریک کے دنوں میں گاندھی جی کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ہوئی۔ علی برادران کی طرح یہ پہلی جنگِ عظیم میں نظر بند رہ چکے تھے۔ رہائی کے بعد گاندھی جی سے بھی ملے۔

اُن کے متعلق گاندھی جی نے یہ رائے ظاہر کی کہ میں نے اُن سے زیادہ عقلمند اور کوئی شخص نہیں دیکھا۔ دراصل خلافت کی تحریک کے دنوں میں بہت سے مسلمانوں سے گاندھی جی کی ملاقات ہوئی۔ ۱۹۲۱ء میں یہ کانگرس اور گاندھی جی سے الگ ہو گئے۔ کیونکہ جو تجویز کانگرس نے احمد آباد کے اجلاس میں ۱۹۲۱ء میں پاس کی، اُس کے

الفاظ یہ تھے کہ اگر ممکن ہو تو برطانوی سلطنت کے اندر سوراج اور اگر یہ ناممکن ہے تو برطانوی سلطنت کے باہر ملک کو آزادی دی جائے۔ مولانا حسرت موہانی یہ چاہتے تھے کہ پہلی شرط نہ لگائی جائے۔ وہ برطانوی سلطنت کے باہر ہی سوراج چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ ۱۹۲۱ء کے بعد کانگرس سے الگ ہو گئے اور مسلم لیگ میں چلے گئے۔ وہاں مسٹر جناح سے ان کی نہیں بنی تو مسلم لیگ کو بھی چھوڑ دیا۔ ان کا کچھ رجحان کمیونسٹوں کی طرف بھی ہو چلا تھا۔ گاندھی جی کے آشرم کے ساتھیوں میں شری عباس طیب جی تھے۔ جب نمک ستیہ گرہ میں گاندھی جی گرفتار ہو گئے تو طیب جی ہی نے اس تحریک کی رہنمائی کی اور ان کے گرفتار ہونے پر شریمتی سروجنی نائیڈو نے چارج سنبھالا۔ گاندھی جی کے پیرووں میں منظر علی سوختہ بھی تھے۔ یہ پہلے بم پارٹی میں انقلابی لیڈر رہے تھے۔ بعد کو گاندھی جی کے اثر میں آ گئے۔ آخر عمر میں گاندھی جی کی طرح لنگوٹی پہنتے اور چادر اوڑھتے تھے۔ اناؤ میں انہوں نے اپنا ایک آشرم قائم کیا، جو ان کے بعد نہ چل سکا۔ دلی میں گاندھی جی اکثر ڈاکٹر انصاری کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ دریا گنج میں دلی دروازے کے باہر پہلا نمبر پر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی تھی جس کا نام دارالسلام تھا۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لیڈر اسی کوٹھی میں آ کر ٹھہرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب سارے اخراجات برداشت کرتے تھے اس لئے ہندوستان کے چند گنے چنے ڈاکٹروں میں ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی زندگی میں کچھ بچا نہیں سکے۔ دلی کے تیسرے لیڈر مسٹر آصف علی تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے بعد ان کا شمار ہوتا تھا۔ گاندھی جی کی تحریک ستیہ گرہ سے ۱۹۲۱ء میں جب دلی میں مقرروں پر پابندی لگ گئی تو مسٹر آصف علی دلی کی حد کے باہر غازی آباد جا کر تقریریں کیا کرتے اور سیکڑوں آدمی ان کی تقریر سننے کے لئے دلی سے غازی آباد جاتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی تحریک خلافت کے ساتھ ساتھ کانگرس سے وابستہ ہو گئے اور کانگرس ورکنگ کمیٹی تک کے ممبر رہے۔ یہ اخبار "زمیندار" کے ایڈیٹر تھے۔ شاعر بھی بہت اچھے تھے اور کئی بار جیل بھی گئے۔ جمعیۃ العلماء کے سب ہی لیڈر گاندھی جی کے ساتھ تھے۔ دیوبند کے مولانا محمود الحسن کی سرکردگی میں جمعیت کے مفتی کفایت اللہ اس کے پہلے صدر تھے اور مولانا انور سعیدی جو بعد کو اس کے صدر بھی رہے شروع شروع میں سکریٹری ہوئے۔ سب سے زیادہ مدت تک مولانا حفظ الرحمان وہاں کے سکریٹری رہے۔ خواجہ عبدالمجید صاحب کا ذکر بھی اس سلسلے میں لازمی ہے۔ جب گاندھی جی نے یہ چاہا کہ ہندو یونیورسٹی کے لڑکے نکل کر کاشی ودیا پیٹھ میں آ جائیں اور مسلم یونیورسٹی کے جامعہ ملیہ میں، تو اس میں انہیں پوری کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن کئی سو لڑکے جو ہندو یونیورسٹی سے نکلے وہ کاشی ودیا پیٹھ چلے گئے جہاں کے پڑھانے والوں میں ڈاکٹر سمپورنانند آچاریہ کرپلانی، آچاریہ نریندر دیو اور ڈاکٹر بھگوان داس کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح جو لڑکے مسلم یونیورسٹی سے نکلے وہ جامعہ ملیہ میں شریک ہو گئے۔ خواجہ عبدالمجید اس کے پہلے پرنسپل ہوئے اور مولانا محمد علی درختوں کے نیچے چٹائیوں پر طلبا کو بٹھا کر شیکسپیر اور ملٹن کے سبق دیا کرتے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں ہستی جو بعد میں ہندوستان بھر میں چمکی، وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی تھی۔

پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عالم بھی بڑے پُرجوش کارکن تھے مگر بعد میں انہوں نے اپنی روش بدل لی۔ سرحدی گاندھی بادشاہ خان کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کی رہنمائی میں قصہ خوانی بازار میں سیکڑوں پٹھان سینہ تان کر گولیوں کی بوچھار کے آگے کھڑے ہو گئے۔ ہندوستان میں ایسی دلیری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ بلوچستان میں عبدالصمد خاں لیڈر تھے۔ وہ گاندھی جی کے معتقد خاص تھے۔ بہار میں مولانا

عبدالباری کا نام سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ راجندر بابو نے اپنی سوانحِ حیات میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح عبدالباری صاحب پر لاٹھیاں برسیں اور وہ گر کر بے ہوش ہو گئے۔

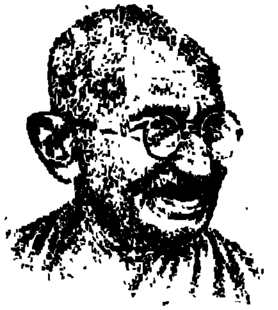
یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا آزاد جب انڈین نیشنل کانگریس کے پہلی بار صدر ہوئے تو اُن کی عمر ۳۵ سال تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں کوئی کانگریس کا صدر نہیں ہوا۔

اِس طرح مسلمانوں میں گاندھی جی کی تحریک کے ساتھ دینے والوں میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمان ہوئے ہیں۔ اِس سلسلے میں رفیع احمد قدوائی کا نام بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے جس طرح جنگِ آزادی میں اپنے جوہر دکھلائے، اِسی طرح ملک کے آزاد ہونے پر اُتّر پردیش میں ہوم منسٹر کی حیثیت سے اور مرکزی حکومت میں وزیرِ خوراک کی حیثیت میں شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا نام جامعہ ملیہ کے سلسلے میں آ ہی چکا ہے۔ اُن کے ساتھیوں میں ڈاکٹر عابد حسین، مولانا شفیق الرحمان قدوائی بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اُن میں سے قدوائی صاحب دلی کے وزیرِ تعلیم بھی ہوئے۔ مگر افسوس کہ وہ پُورا سال بھر بھی اِس حیثیت سے کام نہ کر سکے اور اُن کا انتقال ہو گیا۔ گاندھی جی کے آشرم نواسیوں میں ایک مسلمان خاتون اَمۃ الاسلام بھی تھیں، جنہوں نے نواکھالی کے فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر برت بھی رکھا تھا۔

اِن ممتاز قائدین کے علاوہ لاکھوں اور کروڑوں مسلمان ایسے تھے جو گاندھی جی کو اپنا رہنما اور سچا دوست سمجھتے تھے کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی اور اپنی تعلیمات سے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ ہندوستان کے سبھی لوگ اُنھیں یکساں عزیز ہیں۔

— آجکل، دہلی —

سعید انصاری



# مہاتما گاندھی اور خلافت تحریک

ہندوستان کی قومی سیاست میں گاندھی جی کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کا تھا۔ وہ اپنی 'آپ بیتی' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مجھے جنوبی افریقہ میں اس کا احساس ہو چکا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہیں ہیں اور میں انتہائی کوشش کرتا تھا کہ باہمی اتحاد کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دُور ہو جائیں۔ اپنی خودداری کھو کر یا خوشامد کر کے لوگوں کو خوش کرنا مجھے نہیں آتا تھا۔ مگر جنوبی افریقہ کے تجربوں سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے معاملے میں میری 'اہنسا' کا بڑا سخت امتحان ہوگا اور مجھے اہنسا کے نئے تجربوں کے لئے بڑا وسیع میدان ملے گا۔" (تلاشِ حق۔ حصّہ دوم۔ ص: ۶۲ ـ ۲۶۱)۔ اِن چند مختصر جملوں میں گاندھی جی نے اپنا مقصد اور اس مقصد کے حصول کے لئے اپنا طریقۂ کار سب کچھ واضح کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کی یہ خواہش بھی دیکھئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مجھے اچھے مسلمانوں کی صحبت کی تلاش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان میں جو پاک نفس اور وطن پرست لوگ ہیں، اُن سے مل کر مسلمانوں کی طبیعت کا اندازہ کروں اِس لئے میں ہر جگہ اُن کے ساتھ جانے کے لئے تیار رہتا تھا تاکہ اُن سے اچھی طرح ربط ضبط ہو جائے۔" (ص: ۲۶۱)

اِسی اثنا میں وائسرائے نے جنگ میں امداد دینے سے متعلق ایک کانفرنس دہلی میں طلب کی جس میں ہر فرقہ اور ہر خیال کے لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ اِس کانفرنس میں وائسرائے نے گاندھی جی کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی لیکن گاندھی جی کو اس میں شرکت سے اِس وجہ سے انکار تھا کہ اُنہوں نے مہاراشٹر سے تلک اور مسلمانوں میں سے علی برادران کو نہیں بُلایا تھا، اِس لئے کہ ان کے خیالات ذرا انتہا پسندانہ تھے۔ اِسی اثناء میں حکومت نے مسئلہ خلافت کے سلسلے میں اُنہیں گرفتار کر کے سول جیل میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ گاندھی جی نے علی برادران کے اصل خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی اور یہ کہ انہوں نے اب تک کیا کیا ہے اب گاندھی جی کی مسلمانوں کے ساتھ وابستگی اور اُن کے مسئلۂ خلافت کے ساتھ ہم آہنگی کا وقت آیا۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: "مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر میں مسلمانوں کا سچّا دوست بننا چاہتا ہوں تو مجھے چاہیئے کہ علی برادران کی رہائی اور مسئلۂ خلافت کے تصفیے کی کوشش میں ہر طرح کی مدد دوں۔ آخر میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ مجھے اِس سے بحث نہ تھی کہ اِس مسئلے کی مذہبی صورت کیا ہے۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ یہ مسلمانوں

کا مطالبہ ہے اور اس میں کوئی بات اخلاق کے منافی نہیں"۔ پھر آگے چل کر وہ خود ہی لکھتے ہیں۔ "مجھے معلوم ہوا کہ انگلستان کے وزیر اعظم نے تسلیم کر لیا ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ خلافت کے بارے میں صحیح ہے اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وزیر اعظم کو عہد کی پابندی پر مجبور کرنے میں مسلمانوں کا ساتھ دوں۔ یہ عہد اس قدر صاف لفظوں میں تھا کہ مجھے اس کے بعد مسلمانوں کے مطالبات کی زیادہ چھان بین کرنے کی ضرورت نہ تھی (۹ص، ۲۶۳)

سطور بالا سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ گاندھی جی کس طرح رفتہ رفتہ ہندوستان کی سیاست پر چھا رہے تھے۔ ایک متحدہ قومیت کی بنیاد اور ایک ہمہ گیر قومی تحریک کی تیاری کر رہے تھے جو ۱۹۲۰ء میں "نان کوآپریشن" یا تحریک خلافت کے نام سے شروع ہوئی۔ ان کی تحریک خلافت کی اس شرکت پر اس زمانے میں بعض لوگوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جن میں ایک انگریز جرنلسٹ مسٹر ایڈمنڈ کینڈ بھی تھے۔ اُن کے جواب میں گاندھی جی لکھتے ہیں۔ "مجھے اعتراف ہے کہ ترکوں کے مطالبے کے معاملے میں میرا خیال کلیتاً میرے اپنے ہم وطن مسلمان بھائیوں کے خیال سے تھا۔ میں انہیں ہم وطن بھائی کہنے کا حق نہیں رکھتا اگر مجھے ان کے ساتھ ہر ایسے معاملے میں ہمدردی نہ ہو جو انہیں متاثر کرتا ہو۔ بشرطیکہ وہ معاملہ انصاف پر مبنی ہو۔ میرے ملک کا امن خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں نے مسلمانوں کے جذبات کی صحیح راستے پر رہنمائی نہیں کی بلکہ جتنا یہ برطانوی وزراء کے غیر معقول یا نادانستہ طرز عمل سے پڑے گا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے جو میں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے جذبات قابو میں رکھنے اور ہندوؤں کو دل کے ساتھ شریک کار ہونے کے لئے صلاح دی ہے۔ آپ یقیناً صحیح سمجھتے ہونگے کہ میں نے گلیڈ اسٹون مارلے اور برائیس جیسے مدبروں کی رائے کے خلاف کام کیا جن کا میرے دل میں بہت احترام ہے لیکن آپ کا بھی اعتراض کرنا اس پر مبنی ہے کہ آپ ترکی کے متعلق مسلمانوں کے مطالبے سے بالکل ناواقف ہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ اُن کے نقطۂ نظر کا مطالعہ کریں۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں مانگتے جو اور طاقتوں کو دیا گیا ہے جس کا برطانوی وزراء نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ ان کے مطالبے کی سابق گورنروں اور ممتاز اینگلو انڈین لوگوں نے بھی تائید کی ہے۔ ترکوں کا اپنی ماتحت رعایا کے ساتھ اچھا یا برا سلوک کرنا اور خلافت کے مسئلے سے کیا تعلق ہے ترکوں کا مسئلہ تو صرف ترکوں کی سالمیت اور اسلام کے مقدس مقامات کو اُن کے تحت رکھے جانے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا قسطنطنیہ کا ترکوں سے اس بنا پر چھین لینا ضروری ہے کہ وہاں کی دوسری قوموں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے؟ اگر آپ بہ حیثیت ایک جرنلسٹ اور انگریز کے ہندوستان میں امن دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ کہ ہندوستان جشن صلح صحیح طور پر منائے تو آپ کو چاہیئے کہ جو انگریز ہندوستان میں رہتے ہیں اُن سے آپ کہیں کہ وہ بھی مسلمانوں کا اس معاملے میں ساتھ دیں تاکہ برطانوی وزراء ہندوستان کے جذبات کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور اُن کے ساتھ انصاف ہو سکے جس کے لئے ابھی وقت ہے۔

گاندھی جی خلافت کے مسئلے کو مسلمانوں کا ایک جائز اور حق بجانب مسئلہ تو سمجھتے ہی تھے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اُن کے مشتعل جذبات کو اگر ٹھنڈا نہ کیا گیا تو خود ہندوستان کا امن خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور آئندہ ہندوستان کو جو اصلاحات اور حکومت خود اختیاری ملنے کو ہے وہ مسلمانوں کی عدم شرکت سے بےکار ہو جائے گی اس لئے انہوں نے ہز ایکسلینسی وائسرائے کے سکریٹری سر ایس۔ آر ہگنیل کے نام ۷ر اگست ۱۹۱۹ء کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے مسئلے کے اونچ نیچ سمجھانے کی پوری کوشش کی اور یہ کہ وہ ہز ایکسلینسی پر کوئی

زور ڈالیں کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ گاندھی جی لکھتے ہیں کہ ترکی کے ساتھ شرائط صلحنامہ اگر باعزت ہیں تو ہندوستان میں ان کا کوئی اثر نہ ہونا چاہیئے۔ میں اور بھی زیادہ متاثر ہوا جب میں نے ان بڑے بڑے اشخاص کا خط جو انگلستان میں رہتے ہیں، وزیر اعظم کے نام دیکھا۔ ان میں ہز ایکسیلنسی آغا خاں، جسٹس امیر علی، سر عباس علی بیگ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ہز ایکسیلنسی نے بھی یہ خط دیکھا ہوگا جو ترکی کے حصے بخرے کئے جانے کے متعلق ہے اور پھر اس کا جو اثر مسلمانوں پر ہوگا میں روزانہ ایسے مسلمان دوستوں سے ملتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم بیچ دیئے جائیں گے۔ میں انھیں برابر سمجھاتا ہوں کہ ہز ایکسیلنسی ایسا نہ ہونے دیں گے اور انہیں ہز میجسٹی کے وزراء پر اعتماد رکھنا چاہیئے۔ . . . اگر مسلمانوں کے یہ خطرات صحیح ثابت ہوئے تو ہندوستان میں ہتھیاروں کے ذریعے امن ہوگا۔ صحیح امن نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی اصلاحات خواہ وہ کتنی فیاضی پر مبنی کیوں نہ ہوں، وہ مسلمانوں کو ترکی کے حصے بخرے کرنے اور ان کے مقامات مقدسہ چھن جانے پر انہیں مطمئن نہیں کرسکتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہز ایکسیلنسی ان باتوں سے باخبر ہونگے لیکن سلطنتِ برطانیہ کے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ ہز ایکسیلنسی کے علم میں ان معاملات کو لاؤں جو میرے سامنے آتے رہتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ہز ایکسیلنسی کی طرف سے ترکی کے متعلق اگر ایک بیان شائع ہوجائے تو بہت بہتر ہوگا۔"

اِسی تاریخ کو ایک اور خط گاندھی جی نے وائسرائے کے نام بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ ۲۷ر جولائی کے خط کے سلسلے میں میں ایک حیرت انگیز مضمون بھیج رہا ہوں جو New Age میں مارماڈیوک پکتھال کے قلم سے نکلا ہے۔ اِس میں جو باتیں دی ہوئی ہیں وہ صحیح اور مستند معلوم ہوتی ہیں، اگر یہ صحیح ہے تو بہت افسوسناک ہے. . . . میں ہز ایکسیلنسی کی توجہ نہایت پُر زور طریقے پر، جہاں تک میرے بس میں ہے، اِس امر کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کروں گا کہ اگر ممکن ہو تو عام پبلک کو مطمئن کرنے کے لئے ایک بیان شائع کر دیا جائے۔ میری ناچیز رائے میں صلح ایک بڑی مضحکہ خیز چیز بن کر رہ جائے گی۔ اگر کمزور قوموں کے ساتھ اِسی طرح برتاؤ کیا گیا، جیسا ترکی کے ساتھ کیا جارہا ہے لیکن اِس معاملے کے منصفانہ پہلو کے علاوہ کیا حکومت ہند سلطنت برطانیہ کے لاکھوں شہریوں کی بے چینی اور بے اطمینانی کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ ہز ایکسیلنسی کے اختیار سے باہر ہے کہ خلافت کے مسئلے کا کوئی مناسب حل نہ نکال سکیں۔

گاندھی جی کی یہ پیغمبرانہ پیشین گوئی کہ صلح ایک بڑی مضحکہ خیز چیز بن کر رہ جائے گی، بالآخر صحیح ثابت ہو کر رہی جبکہ اس سے چند سال بعد مصطفٰے کمال اتاترک نے برطانوی اور یونانی فوجوں کو سمرنا کے میدان میں شکست دی اور اسی سلطنت عثمانیہ کی خاکستر سے ایک نئی سلطنت وجود میں آئی۔ جزیرۃ العرب کی آزادی اور مسلمانوں کے اماکنِ مقدسہ کی حفاظت کے لئے قدرت نے اور انتظام کر دیا۔ دوسری طرف جرمنی میں صلحنامہ ورسائی کے غیر منصفانہ ہونے کے احساس نے ہٹلر کو پیدا کیا جس کی سرکردگی اور رہنمائی میں ایک نئے جرمنی نے جنم لیا جس نے صلحنامہ ورسائی کا ایک ایک ورق پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیزی اور کیا ہو سکتی ہے !۔

تحریکِ خلافت سے متعلق سطور بالا سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ تنہا گاندھی جی کا مسئلہ تھا جو اس کے محرک

تھے اور اس سے ہمدردی رکھتے تھے بلکہ دوسرے ہندو اکابرین بھی اس میں برابر کے شریک تھے اور مسلمانوں میں بھی یہ سمجھنا کہ صرف علماء اور کٹر خیال کے لوگ اس تحریک میں شریک تھے، غلط ہے۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں ایک وفد ہز ایکسیلینسی وائسرائے سے ملنے کے لئے شملہ جاتا ہے۔ اس وفد کے شرکاء میں جن کے نام خاص طور پر ملتے ہیں ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔ سرِ فہرست گاندھی جی کا نام ہے، اس کے بعد حکیم اجمل خاں، پھر علی برادران کا نام آتا ہے۔ آگے چل کر مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی کے نام آتے ہیں۔ پھر مسلم لیگ کے سکریٹری ظہور احمد صاحب اور مسٹر محمد علی جناح، سید حسن امام اور مسٹر فضل الحق کے نام ہیں اور پھر ان سب کے علاوہ سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ ان کے ساتھ ساتھ پنڈت رام بھجدت چودھری سوامی شردھانند جی، پنڈت مدن موہن مالوی اور پنڈت موتی لال نہرو جیسے لوگوں کے نام بھی ہیں۔

اس وفد نے ہز ایکسیلینسی کے سامنے جو ایڈریس پیش کیا تھا، اس کی عبارت سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ہندو مسلم مشترک وفد تھا اور وفد کے مطالبات میں مسلمانوں کے مسئلے کے علاوہ ہندوستان کا عام مفاد اور امنِ عالم کے قیام کا مقصد بھی شامل تھا۔ نیز یہ وفد نہ صرف ۷ کروڑ مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کے لئے گیا تھا بلکہ ۲۱ کروڑ ہندوؤں کی ترجمانی بھی کر رہا تھا۔ اس ایڈریس کے آخری حصے کے الفاظ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

"جنگ ممکن ہے ختم ہو گئی ہو لیکن امن ابھی کوسوں دور ہے اور ہم برطانوی حکومت سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ اسلامی دوستی اور ہندوستانی وفاداری کی قدر و قیمت کو حقیر نہ سمجھے۔ ایک ایسا فیصلہ جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے ناقابلِ قبول ہو اور جو خوش قسمتی سے اس وقت مل جل گئے ہیں اور ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں، وہ ہرگز امن نہیں لا سکتا، اس لئے کہ اس سے نہ انصاف کا حق ادا ہوگا اور نہ انہیں اطمینان حاصل ہوگا ۔ ۔ ۔"

آگے چل کر یہ کہا گیا ہے:

"لیکن اگر اس کے برعکس ہندوستان کا دل برطانوی دولتِ مشترکہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنے معاملات کے خود سنبھالنے کی صلاحیت تسلیم کر کے جیتا جا سکتا ہے اور دوسری طرف عالم اسلامی کو اسلامی ذمہ داریاں تسلیم کر کے مطمئن کیا جا سکتا ہے تو یہ سمجھئے کہ نصف دنیا کے مسلمانوں کے جذبات برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ ہوں گے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے ان حقوق سے محروم نہیں کر سکتی ہے، جو اس کے اور سلطنتِ برطانیہ کے ایک دوسرے پر ہیں۔ اس وقت جو خطرہ سامنے نظر آ رہا ہے وہ بغیر کسی ضربِ کاری کے یا انسانی خون کا ایک قطرہ بہائے ہوئے اس طرح غائب ہو جائے گا، جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اس وقت دنیا نہ صرف جمہوریت کے لئے محفوظ ہو جائے گی بلکہ خدا اور حق کے لئے بھی مامون بن جائے گی اور اس جذبے کے ساتھ ہم اپنا مشن یور ایکسیلینسی کی مدد سے برطانیہ اور دوسرے اتحادی ملکوں کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔"

(Collected works of Mahatma Gandhi)

یہ مسئلہ نہ صرف بے ضابطہ طور پر ہندو اور مسلمانوں کا مشترک مسئلہ بن گیا تھا بلکہ باضابطہ طور پر کانگریس کے اجلاس منعقدہ امرتسر میں بھی پیش ہوا۔ امرتسر کا یہ اجلاس کئی حیثیتوں سے بہت اہم تھا۔ ایک تو اصلاحات

یہ رزولیوشن پاس ہوا جس میں لفظ 'مایوس کن' پر بڑی بحث رہی۔ گاندھی جی اِس لفظ کے ہٹانے پر مصر تھے اور کہتے تھے کہ ملکِ معظم کے اعلان میں ہندوستان کے ساتھ ہمدردی کا جو اظہار کیا گیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم شکریے کا اظہار کریں اور ہمیں اگر اصلاحات چلانی منظور ہیں تو انہیں 'مایوس کن' نہ کہیں یا پھر اگر ہمت ہو تو انہیں ٹھکرا دیں۔ دوسرا اہم رزولیوشن خلافت کے مسئلے میں مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ ہمدردی کے اظہار کا تھا۔

لیکن آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ گاندھی جی جیسے پُراُمید شخص کو بھی برطانوی حکمتِ عملی سے مایوس ہونا پڑا اور پھر ہندو اور مسلمان دونوں دو قالب اور یکجان ہو گئے۔ اِس اثنا میں پنجاب کے مظالم پر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ جاری ہو گئی تھی جس میں جنرل ڈائر اور گورنر پنجاب اوڈائر کو بے گناہ قرار دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ اس کمیٹی کی سفارشات پر ایک رولٹ بل کا مسودہ بھی تیار ہوا جو بڑے سے بڑے قانون داں لوگوں کے ہوتے ہوئے مجلسِ آئین ساز میں ایک قانون کی شکل میں پاس کر دیا گیا۔ پھر کیا تھا، اس نے تمام سیاسی حلقوں میں آگ لگا دی اور اس طرح ایک مشترکہ اور متحدہ قومیت کی بنا پر ہی گاندھی جی اپنی تمام صلح و آشتی کی کوششوں کے باوجود ہکّے بکّے رہ گئے اور اسی فکر و خیال میں وہ رات میں سو گئے۔ اس واقعے کے اثر سے اِس کے نتیجے کے طور پر اس کا جو حل ان پر القا ہوا، اُس کا تذکرہ وہ اپنی 'آپ بیتی' میں بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں: "پچھلے پہر میری آنکھ معمولی وقت سے ذرا پہلے کھل گئی۔ ابھی میں خواب و بیداری کی سرحد پر تھا کہ یکایک اس مسئلے کا حل میری سمجھ میں آگیا۔ رات مجھے خواب میں یہ خیال آیا کہ اس قانون کے جواب میں ہمیں سارے ملک میں ہڑتال کرنی چاہئے۔ ستیاگرہ تزکیۂ نفس کا نام ہے۔ میرے خیال میں یہی مناسب ہے کہ ہم اس کا آغاز تزکیۂ نفس سے کریں۔ اس لئے ایک دن مقرر کیا جائے اور اس دن سارے ہندوستانی 'برت' رکھیں، اپنا کاروبار موقوف رکھیں اور اپنا وقت عبادت میں صرف کریں۔ مسلمانوں کے ہاں ایک دن سے زیادہ کا روزہ ناجائز ہے اس لئے یہ برت ۲۴ گھنٹے کا رکھا جائے۔" (تلاشِ حق حصۂ دوم ص ۲۸)

چنانچہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء ہڑتال کی تاریخ مقرر ہوئی، جو بعد میں وقت کی کمی کی وجہ سے ۶ اپریل کر دی گئی لیکن دہلی میں چونکہ اس التوا کی اطلاع دیر سے پہنچی تھی اِس لئے یہاں ہڑتال ۳۰ مارچ ہی کو ہوئی۔ اِس قومی اتحاد کا پُرکیف منظر گاندھی جی خود اِن لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

"دہلی میں سوامی شردھانند جی اور حکیم اجمل خاں کا طوطی بولتا تھا۔ یہاں جیسی ہڑتال اُس دن ہوئی، اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہندو مسلمان ایک دل ہو گئے۔ سوامی شردھانند جی سے جامع مسجد میں تقریر کرائی گئی۔ بھلا حکام ان باتوں کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ پولیس نے ہڑتال کے جلوس کو اسٹیشن کی راہ میں روکا اور اُن پر گولی چلائی۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے، بہت سے مارے گئے۔ دہلی میں جبر و تشدد کا دور دورہ ہو گیا۔" (ص: ۲۸۷)۔

ہندوؤں نے مسلمانوں کا دل اِس قدر موہ لیا تھا کہ یہی نہیں کہ سوامی شردھانند جی کو دہلی کی شاہجہانی مسجد میں بلایا گیا اور انہیں امام کے ساتھ منبر پر جگہ دی گئی بلکہ ہندو برادرانِ وطن کی دلجوئی کی خاطر مسلمانوں نے ذبیحۂ گاؤ کی رسم ترک کر دینے کا بھی فیصلہ کیا تھا اور ایک مشترک کانفرنس اِس غرض سے بلائی گئی لیکن گاندھی جی کسی وقتی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے قائل نہ تھے اور نہ وہ اِس کو سودے کا معاملہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کانفرنس کے مدعوئین کو لکھ دیا کہ وہ خلافت اور ذبیحۂ گاؤ کے مسئلے کو آپس میں گڈمڈ نہ کریں۔ کانفرنس کے سامنے بھی صاف صاف یہی کہا

کہ "اگر خلافت کا مسئلہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، حق پر مبنی ہے اور اگر حکومت نے اِس معاملے میں صریح بے انصافی کی ہے تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کے مطالبے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ اُن کے لئے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقع پر گئو رکشا کا مسئلہ بیچ میں لائیں اور صورتِ حال سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانوں سے سودا چکائیں اور مسلمانوں کے لئے بھی اِس شرط پر گاؤ کشی بند کرنا نامناسب ہے کہ ہندو خلافت کے مسئلے میں اُن کا ساتھ دیں۔ یہ دُوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے گئو کشی اپنی خوشی سے ترک کر دیں۔ ان کا یہ طرزِ عمل بہت خوشنما اور قابلِ تعریف ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر مسلمان گاؤ کشی بند کرنا فرضِ ہمسائگی سمجھتے ہیں تو اُنہیں ہر حال میں بند کر دینا چاہیئے۔ چاہے ہندو خلافت کے مسئلے میں اُن کا ساتھ دیں یا نہ دیں۔" (ص: ۳۰۹)

لیکن مسلمانوں کی طرف سے اُس وقت اسی یکجہتی کی فیاض دلی اور مخلصانہ رویّے کا ثبوت دیا گیا۔ چنانچہ گاندھی جی اپنی 'آپ بیتی' میں لکھتے ہیں کہ اس کے باوجود مولانا عبدالباری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ خواہ ہندو ہماری مدد کریں یا نہ کریں، مسلمانوں کو اپنے برادرانِ وطن کے جذبات کا لحاظ کر کے گاؤ کشی ترک کر دینا چاہیئے۔" (ص: ۳۰۹)

اِس طرح گاندھی جی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک خالص ہندوستانی قومیت کی بُنیاد پر ایک دوسرے سے قریب لانا چاہتے تھے اور جس طرح اُنہوں نے ایک دُوسرے کو مذہبی سودے بازی سے روکا، اُسی طرح تحریک کو وقتی اور ہنگامی بھی نہ ہونے دیا۔ اِس لئے وہ اس کے ساتھ کسی مقامی مسئلے یا فوری انتقامی تدبیر کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ اسے ایک بلند سطح اور اعلیٰ اصولوں پر مبنی رکھنا چاہتے تھے۔ وہ طریقۂ کار اور لائحۂ عمل کیا ہو، اُن کے ذہن میں کوئی بنا تُلا پروگرام نہ تھا بلکہ اس مشترک کانفرنس کے سامنے اُنہوں نے جو خیال پیش کیا، اسی میں وہ طریقۂ کار بھی مضمر تھا۔ خود اُنہیں کے الفاظ میں سُنیئے:

"اگر خدانخواستہ صلح کی شرائط آپ کے خلاف ہوئیں تو آپ حکومت سے اتحادِ عمل ترک کر دیں گے۔ اگر حکومت ہمارے ساتھ خلافت جیسے مہتم بالشان مسئلے میں عہد شکنی کرے تو ہمارے لئے بجز 'نان کوآپریشن' یا ترکِ موالات کے کوئی چارہ نہیں اور ہمارا یہ 'نان کوآپریشن' بالکل جائز ہوگا۔"

یہ تھا ٹیپ کا وہ بند جو گاندھی جی نے اپنی اِس تقریر میں ظاہر کر دیا اور اس کے بعد سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات دونوں گنگا جمنا کے دو دھاروں کی طرح متحدہ قومیت کے سنگم میں ملیں کہ اس سے پہلے ہندوستان کی سیاست میں کبھی ایسی یک جہتی اور یگانگت نہیں دیکھی گئی تھی۔

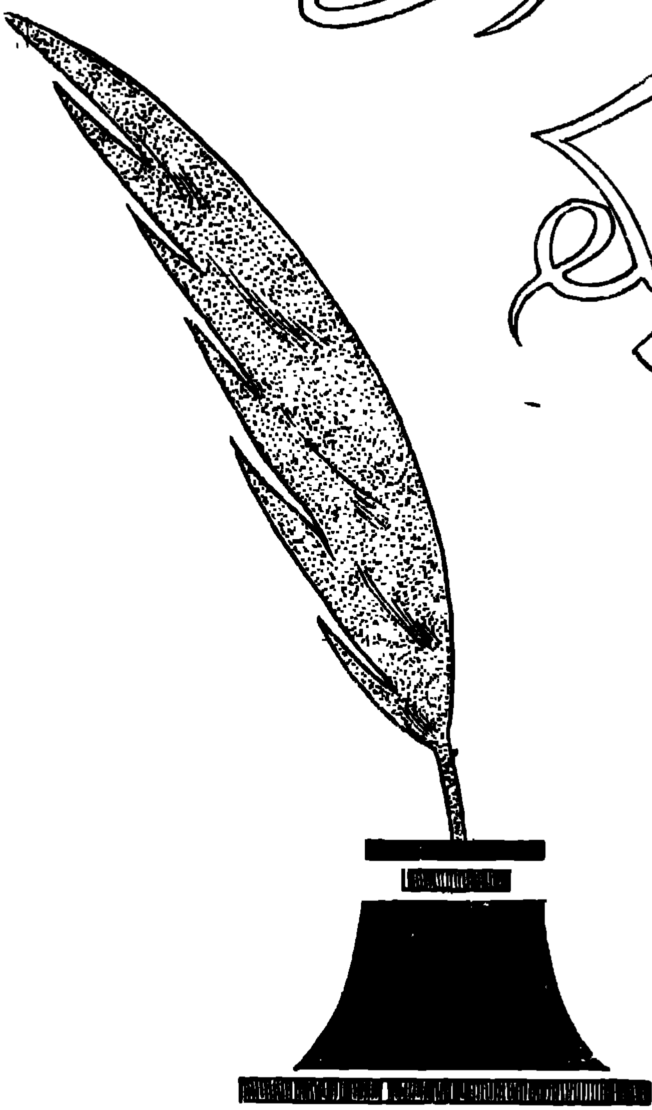
(آجکل دہلی)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

## اظہارِ عقیدت

# رائل انڈین ہوٹل۔ کلکتہ

# گاندھی
# لیکھ





# گاندھی جی کے چند اہم مضامین

## تعلیم کے معنی

تعلیم کے کیا معنی ہیں؟ اِس کے معنی ہیں "علم حاصل کرنا"۔ تعلیم ایک آلہ ہے۔ ایک آلے کا اچھا استعمال بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی۔ ایک ہی آلہ جو ایک مریض کے اچھا کرنے میں کام دے سکتا ہے اُس کی جان لینے میں بھی کام آ سکتا ہے۔ یہی حال علم حاصل کرنے کا بھی ہے۔ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ کتنے لوگ اِس کا غلط استعمال کرتے ہیں اور بہت کم لوگ اِسے صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں اور اگر یہ صحیح ہے تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس سے فائدے سے زیادہ نقصان پہنچا ہے۔

تعلیم کے عام معنی علم حاصل کرنا ہے۔ بچوں کو پڑھنا لکھنا اور حساب سکھانا ابتدائی تعلیم کہا جاتا ہے۔ ایک کسان اپنی روزی ایمانداری کے ساتھ کماتا ہے۔ اُسے دنیا کا عام علم ہوتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اسے اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنی بیوی بچوں اور اپنے گاؤں والوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔ وہ اخلاقی اصول اور قاعدے بھی جانتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے لیکن وہ اپنا دستخط نہیں کر سکتا۔ پھر تم اُسے تعلیم دے کر کیا کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم اس کی خوشی میں ایک اینچ بھی اضافہ کر سکتے ہو؟ کیا تم اسے اپنے جھونپڑے یا اپنی قسمت سے غیر مطمئن رکھنا چاہتے ہو؟ اگر تم ایسا کرنا بھی چاہو تو اُسے ایسی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ مغربی خیالات کی رو میں بہہ کر اور بغیر اس کا آگا پیچھا سوچے ہم اِس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں بھی لینے لوگوں کو اِسی قسم کی ابتدائی تعلیم دینی چاہیئے۔

اب اعلیٰ تعلیم کو لیجئے۔ میں نے جغرافیہ، ہیئت، الجبرا، ہندسہ وغیرہ پڑھا لیکن اس سے مجھے کیا فائدہ ہوا؟ میں نے کس طرح اپنے کو یا اُن لوگوں کو جو میرے ارد گرد ہیں فائدہ پہنچایا ہے؟ میں نے یہ چیزیں کیوں پڑھی ہیں؟ ہکسلے نے جو انگلستان کے ایک مشہور فلسفی گذرے ہیں، تعلیم کی تعریف اِن لفظوں میں کی ہے:

"میرے خیال میں اُس شخص نے صحیح تعلیم پائی ہے جس کا جسم اُس کی مرضی کا پابند ہو اور نہایت آسانی سے وہ سب کام انجام دے سکتا ہو جو بہ حیثیت ایک مشین کے وہ کر سکتا ہے۔ اُس کا دماغ ایک نہایت صاف شفاف، ٹھنڈا، منظم انجن ہے جس کے تمام پرزے یکساں قوت اور ٹھیک طور سے چل رہے

ہوں، جس کا دماغ فطرت کی بنیادی حقیقتوں کا خزانہ ہو، جس کے جذبات کی اس طرح ترتیب ہوئی ہو کہ وہ ایک مضبوط ارادے کے پابند اور ایک لطیف ضمیر کے غلام ہوں، جس نے تمام ادنیٰ اور چھوٹی باتوں سے نفرت کرنا اور اپنے برابر دوسروں کی عزت کرنا سیکھا ہو۔ ایسا شخص اور اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے جس نے میرے خیال سے صحیح تعلیم حاصل کی ہو، اس لئے کہ وہی فطرت سے ہم آہنگ ہوگا، وہی فطرت سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا اور فطرت اس سے۔"

اگر یہی صحیح تعلیم ہے تو میں نہایت پُرزور طریقے پر کہوں گا کہ جن علوم کا میں نے بیہر ذکر کیا ہے۔ انہیں میں اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے کبھی نہیں استعمال کر سکا ہوں، اس لئے خواہ تم ابتدائی تعلیم لو یا اعلیٰ تعلیم، اصل مقصد کے لئے اِن میں سے کسی کی ضرورت نہیں۔ یہ نہ ہمیں انسان بناتی ہے اور نہ اپنا فرض ادا کرنا سکھاتی ہے۔۔۔۔۔

میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ مجھے موجودہ طرز کی ابتدائی یا اونچی تعلیم نہ ملی ہوتی تو میری زندگی بیکار ہوجاتی اور نہ میں مانتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس سے دوسروں کا ضرور بھلا ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بھلائی کرنے کی میری خواہش ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے جو کچھ میں نے پڑھا ہے، اس کا استعمال کرتا ہوں، لیکن اس کے استعمال سے میں اپنے کروڑہا ہم وطن بھائیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا بلکہ صرف آپ جیسے چند پڑھے لکھے لوگوں ہی کو فائدہ پہنچاتا ہوں جس سے میرے ہی خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ موجودہ طرزِ تعلیم کا بُرا اثر آپ پر اور مجھ پر یکساں پڑا ہے لیکن میں اس کے بُرے اثرات سے بچ گیا ہوں اور اپنے تجربوں کی بنا پر آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں اور ایسا کرتے ہوئے پائی ہوئی تعلیم کا استعمال کر کے اُس کے بُرے نتائج سے آپ کو آگاہ کر رہا ہوں۔

## ستیہ گرہ یا رُوحانی طاقت

سوال۔ کیا آپ کسی تواریخی حوالے سے ستیہ گرہ یا رُوحانی طاقت کی کامیابی کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟ آج تک یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ کوئی قوم اِس طاقت سے بڑھی ہو۔ میرا تو اب بھی یہی خیال ہے کہ "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔"

جواب۔ ہندی کا مشہور شاعر گوسوامی تلسی داس جی نے کہا ہے ؎

دیا دھرم کا مول ہے پاپ مول ابھیمان
تلسی دیا نہ چھوڑئیے جب لگ گھٹ میں پران

مجھے اِس کی صداقت پر پورا پورا یقین ہے۔ رحم کی طاقت ہی رُوحانی طاقت ہے۔ وہ ستیہ گرہ ہے اور اس کا ثبوت تو قدم قدم پر ملتا ہے۔ اس کے بغیر تو دنیا کبھی کی وسعائل کو پہنچ چکی ہوتی۔ مگر آپ کو تواریخی حوالوں کی ضرورت ہے۔ آؤ پہلے ہم اس کی چھان بین کر لیں کہ تواریخ کسے کہتے ہیں؟ تواریخ کے لفظی معنی ہیں، علمِ واقعات۔ ان معنوں میں تو ستیہ گرہ کے بے شمار ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر تواریخ کا مطلب خالی بادشاہوں کی تاریخ ہی لیا جائے جیسا کہ اِس انگریزی لفظ کا مطلب ہے جس کا ترجمہ تواریخ کیا گیا ہے تو اس میں ستیہ گرہ کی کوئی مثال

نہیں مل سکتی۔ رانگ کی کان میں چاندی کیسے مل سکتی ہے؟ اس تواریخ یعنی ہسٹری میں تو دنیا کے شور و غل یعنی لڑائیوں کی کہانی ہی ملے گی۔ انگریزی زبان میں ایک کہاوت ہے جس ملک کی تواریخ نہیں (یعنی جہاں لڑائیاں نہیں) وہ سکھی ہے۔ اس تواریخ میں تو بادشاہوں کے کھیل تماشے، قتل و غارت اور دشمنی کے عجیب و غریب طریقے بیان کئے جاتے ہیں۔ اگر تواریخ یہی ہے اور دنیا میں ہونے والے واقعات صرف یہی ہے تو دنیا کبھی کی مٹ گئی ہوتی۔ اگر دنیا کی کہانی لڑائی سے شروع ہوئی ہوتی تو آج ایک بھی انسان زندہ نظر نہ آتا۔ جن لوگوں کو صرف لڑائی ہی کا کام رہا، ان کا یہی حشر ہوا۔ آسٹریلیا کے حبشیوں کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ ان سب سے شاید ہی کسی کو آسٹریلیا پر دخل جمانے کے لئے زندہ رکھا گیا ہو۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جن کی بنیاد اس طرح جڑ سے کٹ گئی۔ وہ ستیہ گرہی نہ تھے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آسٹریلیا کے موجودہ حاکموں کا بھی یہی حال ہوگا، کیونکہ جو دوسروں پر تشدد روا رکھتا ہے اس پر بھی ایک دن تشدد کا وار ہوتا ہے۔ ہندوستانی میں ایک کہاوت مشہور ہے۔

"تیراک ہمیشہ ڈوب کر ہی مرتا ہے"۔

آج بھی دنیا میں بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی ہستی مسلح طاقت پر نہیں، بلکہ سچائی، رحم یا روحانی طاقت پر قائم ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لڑائی کی طاقت کے سوا ہماری ہستی کا انحصار کسی دوسری طاقت پر ہے۔

کروڑہا انسان پریم اور محبت سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی محبت کے زیر اثر گھریلو جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ ہزاروں لوگ مل جل کر امن و آرام سے رہتے ہیں۔ تواریخ اس کی تائید نہیں کرتی اور کر بھی نہیں سکتی۔ عوام کے امن و امان اور سکھ چین میں خلل واقع ہونے کا دوسرا نام تواریخ ہے۔ ایک خاندان کے دو بھائی آپس میں لڑیں۔ اس میں ایک دوسرے کے ساتھ ستیہ گرہ کر کے اس کے محبت کے جذبے کو پھر سے پیدا کرے اور پھر دونوں آپس میں مل جل کر رہنے لگیں تو اس کی مثال کون پیش کرتا ہے؟ وہاں وکیلوں کی مدد سے یا دوسرے طریقوں سے دونوں میں دشمنی بڑھے اور تشدد کی یا عدالتی لڑائی ہو تو ان کا نام اخبار میں چھپے۔ پاس پڑوس والے اس کی چرچا کریں اور شاید تواریخ میں بھی اس کا ذکر آجائے۔ خاندانوں، قوموں یا جماعتوں پر جو بات صادق آتی ہے وہی ملکوں کے لئے بھی سمجھنی چاہیئے۔ خاندانوں کے لئے اور ملکوں کے لئے دوسرا قانون نہیں ہو سکتا۔ تواریخ میں صرف غیر قدرتی باتوں کا ہی ذکر ہوتا ہے لیکن ستیہ گرہ تو قدرتی بات ہے، اس لئے تواریخ میں اس کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

سوال: آپ کے کہنے کے مطابق تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تواریخ میں ستیہ گرہ کا کہیں ذکر آ ہی نہیں سکتا۔ اس ستیہ گرہ کو ذرا اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اگر آپ اسے تفصیل سے بیان کریں تو بہت اچھا ہوگا۔

جواب: ستیہ گرہ یا آتم بل کو انگریزی زبان میں Passive Resistance کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے تکلیف اٹھانا۔ یہ حیوانی طاقت کے بالکل خلاف ہے۔ جب مجھے کوئی چیز پسند نہ آئے اور میں اُسے نہ کروں تو میری یہ کارروائی ستیہ گرہ یعنی روحانی طاقت کے کام میں لانے کے مترادف ہے۔ مثال کے طور پر سرکار نے کوئی ایسا قانون بنایا جو مجھ پر لاگو ہوتا ہے لیکن وہ مجھے

پسند نہیں۔ اب اگر میں سرکار پر حملہ کر کے یعنی حیوانی طاقت کا استعمال کر کے سرکار کو اُس کی تنسیخ کے لئے مجبور کروں تو وہ جسمانی طاقت کا استعمال ہوگا۔ اس کے برعکس میں اس قانون کو منظور ہی نہ کروں اور اس کی نافرمانی کے لئے مجھے جو کچھ سزا ملے اُسے بخوشی منظور کر لوں تو ایسا کرنا ستیہ گرہ یعنی روحانی طاقت کا استعمال کرنا ہے۔ اس میں دوسروں کو نہ ستا کر میں خود تکلیف اُٹھاتا ہوں

ہر ایک شخص اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ دوسروں کو ستانے کی نسبت خود تکلیف اُٹھانا بدرجہا بہتر ہے۔ پھر اگر کوئی کسی غلط اصول کے لئے ستیہ گرہ کرے تو اس کی سزا اُسے خود ہی بھگتنی پڑے گی۔ اس کی غلطی کے لئے دوسروں کو تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی۔ دنیا میں ایسے بہت سے واقعات ہوئے ہیں جن کے غلط ہونے کا ثبوت انسان کو بعد میں ملا ہے۔ اس امر کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ فلاں کام ٹھیک ہے اور فلاں غلط۔ جب تک انسان کسی کام کو یقیناً بُرا نہیں سمجھتا تب تک وہ اُسے کرتا رہتا ہے۔ کسی بات کو بُرا مان کر اُسے نہ کرنا ستیہ گرہ ہے اور اس کے لئے دُکھ سہنا ہی ستیہ گرہ کی کامیابی کی کنجی ہے

سوال: تب تو آپ قانون کی خلاف ورزی کریں گے۔ یہ تو ایک بغاوت ہے۔ ہم لوگ تو ہمیشہ قانون کی پابندی کرتے چلے آئے ہیں لیکن آپ تو انتہا پسندوں EXTREMISTS کو بھی مات کر گئے کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق تو ہمیں قانون کا احترام کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر قانون خراب ہو تو ہمیں تشدد کا استعمال کر کے بھی قانون بنانے والوں کو بھگا دینا چاہیئے۔

جواب: میں انہیں مات کرتا ہوں یا نہیں، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ ہمیں تو حق کی تلاش ہے اور اُسی پر چلنا چاہتے۔ قانون کا احترام کرنے کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ ہم ستیہ گرہی ہیں۔ کوئی قانون پسند نہ آنے پر ہم قانون بنانے والوں کا سر نہیں پھوڑتے بلکہ اُس کی منسوخی کے لئے سول نافرمانی کر کے ہم خود تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ ہر ایک اچھے اور بُرے قانون کا احترام کرنا تو بالکل عجیب بات ہے۔ ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں ہے۔ گذشتہ زمانے میں جو قانون لوگوں کو پسند نہ آتے تھے، وہ ان کی خلاف ورزی کر کے سزا بھگت لیتے تھے۔

ہر ایک قانون کو ماننا تو ہماری سچی مردانگی کے خلاف ہے۔ یہ ایک قسم کا اخلاقی گناہ ہے اور سچ پوچھو تو غلامی اور بے بسی کی علامت ہے۔ اگر کوئی سرکاری قانون ہمیں ننگا ہو کر ناچنے کو کہے تو کیا ہم ایسا کریں گے؟ ہر ایک سچا ستیاگرہی ایسے بیہودہ قانون کو ماننے سے صاف انکار کر دے گا۔ لیکن ہم اس قدر اپنے آپ کو بھلا چکے ہیں اور سچائی سے اس قدر دُور ہٹ گئے ہیں کہ کوئی قانون ہمیں خواہ کتنا ہی سچ بتاتا ہو، ہم اس کو ماننے لگ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے لوگوں کی نظروں میں رُسوا اور ذلیل ہو گئے ہیں۔

جس انسان کو اپنی مردانگی کا علم ہے وہ خدا کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتا۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی اس کے لئے لازمی نہیں ہوتی۔ خود سرکار یہ نہیں کہتی کہ "تمہیں ایسا کرنا ہی پڑے گا" بلکہ یہ کہتی ہے کہ "تم ایسا نہیں کرو گے تو سزا پاؤ گے"۔ چونکہ انتہائی جہالت میں ہم پڑے ہوئے ہیں، اس لئے ہم مان لیتے ہیں کہ ہر قانون کا احترام ہمارے لئے ضروری ہی نہیں بلکہ ہمارا اخلاقی اور مذہبی فرض ہے۔ اگر ایک بار انسان یہ محسوس کر لے کہ نکمّے اور فضول معلوم ہونے والے قوانین کی پابندی ایک گناہ ہے اور یہ ایک نامردی کی نشانی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مطیع اور غلام نہیں رکھ سکتی۔ یہی سوراج کی کنجی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ اقلیت اکثریت کی ہر بات کے آگے سر تسلیم خم کرے۔ میرے خیال میں یہ ایک وہم ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں اکثریت کی کہی ہوئی بات غلط نکلی اور اقلیت راہِ راست پر نظر آئی۔ ہر ایک اصلاح کا کام پہلے پہل تھوڑے سے آدمی ہی شروع کرتے ہیں۔ ٹھگوں کے گروہ میں بہت سے لوگ یہی کہیں گے کہ ٹھگ بننا اچھا ہے تو کیا ایک بھلا آدمی بھی ٹھگ بن جائے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح جب تک یہ وہم رہے گا کہ سرکار کے ہر اچھے اور بُرے قانون کا احترام اور پابندی کرنی ضروری ہے تب تک ہم غلام بنے رہیں گے۔ ایسے وہم کو صرف ستیہ گرہی ہی دور کر سکتا ہے۔

حیوانی طاقت یعنی گولے بارود سے کام لینا تو ستیہ گرہ کے خلاف ہے کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو بات ہمیں پسند ہے اُسے ہم اپنے مخالف پر زبردستی ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ اگر ظلم اور تشدد جائز ہے تو ہمارا مخالف بھی اس امر کا حق رکھتا ہے کہ وہ بھی حیوانی طاقتوں کے بل بوتے ہم سے اپنی بات منوائے۔ اس طرح ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے اور ایک دوسرے کے نزدیک نہیں آ سکتے۔ ہماری حالت کولہو کے بیل کی طرح رہتی ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھے رہنے کے سبب ہم بھلے ہی سوچتے رہیں کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں لیکن ہم وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔ جو لوگ برائی کے دشمن ہیں اور اُسے دور کرنے کے خواہش مند ہیں، اُن کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ستیہ گرہ کا راستہ ہے۔ اگر وہ اس راستے پر نہیں چلیں گے تو ضرور بھٹک جائیں گے۔

سوال: جو کچھ آپ نے فرمایا، اُس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کمزوروں کے لئے ستیاگرہ بڑے کام کی چیز ہے لیکن وہی لوگ جب طاقت ور ہو جائیں گے تو وہ بھی گولے بارود سے کام لے سکتے ہیں۔

جواب: یہ تو آپ بڑی نا سمجھی کی بات کرتے ہیں۔ ستیہ گرہ یعنی روحانی طاقت کا تو کوئی طاقت مقابلہ کر ہی نہیں سکتی۔ اگر یہ تشدد کی طاقت سے زیادہ کارگر ہے تو پھر اُسے کمزوروں کا ہتھیار کیونکر کہا جا سکتا ہے۔

ایک ستیہ گرہی جس ہمت اور دلیری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ تشدد پر یقین رکھنے والے ایسی جرأت نہیں دکھا سکتا۔ کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ کوئی کمزور آدمی قانون توڑ سکتا ہے؟ انتہا پسند تو تشدد کے استعمال میں یقین رکھتے ہیں پھر وہ کیوں قوانین کی پابندی کی تلقین کرتے ہیں؟ میں اُن پر الزام نہیں لگاتا۔ وہ کوئی دوسری بات کر ہی نہیں سکتے۔ انگریزوں کو نکالنے کے بعد جب وہ خود حاکم بن جائیں گے تو وہ مجھ سے اور آپ سے قوانین کی پابندی کی توقع رکھیں گے۔ اُن کے خیال میں یہی ٹھیک ہے۔ اس کے برعکس ستیاگرہی کی نظر میں جو قانون اچھا نہ ہوگا وہ اس کی پابندی سے صاف انکار کر دے گا۔ خواہ اُسے توپ ہی سے کیوں نہ اُڑا دیا جائے۔

آپ کیا خیال کرتے ہیں یہ توپ چلا کر ہزاروں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں بہادری ہے؟ یا خود توپ کے سامنے سینہ تان کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے میں؟ جو سر ہتھیلی پر لئے پھرتا ہو، بہادر وہ ہے یا وہ جو دوسروں کی موت اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے؟ یہ یقین جانئے کہ ڈرپوک اور نامرد انسان کبھی ستیہ گرہی نہیں کہلا سکتا۔ البتہ اس امر کو میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایک دبلا پتلا اور جسمانی طور پر کمزور انسان بھی سچا ستیہ گرہی بن سکتا ہے۔ ستیہ گرہ ایک آدمی بھی کر سکتا ہے اور لاکھوں بھی۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی ستیہ گرہ کر سکتی ہیں۔ اس کے لئے فوج تیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس نے اپنے من کو قابو میں کر لیا وہ

ستیہ گرہی بن گیا۔ بس وہ جنگل کے بادشاہ کی طرح نڈر ہو گیا۔ اُس کی ایک گرج سے دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ ستیہ گرہ ایک ایسی تلوار ہے جس کی سب طرف دھار ہے۔ اُسے جیسا چاہیں ویسا کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اس کا استعمال کرنے والا اور اُسے جس کے خلاف استعمال کیا جائے، دونوں یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک قطرہ لہو گرائے بغیر وہ کارگر ثابت ہوتی ہے۔ اُسے نہ کبھی زنگ لگتا ہے اور نہ ہی وہ چرائی جا سکتی ہے۔ اس کو چلانے والے کبھی تھکاوٹ محسوس ہی نہیں کرتے۔ ستیہ گرہی کی تلوار کو میان کی بھی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ اُسے کوئی چھین ہی نہیں سکتا۔ اگر آپ اب بھی ستیہ گرہ کو کمزوروں کا ہتھیار خیال کریں تو یہ سچ مچ بڑے تعجب کی بات ہے۔

سوال: آپ کے کہنے کے مطابق ستیہ گرہ ہندوستان کا خاص ہتھیار ہے تو کیا ہندوستان میں کبھی توپوں سے کام نہیں لیا جائے گا؟

جواب: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہندوستان کے تھوڑے سے راجاؤں ہی کو ہندوستان خیال کرتے ہیں۔ میرا ہندوستان تو کروڑہا کسانوں کا ہندوستان ہے جس پر راجاؤں اور ہم سب کی زندگی کا دارومدار ہے۔ راجے مہاراجے تو ہتھیاروں کا استعمال کریں گے ہی، کیونکہ ان کی تو چال ہی ہو گئی ہے۔ انہیں تو حکم چلانا ہے۔ لیکن حکم بجانے والوں کو تشدد کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں رہتی اور دنیا میں حکم بجانیوالوں کی تعداد ہی زیادہ ہوتی ہے۔ انہیں یا تو حیوانی طاقت کا استعمال سیکھنا چاہیئے یا رُوحانی طاقت سے کام لینا چاہیئے۔ حیوانی طاقتوں کے زیر اثر راعی اور رعایا دونوں پاگل بن جاتے ہیں۔ لیکن جہاں رُوحانی طاقت یعنی ستیہ گرہ کی تعلیم مل گئی وہاں راجہ کا ظلم اس کی تلوار کی نوک سے آگے نہیں جا سکتا، کیونکہ سچا انسان بے ہودہ قوانین کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔ کسانوں پر کبھی تلوار کی طاقت سے قابو نہیں پایا گیا اور نہ کبھی پایا جا سکتا ہے۔ انہیں نہ تو تلوار چلانا آتا ہے اور نہ وہ دوسروں کے تلوار چلانے سے ڈرتے ہی ہیں۔ جس ملک کے باشندوں کو موت کا خوف نہیں ستاتا، سچ مچ وہی لوگ ویر اور بہادر ہوتے ہیں۔ موت کا خوف دُور ہو جانے پر دنیا کا کوئی خوف باقی نہیں رہتا۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ ہو لیکن جو لوگ حیوانی طاقتوں پر لٹو نظر آتے ہیں، اُن کے لئے مبالغہ آمیزی نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں اور راج کاج میں برابر ستیہ گرہ سے کام لیا ہے۔ جب حاکم ظلم سے کام لیتا ہے تبھی لوگ ناراض ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی ستیہ گرہ ہے۔

اس موقع پر مجھے ایک مثال یاد آگئی۔ ایک دفعہ ایک ریاست میں وہاں کے حاکم کی طرف سے ایک حکم نامہ جاری ہوا جو وہاں کے لوگوں کو پسند نہ تھا۔ اس پر ناراض ہو کر انہوں نے گاؤں کو خالی کرنا شروع کر دیا۔ تب حاکم گھبرایا اور لوگوں سے معافی مانگ کر اس نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ ہندوستان میں اس قسم کے کئی واقعات ہوئے ہیں۔ جہاں لوگوں کی زندگی کا ستیہ گرہ ہی ایک اصول ہو وہاں سچا سوراج لایا جا سکتا ہے اور جہاں ایسی حالت نہ ہو وہاں جہالت، بے بسی اور غلامی ہی کا دور دورہ رہے گا۔

سوال: تب تو آپ یہ کہیں گے کہ ہمیں جسمانی طور پر مضبوط بننے کی ضرورت نہیں۔

جواب: میں آپ کے خیال کی ہرگز تائید نہیں کر سکتا۔ جسمانی تربیت کے بغیر ستیا گرہی بننا بہت مشکل ہے کیونکہ

جس شخص نے نفسانی خواہشوں کا غلام بن کر اپنے آپ کو لاغر اور کمزور بنادیا ہے، اس کا دل بھی کمزور ہو جاتا ہے اور جہاں دل کمزور ہو وہاں روحانی طاقت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ کمسنی کی شادی اور عیش و آرام سے زندگی بسر کرنے کی عادت کو چھوڑ کر ہمیں اپنے آپ کو جسمانی طور پر خوب مضبوط بنانا چاہیے۔ ایک کمزور اور مریل آدمی کو اگر میں توپ کے منہ میں جانے کے لئے کہوں تو دنیا میرا مذاق اڑائے گی۔

# مختلف مذاہب کا مطالعہ

میرے قومی خدمت میں محو ہو جانے کا اصلی سبب معرفتِ نفس کی آواز تھی۔ میں نے اپنا دین و مذہب خدمت کو بنا لیا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ معرفت الٰہی کا ذریعہ صرف خدمت ہی ہے اور خدمت کے معنی میں ہندوستان کی خدمت سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس کا موقع مجھے خود بخود بے تلاش کئے مل گیا اور میں اسی کے لئے موزوں بھی تھا۔ میں جنوبی افریقہ سیاحت کا لطف اٹھانے، کاٹھیاواڑ کی سازشوں سے نجات پانے اور روزی کمانے کی نیت سے آیا تھا مگر جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے یہاں آکر خدا کی تلاش میں اور معرفتِ نفس کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

عیسائی دوستوں نے میرے دل میں ذوقِ معرفت کو ابھارا تھا اور یہ ذوق روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ میرے دوستوں کو اس معاملے میں اتنا انہماک تھا کہ اگر میں بے پروائی بھی کرتا تو بھی وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتے۔ ڈربن میں جنوبی افریقہ کے مشن کے سردار مسٹر اسپنسر والٹن کو میرے اس ذوق کا پتہ چل گیا اور انہوں نے مجھ سے راہ و رسم پیدا کی۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے عزیزوں کی طرح سمجھنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس ملاقات کی بنا میرے اور پریٹوریا کے عیسائیوں کے تعلقات تھے۔ مسٹر والٹن کی طبیعت کا ایک خاص انداز تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے مجھ سے عیسائی مذہب اختیار کرنے کے لئے نہیں کہا، لیکن انہوں نے اپنی زندگی کتاب کی طرح کھول کر میرے سامنے رکھ دی اور مجھے اپنے کردار کے مشاہدے کا پورا موقع دیا۔ ان کی بیوی بڑی نیک اور قابل تھیں .... مجھے مسٹر والٹن کا انکسار، استقلال اور ذوقِ عمل بہت پسند آیا اور ہم دونوں میں اکثر ملاقات ہونے لگی۔

یہ دوستی میرے دل میں مذہب کی چنگاری کو دہکاتی رہی .... مذہبی مسائل پر میری خط و کتابت اب بھی جاری تھی۔ رائے چند بھائی برابر میری رہنمائی کر رہے تھے۔ ایک دوست نے مجھے نرمد شنکر کی کتاب "دھرم وچار" بھیجی۔ اس کا دیباچہ میرے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ میں اس شاعر کی لاابالی طرز زندگی کا حال سن چکا تھا۔ دیباچے میں یہ پڑھ کر کہ مذہبی کتابوں کے مطالعے سے اس کی زندگی کی کایا پلٹ ہو گئی میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ مجھے یہ کتاب اتنی پسند آئی کہ میں نے اس کا ایک ایک حرف نہایت غور سے پڑھا۔ میں نے میکس مُلر کی کتاب "ہندوستان ہمیں کیا سکھاتا ہے" اور اس کا اپنشد کا ترجمہ جو انجمن تھیوسافی کی طرف سے شائع ہوا تھا، بڑے شوق سے پڑھا۔ ان سب چیزوں سے میرے دل میں ہندو دھرم کا احترام بڑھ گیا اور اس میں مجھے بہت سی خوبیاں نظر آنے لگیں۔ مگر اس کے سبب سے میرے دل میں دوسرے مذہبوں

کی طرف سے کسی قسم کا تعصب پیدا نہیں ہوا۔ میں نے واشنگٹن رونگ کی کتاب حضرت محمدؐ اور اُن کے خلفاء کی سیرت اور کارلائل کا مقالہ پیغمبر اسلام کی مدح میں پڑھا۔ ان کتابوں کی بدولت میری نظر میں آنحضرتؐ کی عظمت اور زیادہ ہوگئی ایک اور کتاب "اقوالِ زرتشت" بھی میری نظر سے گذری۔

اس طرح مختلف مذہبوں سے میری واقفیت بڑھ گئی۔ اس مطالعے سے مجھے مشاہدۂ نفس کا شوق ہوگیا اور اس بات کی عادت پڑگئی کہ جو بات میرے دل کو لگے اُس پر عمل کیا کروں۔ چنانچہ ہندو دھرم کی بعض کتابوں کو پڑھنے کے بعد میں یوگ کی کچھ ریاضتیں جس طرح میری سمجھ میں آئیں، کرنے لگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس طرح کام نہیں چلتا اور یہ طے کیا کہ جب ہندوستان واپس جاؤں گا تو کسی واقف کار کی مدد سے یہ ریاضتیں کروں گا۔

میں نے ٹالسٹائی کی تصانیف کا بھی غور سے مطالعہ کیا۔ اس کی کتاب "کتابِ مقدس کا خلاصہ" "راہِ عمل" کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ مجھے رفتہ رفتہ یہ یقین ہونے لگا کہ عالمگیر محبت کا اصول نامحدود امکانات رکھتا ہے۔

# وفاداری کا جوش

برطانوی آئین کا جتنا وفادار میں تھا، اُتنا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ اس وفاداری کی تہہ میں حق کی محبت تھی۔ مجھ سے وفاداری یا کسی اور نیکی کا جھوٹا اظہار کبھی نہ ہوسکا۔ نٹال میں میں جن جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا، نیشنل اینتھم (برطانیہ کا قومی گیت جس میں بادشاہ کی سلامتی کی دعا مانگی جاتی تھی) گایا جاتا تھا۔ میں اس زمانے میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس گیت میں شریک ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھے برطانوی حکومت کی خرابیوں کا علم نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود میں اسے مجموعی حیثیت سے قابلِ قبول سمجھتا تھا۔ اُس زمانے میں میرا خیال یہ تھا کہ مجموعی حیثیت سے برطانوی حکومت رعایا کے لئے مفید ہے۔

رنگ ونسل کا جو تعصب مجھے جنوبی افریقہ میں نظر آیا اُسے میں برطانوی روایات کے منافی سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ محض مقامی اور عارضی چیز ہے اس لئے میں تاجِ برطانیہ کی وفاداری میں انگریزوں سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے بڑی محنت سے نیشنل انتھم (قومی گیت) کا راگ سیکھا اور جب کبھی یہ گیت گایا جاتا تھا، میں بھی ساتھ دیتا تھا۔ بغیر تصنع اور نمائش کے وفاداری کے اظہار کا جو موقع ملتا تھا، میں اُس میں ضرور شرکت کرتا تھا۔

میں نے ساری عمر میں اس وفاداری سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کبھی اس کی بدولت اپنے ذاتی اغراض پورے کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ میرے لئے ایک فرض سا تھا اور میں بغیر کسی معاوضے کے اُسے انجام دیتا تھا۔

جب میں ہندوستان پہنچا تو یہاں ملکۂ وکٹوریا کی جُبلی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجکوٹ میں جو کمیٹی اس مقصد کے لئے بنائی گئی تھی، مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ میں نے یہ دعوت قبول کرلی مگر مجھے یہ شبہ تھا کہ جشن میں زیادہ تر نمائش سے کام لیا جائے گا۔ اس میں بہت ریاکاری نظر آئی جس سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ مجھے کمیٹی میں رہنا چاہیے یا نہیں۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے حصے کا کام ایمانداری سے انجام دینے پر قناعت کرنا چاہیئے۔

... میں نے نیشنل انتھم اپنے گھر کے بچّوں کو بھی یاد کرادیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ گیت راجکوٹ ٹریننگ اسکول

کے طالب علموں کو بھی سکھایا تھا مگر یہ خیال نہیں کہ یہ جیل کا واقعہ ہے یا ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے زمانے کا۔ آگے چل کر اس کے الفاظ میرے کانوں کو ناگوار ہونے لگے۔ جوں جوں میرا 'اہنسا' کا تصور پختہ ہوتا گیا، میری احتیاط اپنے خیالات اور الفاظ کے بارے میں بڑھتی گئی۔ اینتھم کا یہ شعر:

" خدا اس کے دشمنوں کو منتشر اور ہلاک کر دے
اُن کی سیاست اُلٹ پلٹ ہو جائے
اور اُن کی مفسدانہ سازشیں ناکام رہیں۔"

خاص طور پر میرے جذبۂ "اہنسا" کے منافی تھے۔ میں نے اپنا یہ خیال ڈاکٹر بوتھ سے ظاہر کیا۔ اُنہوں نے میری رائے سے اتفاق کیا کہ جو شخص 'اہنسا' کا قائل ہے اسے یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا نہیں کرنا چاہئیں۔ یہ کیسے فرض کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کے 'دشمن' ہمیشہ 'مفسد' ہوتے ہیں؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ بادشاہ ہمیشہ حق پر ہو اور اس کے دشمن ناحق پر ہوں؟ ہم خدا سے صرف دُعا کرتے ہیں کہ حقدار کا ساتھ دے۔ ڈاکٹر بوتھ نے میرے خیالات کی تصدیق کی اور اپنی جماعت کے لئے ایک نیا اینتھم تصنیف کیا۔

## جوشِ خدمت

میری وکالت اچھی طرح چل رہی تھی مگر یہ میرے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا۔ مجھے بہت دن سے اس خیال نے بے چین کر رکھا تھا کہ میں اپنی زندگی میں اور سادگی پیدا کروں اور اپنے ہم جنسوں کی کوئی مخصوص خدمت انجام دوں۔ ایک روز میرے پاس ایک کوڑھی آیا۔ میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ اُسے کھانا کھلا کر رخصت کر دوں۔ اس لئے میں نے اسے اپنے گھر ٹھہرا لیا اور اس کی مرہم پٹی اور خبر گیری کرنے لگا مگر اس طرح کب تک کام چلتا۔ نہ تو مجھ میں اتنی استطاعت تھی اور نہ یہ میرا ارادہ تھا کہ اُسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں۔ اس لئے میں نے اُسے پابند مزدوروں کے ہسپتال میں بھیج دیا۔

مگر اس سے مجھے تسکین نہیں ہوئی۔ میری یہ آرزو تھی کہ رفاہِ عام کا کوئی مستقل کام کروں۔ ڈاکٹر بوتھ، سینٹ ایڈاون کی مشن کے سردار تھے۔ یہ بڑے رحمدل آدمی تھے اور مریضوں کا علاج مفت کرتے تھے۔ پارسی رستم جی کی فیاضی کی بدولت ہم نے ڈاکٹر بوتھ کی نگرانی میں ایک خیراتی ہسپتال کھلوایا۔ میں اس ہسپتال میں تیمارداری کی خدمت انجام دینے لگا۔ دوا تقسیم کرنے میں مجھے ایک سے لے کر دو گھنٹے تک لگ جاتے تھے اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اتنا وقت اپنے دفتر کے کام سے بچا کر ہسپتال کے دواخانے میں کمپاؤنڈر کا کام کروں گا۔ وکالت میں مجھے زیادہ تر دفتری کام کرنا پڑتا تھا۔ یعنی پنچایت اور انتقالِ جائداد کا کام۔ کبھی کبھی مجھے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیروی کے لئے بھی جانا پڑتا تھا لیکن اکثر مقدمے سیدھے سادے ہوتے تھے۔ اور مسٹر خان نے جو میرے بعد جنوبی افریقہ آئے تھے اور میرے ساتھ ہی رہتے تھے اس بات کا ذمہ لے لیا کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو ان مقدموں کو سنبھال لیا کریں گے۔ اس طرح مجھے اس چھوٹے سے ہسپتال میں کام کرنے کا وقت مل گیا۔ . .

مجھے بچوں کی تربیت کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ جنوبی افریقہ آنے کے بعد میرے دو لڑکے اور ہو چکے تھے۔ ہسپتال میں کام کرنے سے مجھے ان بچوں کی تربیت میں بڑی مدد ملی۔ مجھے اپنی آزادی پسند طبیعت کی بدولت اکثر تکلیفیں اٹھانا پڑتی تھیں۔ جب میری بیوی کے بچہ ہونے والا تھا تو ہم دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ بہترین طبی امداد حاصل کی جائے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ڈاکٹر اور دوائی نے وقت پر دھوکا دیا تو ہم کیا کریں گے اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ دائی ہندوستانی ہو لیکن تربیت یافتہ دائی کا ملنا ہندوستان ہی میں مشکل ہے۔ پھر آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں کیا حال ہوگا، اس لئے میں نے طبی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا کہ وضع حمل میں آسانی پیدا کرنے کے لئے جو ضروری باتیں ہیں وہ معلوم ہو جائیں.... دوسرے بچے کی پیدائش میرے لئے بڑی آزمائش کا موقع تھا۔ میری بیوی کو دردِ زہ اچانک شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر فوراً نہیں آسکتا تھا اور دائی کے لانے میں بھی دیر ہوئی۔ اگر وہ موجود بھی ہوتی تو اس سے حمل میں کوئی مدد نہ ملتی۔ مجھے خود دائی کا کام کرنا پڑا۔ ڈاکٹر تربھوونداس کی کتاب کا مطالعہ بہت کام آیا۔ میرے اوسان قائم رہے۔ خدا بھی ہراس نہیں ہوئی۔

میرے خیال میں بچے کی مناسب تربیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ والدین اُن کی پرورش اور پرداخت کے اصول جانتے ہوں۔ ان اصولوں کے مطالعے سے ہر ہر قدم پر فائدہ محسوس ہوا۔ اگر میں ان باتوں کو سیکھ کر کام میں نہ لاتا تو میرے بچوں کی عام صحت اتنی اچھی نہ ہوتی جتنی اچھی اب ہے۔ ہمارا دل ایک غلط خیال پر جم گیا ہے کہ بچے کو اپنی زندگی کے پہلے پانچ سال میں کچھ سیکھنا نہیں پڑتا ہے۔ حالانکہ واقعہ بالکل برعکس ہے۔ بچہ پہلے پانچ سال میں جو چیزیں سیکھتا ہے وہ بڑا ہو کر کبھی نہیں سیکھ سکتا۔ بچے کی تعلیم حمل قرار پاتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اس خاص لمحے میں والدین کی جو جسمانی اور ذہنی حالتیں ہوتی ہیں وہ بچے میں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر حمل کے زمانہ میں بھی اس پر ماں کی کیفیتو خواہشوں، مزاج اور طرزِ معاشرت کا اثر پڑتا رہتا ہے۔ ولادت کے بعد بچہ والدین کے حرکات و سکنات کی نقل کرتا ہے اس لئے بہت برسوں تک اس کی نشوونما بالکل انہیں پر منحصر ہوتی ہے۔

جو میاں بیوی ان باتوں کو سمجھ لیں گے وہ کبھی محض اپنی شہوانی خواہش پوری کرنے کے لئے مباشرت نہ کریں گے۔ بلکہ صرف اس وقت ہمبستر ہوں گے جب انہیں اولاد کی خواہش ہو۔ میرے نزدیک یہ خیال انتہائی جہالت پر مبنی ہے کہ جماع بھی کھانے پینے کی طرح جسم کی ایک مستقل ضرورت ہے۔ یہ وہ فعل ہے جس پر دنیا کے وجود کا انحصار ہے اور چونکہ دنیا شاہدِ حقیقی کی بازی گاہ اور اس کے حسن کی جلوہ گاہ ہے اس لئے اس فعل کو راہ پر لگا کر اس سے دنیا کی منظم نشوونما کا کام لینا چاہیئے۔ جس شخص پر یہ حقیقت کھل جائے گی وہ دل میں ٹھان لے گا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، شہوانی خواہش کو ضبط کرنا چاہیئے اور بچوں کی جسمانی، ذہنی اور روحانی فلاح کے طریقے خود سیکھنا اور آئندہ نسلوں کو سکھانا چاہیئے۔

# آزمائش

جہاز گودی پر لائے گئے اور مسافر اُترنے لگے۔ مسٹر ایسکومب نے کپتان سے کہلا بھیجا کہ گاندھی سے کہہ دو۔ ”یورپین تم سے سخت بیزار ہیں۔ تمہاری اور تمہارے خاندان کی جان خطرے میں ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ

تم بیٹھنے وقت جہاز سے اتر و اور گودی کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ٹیٹم کی حفاظت میں گھر جاؤ۔" کپتان نے یہ پیام مجھ سے کہا اور میں اس پر عمل درآمد کرنے پر تیار ہوگیا۔ مگر اسے ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مسٹر لاٹن کپتان کے پاس آئے اور کہنے لگے "اگر مسٹر گاندھی راضی ہوں تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں کمپنی کے مشیر قانونی کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ آپ پر مسٹر ایسکومب کے مشورے کی پابندی لازمی نہیں ہے۔" اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا: "اگر آپ ڈرتے نہ ہوں تو میری رائے ہے کہ آپ کی بیوی اور بچے گاڑی میں رستم جی کے یہاں چلے جائیں۔ ہم آپ پیدل چلیں مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ چوروں کی طرح رات کو شہر میں داخل ہوں۔ میرے خیال میں اب آپ پر حملے کا کوئی

> میرے خیال میں اِس دنیا میں اطمینان کی توقع رکھنا بڑی غلطی ہے۔ یہاں سوائے حق کے یعنی ذات الٰہی کے کسی چیز کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ یہ سارے کھیل جو دنیا کے پردے پر نظر آتے ہیں، چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ کسی کا بھروسہ نہیں، کسی کو ثبات نہیں۔ ہاں اِس پردے کے اندر ایک بلند اور برتر ذات ہے اور وہ سراپا حقیقت ہے۔ خوشا حال اُس کے جو حقیقت کی جھلک دیکھ لے جو حق کا دامن تھام لے۔ حق کی تلاش ہی زندگی کی معراج ہے۔" ——— گاندھی

خطرہ نہیں۔ شہر میں ہر طرف سکون ہے۔ یوروپی منتشر ہو چکے ہیں۔ بہرحال میرے نزدیک آپ کو شہر میں چھپ کر ہرگز نہ جانا چاہیئے۔" میں فوراً راضی ہو گیا۔ میرے بیوی اور بچے گاڑی میں سوار ہو کر حفاظت کے ساتھ رستم جی کے یہاں پہنچ گئے۔ میں کپتان کی اجازت سے مسٹر لاٹن کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ مسٹر رستم جی کا مکان گودی سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔

جیسے ہی ہم کنارے پر پہنچے، چند لڑکوں نے مجھے پہچان لیا اور "گاندھی گاندھی" پکارنے لگے۔ پانچ چھ آدمی اور دوڑ آئے اور انہوں نے لڑکوں کے ساتھ مل کر چلانا شروع کیا۔ مسٹر لاٹن ڈرے کہ کہیں مجمع زیادہ نہ ہو جائے اور انہوں نے ایک رکشا والے کو پکارا۔ مجھے رکشا میں بیٹھنا پسند نہ تھا۔ آج پہلی بار اِس کا اتفاق ہوتا مگر لڑکوں نے مجھے بیٹھنے نہیں دیا۔ اُنہوں نے رکشا والے کو ایسا دھمکایا کہ وہ اپنی جان لے کر بھاگا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے مجمع بھی زیادہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ راستہ بالکل رک گیا۔ پھر انہوں نے مسٹر لاٹن کو پکڑ کر مجھ سے علاحدہ کر دیا۔ اس کے بعد مجھ پر اینٹ پتھر اور گندے انڈوں کی بوچھار کر دی۔ ایک شخص میری پگڑی لے بھاگا اور کچھ لوگ مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگے۔ مجھے غش آنے لگا اور میں ایک مکان کے جنگلے کے سہارے کھڑا ہو گیا کہ ذرا دم لے لوں۔ مگر لوگوں نے اِس کا موقع نہیں دیا۔ انہوں نے وہیں پہنچ کر گھونسے اور مکے مارنا شروع کئے۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ کی بیوی جو مجھ سے واقف تھیں، ادھر سے گذر رہی تھیں۔ یہ بہادر خاتون میری مدد کے لئے آئیں اور اپنی چھتری کھول کر میرے اور مجمع کے درمیان حائل ہو گئیں۔ ان سے لوگوں کا حملہ کچھ کم ہوا، کیونکہ اگر مجھے مارتے تو مسز الیکزینڈر کے بھی چوٹ آتی۔

اِس عرصے میں ایک ہندوستانی لڑکا جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا، دوڑ کر کوتوالی پہنچ گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولس مسٹر الیکزینڈر نے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا کہ مجھے حلقے میں لے کر گھر پہنچا دے۔ یہ سپاہی عین وقت پر

پہنچے۔ کوتوالی ہمارے راستے میں تھی جب ہم وہاں پہنچے تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ تم ہمیں کوتوالی میں پناہ لو، مگر میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کردیا۔ میں نے اُن سے کہا۔ "جب اُن لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو آپ ہی خاموش ہوجائیں گے۔ مجھے اُن کی انصاف پسندی پر اعتماد ہے"۔ پولس کی حفاظت میں بغیر کسی مزید دقت کے رستم جی کے یہاں پہنچ گیا۔ میرا بدن جا بجا سے چھل گیا تھا۔ مگر سوائے ایک جگہ کے کہیں بھی زخم نہیں آیا تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر داری بار بجور صاحب وہیں موجود تھے اور انہوں نے بہت توجہ سے میری مرہم پٹی کردی۔

گھر کے اندر سکون تھا مگر باہر یورپی مکان گھیرے ہوئے تھے۔ رات ہونے والی تھی اور مجمع گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا: "گاندھی کو ہمارے حوالے کردو"۔ بیدار مغز سپرنٹنڈنٹ پولس موقع پر پہنچ گئے اور مجمع کو دھمکا کر نہیں بلکہ پرچا کر قابو میں لانے کی کوشش کررہے تھے۔ لیکن دل میں وہ بھی پریشان تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہلا بھیجا: "اگر آپ اپنے دوست کے گھربار کو اور اپنے خاندان کو اِن لوگوں کے ہاتھوں سے بچانا چاہتے ہیں، تو جیسے میں کہوں، بھیس بدل کر نکل جائیے"۔

اِس طرح ایک ہی دن میں دو متضاد حالتوں سے سابقہ پڑا۔ جب جان کا خطرہ محض خیالی تھا اُس وقت مسٹر لاٹن نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ کھلے بندوں شہر میں جاؤں اور میں نے اسے قبول کیا۔ جب خطرہ سچ مچ آپہنچا تو ایک اور دوست نے مجھے اس کے خلاف رائے دی اور میں نے اُسے بھی قبول کرلیا۔ خدا جانے میں نے یہ اس لئے کیا کہ مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آئی یا اس لئے کہ اپنے دوست کے گھربار کو یا اپنے بیوی بچوں کو خطرے سے بچالوں۔ کون شخص دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ میں اس وقت بھی حق بجانب تھا۔ جب میں نے بقول دوسروں کے، بہادری سے مجمع کا مقابلہ کیا اور اُس وقت بھی جب میں بھیس بدل کر ان کے مقابلے سے بھاگ نکلا۔

جو یہ باتیں ہوچکیں اُن کی اچھائی یا بُرائی کا فیصلہ کرنا فضول ہے۔ جو فائدہ ہے وہ اس میں ہے کہ انسان انہیں سمجھے اور اگر ممکن ہو تو اُن سے آئندہ کے لئے سبق حاصل کرے۔ پہلے سے یہ بتانا دُشوار ہے کہ فلاں شخص فلاں موقع پر کیا کرے گا اور پھر کسی شخص کے ظاہری افعال سے اُس کی نیت پر حکم لگانا بھی گویا ناکافی شہادت کی بنا پر فیصلہ کرنا ہے۔

بہرحال بھاگنے کی تیاری میں میں اپنی چوٹوں کی تکلیف کو بھول گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کے مشورے کے مطابق میں نے ایک ہندوستانی کانسٹیبل کی وردی پہن لی اور سر پر دھات کی ایک طشتری رکھ کر اُس پر مدراسی صافہ لپیٹ لیا کہ خود کا کام دے سکے۔ میرے ساتھ دو سُراغ رساں تھے جن میں سے ایک نے ہندوستانی تاجر کا بھیس بدلا اور چہرے کو رنگ کر ہندوستانیوں کی سی شکل بنالی تھی۔ دوسرے کا بھیس مجھے یاد نہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی گلی سے ہوکر قریب کی دکان پر پہنچے اور بوروں کے ڈھیر میں سے جو گودام میں لگا ہوا تھا، گذر کر دکان کے دروازے سے نکل گئے۔ یہاں مجمع میں گھس بیٹھ کر گلی کے نکڑ پر اس گاڑی تک پہنچے جو میرے لئے کھڑی تھی۔ اس گاڑی نے ہمیں کوتوالی میں پہنچا دیا، جہاں تھوڑی دیر پہلے الیگزینڈر نے مجھ سے پناہ لینے کو کہا تھا۔ میں نے اُن کا اور سُراغ رسانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اِدھر میں بھاگ رہا تھا اور اُدھر مسٹر الیگزینڈر یہ بول گا کر مجمع کو بہلا رہے تھے:

پھانسی دے دو گاندھی کو
کھٹے سیب کے پیڑ پر

جب انہیں معلوم ہوگیا کہ میں حفاظت کے ساتھ کوتوالی پہنچا دیا گیا ہوں تو انہوں نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بھئی تمہارا شکار تو قریب کی دکان سے ہو کر نکل گیا۔ میری صلاح یہ ہے کہ اب تم گھر کی راہ لو۔" بعض لوگ بگڑ گئے بعض ہنسنے لگے اور بعض کو اس بات پر یقین نہیں آیا۔

سپرنٹنڈنٹ نے کہا: "اچھا اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو اپنی طرف سے دو ایک نمائندے مقرر کر دو۔ میں انہیں گھر کے اندر لے جانے پر تیار ہوں۔ اگر وہ گاندھی کو ڈھونڈ نکالیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔ لیکن اگر وہ نہ ملا تو پھر تم کو منتشر ہونا پڑے گا۔ تم کوئی رستم جی کا مکان ڈھانے یا گاندھی کے بیوی بچوں کو ستانے تھوڑے آئے ہو۔"

مجمع نے اپنے نمائندے گھر کی تلاشی لینے کے لئے بھیجے۔ وہ تھوڑی دیر میں ناکام واپس آئے اور مجمع خدا خدا کر کے منتشر ہوا۔ اکثر لوگ سپرنٹنڈنٹ کی تعریف کر رہے تھے کہ انہوں نے بڑی موقع شناسی سے کام لیا اور بعض غصے سے ہونٹ چبا رہے تھے۔

مسٹر چیمبرلین آنجہانی نے جو اس زمانے میں وزیر نوآبادیات تھے، نٹال کو تار کے ذریعے ان لوگوں پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ مسٹر ایسکومب نے مجھے بلایا اور کہا: "مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کو یہ اذیتیں اٹھانی پڑیں۔ آپ یقین کیجئے کہ مجھے آپ کی خفیف سی تکلیف بھی گوارا نہیں۔ بے شک آپ کو یہ حق تھا کہ آپ مسٹر لاٹن کے مشورے کو مانیں اور بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کریں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ میری رائے پر عمل کرتے تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ اگر آپ حملہ کرنے والوں کو شناخت کر سکیں تو میں اس کے لئے تیار ہوں کہ انہیں گرفتار کرا کے ان پر مقدمہ چلاؤں۔ مسٹر چیمبرلین نے بھی مجھ سے یہی خواہش کی ہے۔"

میں نے جواب دیا: "میں کسی پر مقدمہ چلانا نہیں چاہتا۔ ممکن ہے کہ میں ان میں سے دو ایک کو پہچان لوں، مگر انہیں سزا دینے سے کیا فائدہ ہوگا؟ اور میرے نزدیک ان لوگوں کا کوئی قصور بھی نہیں۔ انہیں یہ یقین دلایا گیا کہ میں نے ہندوستان میں نٹال کے یوروپیوں کے متعلق مبالغہ آمیز روایتیں بیان کیں اور انہیں بدنام کر دیا۔ ان باتوں کو سن کر انہیں طیش آ گیا تو کونسی تعجب کی بات ہے؟ قصور جو کچھ ہے وہ ان کے لیڈروں کا یعنی دوسرے الفاظ میں خود آپ کا ہے۔ آپ ان کی صحیح رہنمائی کر سکتے تھے مگر آپ نے خود رپورٹر کے بھروسے پر یہ فرض کر لیا ہے کہ میں نے ضرور مبالغے سے کام لیا ہوگا۔ میں کسی سے مواخذہ کرنا نہیں چاہتا مجھے یقین ہے کہ جب صحیح حالات معلوم ہوں گے تو لوگوں کو اپنی حرکتوں پر ندامت ہوگی۔"

مسٹر ایسکومب نے کہا: "اگر آپ کا کوئی حرج نہ ہو تو یہ الفاظ مجھے لکھ کر دے دیجئے کیونکہ مجھے مسٹر چیمبرلین کو اس مضمون کا تار دینا پڑے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ عجلت میں بے سوچے سمجھے کوئی تحریر دیں۔ آپ کا جی چاہے تو آخری فیصلہ کرنے سے پہلے مسٹر لاٹن سے اور دوسرے دوستوں سے مشورہ کر لیجئے۔ یہ میں ضرور مانتا ہوں کہ اگر آپ حملہ آوروں کو سزا دلانے کے حق سے دست بردار ہو جائیں تو مجھے امن قائم کرنے میں بڑی مدد ملے گی اور آپ کی بھی بڑی نیک نامی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کی نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے جو کچھ فیصلہ کرنا تھا میں نے آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی کر دیا تھا۔ یہ میرے عقیدے کے خلاف ہے کہ میں حملہ آوروں پر مقدمہ چلاؤں اور میں اسی وقت اپنا فیصلہ لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے

اپنا بیان لکھا اور اُن کے حوالے کیا۔

# طُوفان کے بعد سُکون

مگر (نٹال میں) اِس واقعے سے جہاں ہماری قوم کی وقعت بڑھی، وہاں مخالفوں کے دلوں میں تعصّب کی آگ بعد بھی بھڑک اُٹھی۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستانی مردانہ وار مقابلہ کر سکتا ہے تو لوگ ہندوستانیوں کو خطرناک سمجھنے لگے۔ نٹال کی مجلسِ وضعِ قوانین میں دو قانون کے مسودے پیش ہوئے جن میں ایک کا مقصد ہندوستانی تاجروں کے مفاد کو پامال کرنا اور دوسرے کا مقصد ہندوستانیوں کے داخلے کو محدود کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے اس جدوجہد کی بدولت جو ہم نے ووٹ کے حق کے لئے کی تھی، یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ آئندہ کوئی قانون خاص ہندوستانیوں کے خلاف نہیں ہو سکے گا۔ یعنی قانون میں رنگ اور نسل کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ مذکورہ بالا مسودوں کے الفاظ ایسے رکھے گئے کہ اُن کا اطلاق سب پر ہو سکے۔ مگر ان کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ نٹال کے ہندوستانی باشندوں پر مزید قیود حاصل کی جائیں۔

اِن مسوداتِ قانون کی بدولت میرا قومی کام بہت بڑھ گیا اور ہندوستانیوں کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے فرائض کا احساس پیدا ہو گیا۔ ان مسودوں کے ہندوستانی زبان میں ترجمے ہوئے اور تشریحیں کی گئیں تاکہ لوگ ان کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہم نے وزیر نوآبادیات کو اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی مگر انہوں نے مداخلت کرنے سے انکار کیا۔

اب میرا وقت زیادہ تر قومی کاموں میں صرف ہونے لگا۔ مِن سکھ لال جی جن کا میں اُوپر ذکر کر چکا ہوں، ڈربن میں موجود تھے وہ میرے ساتھ رہنے لگے اور چونکہ اُن کا وقت قومی کاموں کے لئے وقف تھا، اِس لئے اُن کے سبب سے میرا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

میری عدم موجودگی میں سیٹھ آدم جی میاں خان نے سکریٹری کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے تھے۔ اُنہوں نے ممبروں کی تعداد بڑھائی تھی اور نٹال انڈین کانگریس کے پاس ایک ہزار پونڈ سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔ ہندوستانی مسافروں کے خلاف مظاہرے نے اور مسودوں نے جو بیداری پیدا کر دی تھی اس سے میں نے بہت فائدہ اُٹھایا۔ بہت سے لوگ ممبر ہو گئے اور سرمایے کی تعداد پانچ ہزار پونڈ تک پہنچ گئی۔ میں چاہتا تھا کہ کانگریس کے لئے مستقل سرمایہ جمع ہو جائے جس سے جائداد خرید لی جائے اور جائداد کی آمدنی خرچ کی جائے مجھے کسی قومی ادارے کے انتظام کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ میں نے اپنی تجویز اپنے رفیقوں کے سامنے پیش کی اور اُنہوں نے اسے پسند کیا۔ جو جائداد خریدی گئی تھی وہ کرائے پر اُٹھا دی گئی اور اس کی آمدنی سے معمولی اخراجات اچھی طرح چلنے لگے۔ جائداد کے لئے معقول ٹرسٹی مقرر کر دیئے گئے۔ یہ جائداد اب تک موجود ہے مگر اِن کی بدولت آپس میں نزاع پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس کی آمدنی عدالت میں جمع ہوتی ہے۔

یہ افسوسناک صورتِ حال میرے جنوبی افریقہ سے چلے آنے کے بعد پیدا ہوئی لیکن میرا خیال قومی اداروں کے لئے مستقل سرمایہ رکھنے کے بارے میں اِس نزاع سے بہت پہلے بدل چکا تھا اور اب متعدد

قومی اداروں کا وسیع تجربہ حاصل کرنے کے بعد میرا عقیدہ ہو گیا ہے کہ ان اداروں کو مستقل سرمایہ کی مدد سے چلانا اچھا نہیں ہے۔ قومی ادارہ وہ ہے جو قوم کی مرضی سے اور اس کے روپے سے چلایا جائے۔ جب ایسا ادارہ قوم کی مدد سے محروم ہو جائے تو اُسے باقی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ جو ادارے مستقل سرمایہ سے چلتے ہیں اُن سے کوئی اکثر رائے عامہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے ملک میں روزمرہ اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ بعض نام نہاد مذہبی وقف ایسے ہیں جنہوں نے اپنے حسابات شائع کرنا موقوف کر دیا ہے۔ ٹرسٹی مالک بن بیٹھے ہیں اور وہ اپنے آپ کو کسی کا ماتحت نہیں سمجھتے۔ میرے نزدیک قومی اداروں کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان چیزوں کی طرح جو فطرت کی گود میں پلتی ہیں، اپنی غذا روز کے روز حاصل کر لیا کریں۔

مگر میں ایک غلط فہمی کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خطاب اُن اداروں سے نہیں جن کے لئے مستقل عمارت ہونا لازمی ہے۔ میرے کہنے کا منشا صرف یہ ہے کہ معمولی خرچ ان چندوں سے چلنا چاہیئے جو لوگ اپنی خوشی سے ہر سال دیا کریں۔ جنوبی افریقہ کے ستیہ گرہ کے زمانے میں ان خیالات کی تصدیق ہوئی۔ یہ شاندار جنگ جس میں لاکھوں روپے صرف ہوئے صرف چھ سال تک بغیر مستقل سرمایہ کے جاری رہی مجھے بعض ایسے موقعے یاد ہیں جب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر کل چندہ نہیں ملا تو کیا انجام ہوگا۔

## سادہ زندگی

میں نے عیش و آرام کی زندگی شروع کی تھی، مگر یہ صرف چند روز رہی۔ گو میں نے اپنے مکان کو آراستہ کرنے میں بہت اہتمام کیا تھا مگر مجھے اس سے کوئی وابستگی نہیں تھی۔

تھوڑے ہی عرصے میں میں نے مصارف میں کتر بیونت شروع کر دی۔ میرا دھوبی ایک تو دھلائی بہت لیتا تھا، دوسرے وقت پر کپڑے نہیں دیتا تھا۔ اس لئے دو تین درجن قمیص اور کالر بھی میرے لئے کافی نہیں ہوتے تھے کالر روز بدلنا پڑتا تھا اور قمیص روز نہیں تو ایک دن بیچ۔ اس سے بہت خرچ پڑ جاتا تھا جو میرے خیال میں بالکل فضول تھا۔ اس خرچ کو بچانے کے لئے میں نے کپڑے دھونے کا سامان خریدا اور اس مضمون پر کتاب خرید کر پڑھی۔ اس طرح میں نے کپڑے دھونا سیکھ لیا اور اپنی بیوی کو بھی سکھا دیا۔ اس سے میرا کام تو مزید بڑھ گیا مگر ایک نئی چیز تھی اس لئے لطف بھی آتا تھا۔

میں نے جو پہلا کالر ہاتھ سے دھویا تھا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں نے کالر میں کلف ضرورت سے زیادہ تھوپ دیا۔ استری کافی گرم نہیں کی اور جلنے کے خوف سے کالر کو اچھی طرح دبایا بھی نہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کالر خاصا سخت تو ہو گیا مگر اس میں سے بیچ ٹپکتی جاتی تھی۔ یہی کالر لگا کر عدالت میں گیا۔

میرے ہم چشم بیرسٹروں نے میرا مذاق اُڑایا۔ مگر مجھے اس زمانے میں بھی اس کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ لوگ مجھ پہ ہنسیں۔۔۔

میں نے کہا۔" بھئی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے ہاتھ سے کالر دھونے کا یہ پہلا موقع ہے اس لئے بیچ بیچارہ

گئی، مگر میرا اس میں کوئی ہرج نہیں اور یہ فائدہ بھی ہے کہ آپ لوگوں کے لئے تفریح کا سامان ہو گیا۔

ایک دوست نے پوچھا۔ "آخر کیوں؟ کیا یہاں دھوبیوں کی کمی ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "دھلائی بہت دینا پڑتی ہے۔ کالر کی دھلائی قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی اس کی قیمت اور پھر ہمیشہ دھوبی کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ اس سے میں بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے کپڑے ہاتھ سے دھوؤں۔"

مگر میں اپنے دوستوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی خوبی محسوس نہ کرا سکا۔ تھوڑے دن میں مجھے اتنی مہارت ہو گئی کہ اپنے کپڑے بڑی آسانی سے دھو لیتا تھا اور میرے دھوئے کپڑے دھوبی کے یہاں کے کپڑوں سے کسی طرح بُرے نہیں ہوتے تھے۔ میرے کالر ویسے ہی سخت اور چمکدار ہوتے تھے جیسے دوسروں کے۔ جب گوکھلے جنوبی افریقہ آئے تو اُن کے پاس ایک مفلر تھا جو انہیں مہادیو گووند راناڈے نے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ وہ اس نشانی کو بہت عزیز رکھتے تھے اور صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتے تھے۔ جب جوہانسبرگ کے ہندوستانیوں نے ان کے اعزاز میں ڈنر دیا تو اس کے باندھنے کا موقع آیا مگر یہ مل دل گیا تھا اور اس پر استری کی ضرورت تھی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ دھوبی کے یہاں دھلوایا جا سکے۔ میں نے کہا۔ "لائیے، میں اپنا ہنر آزماؤں۔"

گوکھلے نے کہا۔ "میں وکالت میں تمہاری قابلیت پر بھروسہ کر سکتا ہوں مگر دھوبی کے کام میں نہیں۔ تم نے اسے خراب کر دیا تو پھر میں کیا کروں گا۔ تم جانتے ہو یہ مجھے کس قدر عزیز ہے؟" یہ کہہ کر انہوں نے بڑے شوق سے اس تحفے کے ملنے کا قصہ سُنایا۔ مگر میں نے اصرار کیا اور انہیں یقین دلایا کہ میں بہت عمدگی سے کام کروں گا۔ آخر اجازت مل گئی اور میں نے اس پر استری کر دی جسے دیکھ کر وہ میرے ہُنر کے قائل ہو گئے۔ اس کے بعد چاہے ساری دنیا اس سے انکار کرتی، مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔

جس طرح میں نے دھوبی کی پابندی سے نجات پائی اُسی طرح نائی کا بھی محتاج نہیں رہا۔ وہ لوگ جو انگلستان جایا کرتے ہیں سب کے سب ڈاڑھی مونڈنا سیکھ جاتے ہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اپنے ہاتھ سے بال کاٹنا کوئی بھی نہیں سیکھتا۔ مجھے یہ بھی سیکھنا پڑا۔ ایک بار میں پریٹوریا میں ایک انگریز حجام کے یہاں گیا۔ اُس نے حقارت کے انداز میں میرے بال کاٹنے سے انکار کیا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس سے تکلیف ہوئی۔ مگر میں نے فوراً ایک بال کاٹنے کی مشین خرید لی اور آئینہ سامنے رکھ کر اپنے بال کاٹنے لگا۔ سامنے کے بال کاٹنے میں تو مجھے کم و بیش کامیابی ہوئی مگر گردن کے بال خراب ہو گئے۔ عدالت میں میرے دوست انہیں دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

"گاندھی یہ تمہارے بالوں کو کیا ہوا۔ چوہے کتر کر لے گئے؟"

"نہیں، یوروپی حجام نے میرے کالے بالوں کو ہاتھ لگانے میں اپنی ذلت سمجھی، اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کاٹوں گا، چاہے کیسے ہی خراب کیوں نہ کٹیں۔"

اس جواب سے میرے دوستوں کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔

حجام نے جو میرے بال کاٹنے سے انکار کیا، اس میں اُس کا قصور نہ تھا۔ اگر کالے آدمیوں کا کام کرتا، تو اُس کے یوروپی گاہک چھوٹ جاتے۔ آپ بھی تو اپنے نائیوں کو اچھوتوں کا کام کرنے نہیں دیتے۔ مجھے اس سلوک کا بدلا جنوبی افریقہ میں ایک بار نہیں بیسیوں بار ملا اور چونکہ میرا عقیدہ تھا کہ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے، اس لئے

مجھے اس پر غصہ نہیں آیا۔

میری سادگی اور اپنی مدد آپ کرنے کے اصول نے آگے چل کر جو انتہائی صورتیں اختیار کر لیں ان کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔ ان کا بیج بہت دن پہلے بویا جا چکا تھا۔ اس کے جڑ پکڑنے اور پھولنے پھلنے کے لئے صرف پانی دینے کی ضرورت تھی اور یہ آبیاری آہستہ آہستہ ہوتی رہی۔

# ہندو مسلم اتحاد

اتحاد ایک طاقت ہے' یہ صرف کتابی کہاوت نہیں بلکہ زندگی کا ایک اصول ہے جو سب سے واضح طور پر ہندو مسلم اتحاد کے سوال پر صادق آتا ہے۔ اگر ہم میں پھوٹ ہوگی تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ اگر ہم ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر تیار رہیں گے تو کوئی بھی تیسری طاقت آسانی سے ہندوستان کو غلام بنا لے گی۔ ہندو مسلم اتحاد کا مطلب صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ اُن سب جماعتوں کا اتحاد ہے، جو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتی ہیں چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔ ۔ ۔ ۔

تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ جب ایک فریق غلطی پر ہو تو دوسرے کو برداشت سے کام لینا چاہیئے۔ صرف اسی صورت میں ہندو مسلم اتحاد باقی رہ سکتا ہے۔ ایک فریق اچھا سلوک کرے بشرطیکہ دوسرا بھی ایسا ہی کرے' یہ نہ تو دوستی کا اصول ہے اور نہ جنگ کا۔ یہ تو سودا بازی ہوئی۔ دوستی میں سودا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ دوستی ہمیشہ بہادر فریقوں میں ہوتی ہے اور سودا بازی کمزوروں میں۔ ہم طاقتور بھی ہیں اور کمزور بھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو مسلمانوں میں دوستی بھی ہے اور سودا بازی بھی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ اُمید رکھنی چاہیئے کہ روز بروز سودا بازی کا جُز غائب ہوتا جائے گا اور دوستی بڑھتی جائے گی۔ اگر ایک فریق برابر اپنے دل کو پاک کرتا رہے اور مضبوط ہوتا جائے تو دوستی مستقل ہو جائے گی۔

بہادری کے معنی دوسروں کو ڈرا دھمکا کر دبا لینا نہیں ہے۔ وہ بہادر آدمی نہیں ہے جو اپنی طاقت کے بل پر دوسروں کو خوف زدہ کرے۔ بہادر وہ ہے جو طاقت رکھتے ہوئے اُس سے دوسروں کو دھمکانے کا نہیں بلکہ کمزوروں کی حفاظت کا کام لے۔ بھلا بہادر بھی ڈرتا جانتا ہے؟ مسلمان جسمانی طور پر طاقتور ہیں۔ اگر انہیں ساری دنیا کی حمایت حاصل ہو تب بھی ہندو اُن سے ہرگز ڈریں نہیں بلکہ خدا پر بھروسہ رکھیں اور انصاف کی راہ سے بال برابر بھی نہ ہٹیں۔ مسلمانوں کو بھی اس پر شرم آنی چاہیئے کہ وہ باہر سے مدد لیں اور انہیں ہندوؤں پر بھروسہ رکھنا چاہیئے باوجود اس کے کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ بہر حال اگر دونوں فریق اس مہذب طریقے پر عمل نہیں کرتے' صرف ایک ہی ایسا کرتا ہے تب بھی ہندو مسلم اتحاد میں خلل پڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یعنی اگر ایک فریق بھی اپنے فرض پر ثابت قدم رہے تو دونوں میں دشمنی باقی نہیں رہے گی۔ اپنے فرض پر ثابت قدم صرف وہی کہلائے گا جو اپنی حفاظت کے لئے خدا پر بھروسہ کرتا ہے اور نیکی کی راہ چلتا ہے۔ اگر ہندو اسی اصول سے مولپوں کے معاملے میں کام لیں تو مولپوں کی زیادتیوں کو دیکھنے کے باوجود سب مسلمانوں کو ملزم نہیں ٹھہرائیں گے۔ وہ اُن ہندوؤں کی جن کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے' مدد کریں گے اور اس قابل کر دیں گے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔

سوراج کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی اقلیت میں ہو لقدر تنِ تنہا ہو تب بھی وہ بے خوفی کے ساتھ دوسروں سے اختلاف کر سکتا ہے۔ ہندوؤں کو محض اِس بھروسے پر نہیں رہنا چاہیئے کہ سب مسلمان سمجھ داری سے کام لیں گے اور مسلمانوں کو کچھ ہندوؤں کے کمینہ پن کی حرکتوں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر فرقے کو اپنی طاقت پر بھروسہ ہونا اور دوسروں کی مدد کرنا چاہیئے۔ کیا وجہ تھی کہ کوئی ایک ہندو بھی موپلوں کے مظالم سے ڈر کر بھاگ جائے۔ کیا وجہ تھی کہ کوئی ایک ہندو بھی برطانوی سپاہیوں کے ڈر سے ان کو موپلوں کا پتہ بتا دے۔ آخر کیوں کسی ایک ہندو نے بھی ظاہری طور پر مسلمانوں کی مذہبی رسمیں موپلوں کے ڈر سے ادا کیں۔ وہی اصول جو ہم برطانوی حکومت سے مقابلہ کرنے میں برتتے ہیں یعنی اپنی جان دے دیتے ہیں ہر قسم کے مقابلے میں برتنا چاہیئے۔ اگر ہم اس کے لئے تیار رہیں کہ ظالم کا کہا نہیں کریں گے چاہے ہم اس کے ہاتھ سے مارے جائیں تو ہم شیر سے زیادہ طاقت ور بن جائیں گے۔ جو شخص کسی ظالم کو اس طرح مغلوب کرے کہ اسے مار ڈالے اُس کو ایک دن یہ ہوس ہو گی کہ وہ خود ظالم بن جائے، اِس لئے کہ اُس کی یہ عادت ہو جائے گی کہ خدا پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنی حیوانی طاقت پر بھروسہ کرے۔ جو شخص اپنے کو خدا کی جگہ سمجھ لیتا ہے وہ ایک دن ضرور برباد ہو جاتا ہے اُسے کبھی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اس نے خدا کی جگہ غصب کر لی ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنا صحیح مقام کھو بیٹھا ہے۔

# مذہبوں کی ہم آہنگی

**مذہب اور ملک :-** اِس میں شک نہیں کہ ایک معنی میں یہ بات جو میرے لئے کہی جاتی ہے صحیح ہے کہ میں اپنے مذہب کو اپنے ملک سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ یعنی میں ہندو پہلے ہوں اور محبِ وطن بعد میں۔ مگر اس کی وجہ سے میں کسی بڑے سے بڑے قوم پرور سے کم محبِ وطن نہیں ہوں۔ میرا اِس سے صرف یہ مطلب ہے کہ میرے ملک کے اغراض و مقاصد وہی ہیں جو میرے مذہب کے ہیں۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں اپنی نجات کو دنیا کی ہر چیز سے یہاں تک کہ ہندوستان کی نجات سے بھی بڑھ کر سمجھتا ہوں تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ میری نجات کے لئے ہندوستان کی سیاسی نجات کو قربان کر دیا جائے۔ ہاں اس کا یہ مفہوم ہے — ضرور ہے کہ — یہ دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔

**خدا ایک ہے :-**

وقت کی ضرورت یہ نہیں کہ صرف ایک مذہب ہو بلکہ یہ ہے کہ مختلف مذہبوں کے ماننے والے دوسرے کے مذہب کا احترام کریں اور باہمی رواداری سے کام لیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ سب لوگ یکساں ہوں بلکہ کثرت میں وحدت چاہتے ہیں۔ کوئی ایسی کوشش جو روایات کو، وراثت کے اثرات کو، آب و ہوا کو، سماجی اور تہذیبی ماحول کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہے نہ صرف یہ کہ ناکامیاب ہو گی بلکہ ایسا کرنا بہت بڑا گناہ بھی ہے۔

مذہب کی روح ایک ہے مگر وہ بہت سے قالبوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔ یہ مختلف قالب ابد تک باقی رہیں گے۔ دانش مند باہری خول کو نظر انداز کر کے اُس زندہ روح کو دیکھ لیتے ہیں جو اِن مختلف خولوں کے اندر

موجود ہے۔ ہندو اگر یہ توقع کرے کہ اسلام، عیسائیت اور زرتشت مذہب کو وہ ہندوستان سے نکال دے گا تو محض خواب و خیال ہے۔ اِسی طرح جیسے مسلمانوں کا یہ سوچنا کہ اُن کے تصوّر کا اسلام ہی دنیا پر حکومت کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ایک خدا کا ماننا اور اس کے پیغمبروں کے لامتناہی سلسلے پر عقیدہ رکھنا مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے تو ہم سب مسلمان ہیں، لیکن ساتھ ہی ہم سب ہندو اور عیسائی بھی ہیں۔ حق بلا شرکتِ غیرے کسی ایک مذہبی کتاب کی ملکیت نہیں ہے۔

## سب مذہب برابر ہیں :-

مجھے لفظ رواداری پسند نہیں۔ لیکن اِس سے بہتر کوئی اور لفظ مجھے نہیں ملا۔ رواداری سے کچھ یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ہم خواہ مخواہ یہ فرض کر لیں کہ دوسرے مذاہب ہمارے مذہب سے کمتر ہیں جب کہ اہنسا ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم سب مذہبوں کا ایسا ہی احترام کریں جیسے اپنے مذہب کا، اور اِس طرح اعتراف کریں کہ ہمارا مذہب بھی کامل نہیں ہے۔ حق کا جویا جو محبّت کے قانون کا پابند ہے اس کا اعتراف بہت جلدی کرلے گا۔ اگر ہمیں حق کی پوری معرفت حاصل ہو جاتی تو ہم حق کے متلاشی نہ ہوتے بلکہ خدا سے واصل ہو جاتے، کیونکہ حق خدا ہے لیکن چونکہ ہم محض متلاشی ہیں اِس لئے تلاشِ حق میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی نارسائی کا احساس رکھتے ہیں اور جب ہم خود ناقص ہیں تو لازمی ہے کہ مذہب کا جو تصوّر ہم نے کیا ہے وہ بھی نامکمل ہو۔ ہم مذہب کی پوری پوری معرفت حاصل نہیں کر سکتے۔ اُسی طرح جیسے خدا کی نہیں کر سکتے۔ چونکہ مذہب کا تصوّر ہمارے ذہن میں نامکمل ہے اس لئے اِس میں ہمیشہ ارتقار اور نئی نئی تعبیروں کا عمل جاری رہتا ہے۔ حق یا خدا کی معرفت کے مدارج طے کرنا اسی ارتقار کی وجہ سے ممکن ہے۔ اگر وہ سارے عقیدے جن کا انسان تصوّر کرتا ہے ناقص ہیں تو مذہبوں کا مقابلتہً ایک دوسرے سے بہتر ہونے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا جتنے عقیدے ہیں وہ سب حق کے مظہر ہیں لیکن سب نامکمل ہیں اور ان میں خطا کا امکان ہے۔ دوسرے مذہبوں کے احترام کے یہ معنی نہیں کہ ہمیں ان کی خامیاں نظر نہ آئیں۔ اسی طرح ہمیں اپنے عقیدے کی خامیوں کا بھی پورا احساس ہونا چاہیئے لیکن اس کی وجہ سے ہم اسے ترک نہ کریں بلکہ ان خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کریں۔ جب ہم سب مذہبوں کو ایک ہی نظر سے دیکھینگے تو صرف یہی نہیں کہ ہمیں اس میں کوئی تامل نہیں ہوگا بلکہ ہم اسے اپنا فرض سمجھیں گے کہ ان عقیدوں میں جو قابلِ قبول باتیں ہیں، اُن کو اپنے مذہب میں شامل کر لیں۔

تو پھر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آخر اتنے مختلف مذہب ہیں کیوں؟ حقیقت یہ ہے کہ رُوح ایک ہے لیکن جسم جن میں وہ سمائی ہے بہت سے ہیں۔ ہم جسموں کی تعداد تو کم کر نہیں سکتے لیکن رُوح کی وحدت کو پہچان سکتے ہیں۔ جس طرح درخت کا تنا ایک ہوتا ہے اور شاخیں اور پتّیاں بہت سی، اُسی طرح کامل اور سچا مذہب تو ایک ہی ہے لیکن بہت سے انسانی ذہنوں میں سے گذرنے کی وجہ سے ایک مذہب کے متعدد مذہب ہو جاتے ہیں۔ اِس واحد مذہب کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی ناقص انسان اپنے مقدور بھر اسے اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں اور پھر اُن کے الفاظ کی تعبیر دوسرے لوگ کرتے ہیں جو انہیں جیسے ناقص ہیں۔ اب کس کی تعبیر کو صحیح سمجھا جائے؟ ہر ایک اپنے نقطۂ نظر سے راستی پر ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہر ایک غلطی پر ہو اِس لئے رواداری سے کام لینا ضروری ہے۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی خود اپنے مذہب

سے بے پروائی برتتے، بلکہ اس کی وجہ سے وہ اپنے مذہب سے زیادہ معقولیت اور خلوص کے ساتھ محبت کرے گا رواداری کی بدولت ہمیں ایک ایسی رُوحانی بصیرت حاصل ہوتی ہے جس میں اور مذہبی جنون میں زمین آسمان کا فاصلہ ہے۔ مذہب کی حقیقت کو سمجھ لینے سے ایک عقیدے اور دوسرے عقیدے کے بیچ میں جو دیواریں کھڑی ہیں، وہ گر جاتی ہیں۔ دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری برتنے سے ہم اپنے مذہب کو اور اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ رواداری کی وجہ سے حق و باطل یا نیک و بد کا فرق نہیں مٹتا۔ یہاں ہم نے جن مذہبوں کا ذکر کیا ہے ان سے مراد دنیا کے بڑے بڑے مذاہب ہیں۔ ان سب کے بنیادی اُصول مشترک ہیں۔ ان سب میں بڑے بڑے ولی پیدا ہوئے ہیں۔ . . .

مگر سب مذہبوں کی برابری کا اصول مان لینے کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب اور لا مذہبی کا فرق مٹ جائے۔ میں لا مذہبی کے ساتھ رواداری نہیں برتنا چاہتا۔ مگر ایسی صورت میں کچھ لوگ اعتراض کر سکتے ہیں۔ اگر ہر ایک خود یہ فیصلہ کرنے لگا کہ مذہب کیا ہے اور لا مذہبی کیا، تو وہ انصاف پسندی کہاں باقی رہی؟ لیکن اگر ہم محبت کے قانون پر عمل کریں تو اپنے لا مذہب بھائی سے بھی ہمیں نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کے برعکس اُس سے محبت کرنی چاہیئے۔ اس سے یہ ہوگا کہ یا تو خود اسے اپنے طرزِ عمل کی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ یا وہ ہمیں ہماری غلطی بتائے گا یا کم سے کم ہم ایک دوسرے کے اختلاف رائے کو برداشت کر لیں گے۔ اگر دوسرا فریق محبت کے اصول کو نہیں برتتا تو وہ ہمارے ساتھ تشدّد سے پیش آ سکتا ہے۔ لیکن اگر ہمارے دل میں اس کی سچی محبت ہے تو آخر کار اس دُشمنی پر محبت غالب آ جائے گی۔

# تعلیم کا مقصد

یہ قدیم قول کہ "تعلیم کا مقصد نجات دلانا ہوتا ہے" آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا پہلے کبھی تھا۔ یہاں تعلیم کا مطلب صرف رُوحانی علم نہیں ہے۔ نہ ہی نجات کا مفہوم موت کے بعد صرف رُوحانی نجات ہے۔ علم میں وہ تمام تربیت شامل ہے جو انسانیت کے خدمت کے لئے مفید ہو اور نجات کا مطلب ہر قسم کی غلامی حتیٰ کہ موجودہ زندگی سے بھی آزادی ہے۔

غلامی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو بیرونی غلبے کی محکومی اور دوسرے انسان کی خود اپنی فرضی ضروریات کی غلامی۔ اس آدرش کے حصول کے لئے حاصل کیا گیا علم ہی صرف صحیح مطالعہ ہے۔

کسی بھی قسم کا علم حاصل کرنے کے لئے مسلسل تحقیق اور صحت مند تجسّس پہلی لازمی شرطیں ہیں۔ تجسس کے ساتھ عاجزی اور معلم کے تئیں احترام شامل ہونا چاہیئے۔ اِس سے کسی بھی حالت میں تکبّر یا غرور پیدا نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ذہن کے علم حاصل کرنے کا دُشمن ہوتا ہے۔ عاجزی اور کچھ سیکھنے کی خواہش کے بغیر کوئی علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ایک نئی دنیا قائم کرنے کی غرض سے تعلیم کی طرز نئی ہونی چاہیئے۔ انسان بننے کے لئے پڑھائی لکھائی نہیں بلکہ حقیقی زندگی کے لئے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔

قومی تعلیم کو صحیح معنوں میں قومی بنانے کے لئے اس میں قومی حالت کی جھلک ہونی چاہیئے۔

کتابی تعلیم کے بعد ہاتھ سے کچھ کام کر سکنے کی تعلیم حاصل کی جانی چاہیئے، کیونکہ یہ ایک ایسا وصف ہے جو انسان اور حیوان کے درمیان فرق کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ سوچنا محض ایک وہم ہے کہ پڑھائی لکھائی کے فن کے علم کے بغیر انسان کی کامل نشو ونما نا ممکن ہے۔ اس علم سے زندگی میں بلا شک ایک وقار پیدا ہوتا ہے لیکن وہ کسی بھی لحاظ سے انسان کی اخلاقی، جسمانی اور مادی ترقی کے لئے لازمی نہیں ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ ذہن کی صحیح تعلیم صرف اعضائے جسمانی مثلاً ہاتھوں، پیروں، آنکھوں، کانوں، ناک وغیرہ کی مناسب حرکت اور تربیت کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ دیگر الفاظ میں بچّے کے ذہن کے نشو ونما کا بہترین اور فوری طریقہ اس کے اعضائے جسمانی کو صحیح طریقے سے استعمال میں لانا ہے۔

لیکن جب تک ذہن اور جسم کی ترقی ساتھ ساتھ نہ ہو اور اسی مقدار میں روح میں بیداری پیدا نہ ہو تب تک اوّل الذکر کی نشو ونما بے معنی ثابت ہوگی۔ روحانی تربیت سے میرا مدّعا دل کی تعلیم ہے۔ ذہن کی مناسب اور ہمہ گیر ترقی صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے اگر بچّے کے جسمانی اور روحانی اوصاف کو تعلیم دی جائے۔ لہٰذا یہ تصوّر کرنا زبردست غلطی ہوگی کہ ان میں سے کوئی بھی رفتہ رفتہ یا ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر ترقی کر سکتا ہے۔

انسان نہ تو محض ذہن ہے، نہ بالکل جانوری جسم، نہ دل اور نہ ہی صرف روح۔ ایک کامل انسان بننے کے لئے ان تینوں کا مناسب اور ہمہ گیر ملاپ ضروری ہے اور تعلیم کا صحیح مفہوم بھی یہی ہے۔

تعلیم سے میرا مدّعا بچّے کے انسانی جسم، ذہن اور روح کے بہترین اوصاف کی نشو ونما ہے۔ پڑھائی لکھائی نہ تو تعلیم کا انجام ہے نہ ہی آغاز۔ یہ تو محض ایک ذریعہ ہے جس سے مرد یا عورت علم حاصل کر سکتا ہے۔ پڑھائی لکھائی بذاتِ خود کوئی تعلیم نہیں ہے۔ لہٰذا میں بچّے کی تعلیم کو کوئی مفید ہنر سکھانے سے شروع کروں گا تاکہ تربیت کے آغاز کے ساتھ ہی اس کے اندر پیداواری صلاحیت آسکے۔ میری رائے ہے ذہن اور روح کی سب سے اچھی نشو ونما صرف اسی طرزِ تعلیم سے ممکن ہو سکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہنر مشینی طریقے سے نہیں سکھایا جانا چاہیئے جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے بلکہ اسے سائنٹفک طریقے سے سکھایا جانا چاہیئے یعنی بچّے کو اس کے ہر عمل کا پورا علم ہونا چاہیئے تعلیم کے ذریعے کے طور پر اختیار کئے جانے والی ہر بنیادی دستکاری کو عالمگیریت کی آزمائش پر پورا اترنا چاہیئے دستکاری، فن، صحت اور تعلیم سب کو ایک منصوبے میں شامل کیا جانا چاہیئے۔

## نئی تعلیم:-

نئی تعلیم ان چاروں کا ایک حسین امتزاج ہے اور اس میں عہدِ طفولیت سے لے کر موت کے وقت تک فرد کی مجموعی تعلیم شامل ہے۔ دستکاری اور صنعت کو تعلیم سے الگ تصوّر کرنے کی بجائے میں اوّل الذکر کو آخر الذکر کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

میری نئی تعلیم روپے پر منحصر نہیں، اس کے لئے اخراجات خود تعلیمی عمل سے پورے ہونے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ تعلیم صرف وہ ہے جو اپنی مدد آپ کرنے کے قابل ہو۔

اسے تعلیم کا نیا طریقہ کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ نہ تو باہر کے ملک سے لائی گئی ہے، نہ ہی اسے ٹھونسا جاتا ہے، بلکہ بھارت کے ماحول کے مطابق ہے جو کہ زیادہ تر دیہات میں بسا ہوا ہے۔ اس کا مقصد جسم، ذہن اور روح میں،

جس سے کہ انسان بنا ہوا ہے توازن پیدا کرتا ہے۔ یہ مغربی طرز کی نہیں ہے جو زیادہ تر جنگ پرست ہے اور جس
میں ذہن اور جسم کو روح پر فوقیت دی جاتی ہے۔ میری تعلیم دستکاریوں کے ذریعے دی جاتی ہے۔ اسکی ایک دوسری خوبی
۱۴ یہ ہے کہ اسے اس طریقے سے تربیت دی گئی ہے کہ یہ اپنی مدد آپ کرنے کے قابل ہو۔ لہٰذا اس کے ذریعے تعلیم پر
لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔

# ہَڑتال

آج کل ہڑتال ایک عام بات ہو گئی ہے۔ ہڑتالوں کی اِس وبا کا خاص سبب لوگوں کا مذہب سے عقیدہ اور یقین اُٹھ جانا ہے۔ ہڑتال کرنے کے لئے لوگوں کو اُکسایا نہیں جانا چاہیئے۔ اگر ہڑتال بغیر کسی دباؤ اور جبر و زبردستی کے منظم کی جاتی ہے تو اُس میں غنڈہ گردی اور لوٹ مار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ایسی پُرامن ہڑتال ہڑتالیوں کے درمیان تعاون کے جذبے کی علامت ہے۔

قطعی اور کامیاب ہڑتال میں ہڑتال کے حق بجانب ہونے کے علاوہ ہڑتالیوں کے درمیان مکمل تعاون، پُرامن مظاہرہ اور غیر ہڑتالیوں کے ساتھ بہتر سلوک اور ہڑتال کے دوران میں یونین کے چندے کا سہارا لئے بغیر اہلِ خاندان کے لئے کھانے پینے کے بندوبست وغیرہ کا ہونا ضروری ہے۔

انصاف کے حصول کے لئے ہڑتال محنت کش طبقے کا پیدائشی حق ہے لیکن اگر سرمایہ دار ثالثی کے فیصلے کے لئے تیار ہو جائے تو ہڑتال ختم ہو جانی چاہیئے، ورنہ یہ جُرم کے مترادف ہوگی۔

ہڑتال کہاں تک حق بجانب ہے، اِس کا اندازہ کوئی ایسا غیر جانب دار شخص ہی لگا سکتا ہے جسے عوام کا اعتماد حاصل ہو۔ ایسے افراد ہی کو ثالثی فیصلہ کرنے کا کام سونپا جا سکتا ہے ورنہ پھر معاملہ عدالتی حکم کے سُپرد کر دیا جانا چاہیئے۔

## ہڑتال اور عدم تشدُّد :

یہ کہنا فضول ہے کہ اِس طرح کی شہری ہڑتالوں میں دھمکانے اور آتش زنی جیسی تشدّد آمیز کارروائیوں کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دنیا کے محنت کشوں کی مانگیں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ اپنی مانگ کو منوانے کے لئے وہ تشدّد پر اُتر آتے ہیں اور مالکوں کی جائداد اور مشینوں کو نقصان پہنچانے سے بھی وہ نہیں ہچکچاتے۔

## مالک اور مزدور :

میری رائے میں مزدوروں کا درجہ اگر مالکوں سے اُونچا نہیں ہے تو برابر تو ہے ہی۔ لیکن اصل صورتِ حال اِس کے بالکل برعکس ہے۔ مالک خود کو اپنے سرمائے اور عقل کے سبب مزدوروں سے افضل سمجھتے ہیں۔

اس لئے میں تو مالکوں ہی کو رائے دوں گا کہ وہ مزدوروں کو فرموں کا اصلی مالک سمجھیں اور انہیں معقول تعلیم دے کر ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔ اِس طرح آخر میں مالکوں کو کوئی نقصان نہیں ہوگا اور مالکوں کے مخلصانہ سلوک سے مزدور مالکوں کے باعزّت شریک دار بن سکیں گے۔

**سیاست اور ہڑتالیں :** اقتصادی حالت میں بہتری لانے کے لئے کی جانے والی ہڑتالوں کا مقصد

سیاسی فائدہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح کی ہڑتالوں سے آخر میں نقصان مزدور ہی کو ہوتا ہے۔

دیگر ملکوں کی طرح بھارت میں بھی محنت کش طبقہ زیادہ تر کچھ مشیروں اور رہنماؤں کے رحم و کرم پر منحصر ہے اور یہ رہنما ہمیشہ دانش مند اور قابل بھروسہ نہیں ہوتے۔ میری رائے میں جب تک مزدور ملک کی سیاسی صورت حال سے پوری طرح باخبر نہ ہوں ان کے ذریعے سے سیاسی فائدہ حاصل کرنا انتہائی خطرناک کام ہے۔ اس صورت حال میں مزدور منظم طریقے سے اپنے مفاد کے لئے کام نہیں کر سکتا۔

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مزدوروں کو سیاست میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔ سیاسی صورت حال کے بارے میں ہمارے مزدوروں کی واقفیت کم رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ملک میں ایسے دانشمند، ایماندار، ذمہ دار، قابل اعتماد اور بہادر کارکنوں کا فقدان ہے جو انہیں اپنے آدرشوں کے مطابق ڈھال سکیں۔

ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیاسی ہڑتالوں کے حق بجانب ہونے کے مسئلے پر دوسرے انداز پر غور کیا جانا چاہیے اور اقتصادی صورت حال میں بہتری لانے کے لئے کی جانے والی ہڑتالوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔

سیاسی ہڑتالوں کا سماج میں اپنا ایک علیحدہ مقام ہے۔ جب تک وہ تشدد آمیز نہیں ہوتیں ہمیں ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

**ضروری خدمات :-** کچھ مخصوص شعبوں میں ہڑتال کئے جانے کا میں مخالف ہوں۔ مہتر اور پولیس کے عملے کے ارکان اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان کے سامنے اگر کبھی کوئی مسئلہ آتا ہے تو ایک غیر جانبدار ٹریبونل کے فیصلے کو قبول کر لیا جانا چاہیے۔ ان لوگوں کا کام اتنا اہم ہے کہ ان کے مقابلے میں تنخواہ وغیرہ کے مسئلوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح کی صورت حال عوامی خدمت کے شعبے میں بھی ہے۔ ڈاک گھروں میں ہڑتال ہونے سے سرکار کو تو نقصان ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ غریب عوام کو بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

## طلباء کو بلند کردار اور حلیم ہونا چاہیئے

وہی تعلیم صحیح اور سچی ہے جو طلباء کو ہر لحاظ سے مکمل اور خود مکتفی بنا دے۔ اس طرح کی تعلیم زندگی میں ہر قدم اور ہر مرحلے پر فائدہ پہنچاتی ہے اور یہ ایک ایسی دولت ہے جو ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔

جن طلباء کو دستکاریوں کا شوق ہے اور جن کا ہاتھ اس کام میں اچھا چلتا ہے انہیں صنعت و حرفت کی تعلیم آخری مرحلے تک حاصل کر کے درجۂ کمال تک پہنچ جانا چاہیے۔ جن طلباء کو کسی صنعت یا ہنر سیکھنے کا شوق ہے انہیں دلجمعی کے ساتھ کچھ وقت روزانہ اس کام میں لگانا چاہیے۔

تمام تر تعلیم صوبائی زبان کے ذریعے سے دی جانی چاہیے۔

اس میں فرقہ وارانہ مذہبی تربیت کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تعلیم میں بنیادی عالمگیر اخلاقیات کی مکمل شمولیت ہونی چاہیے۔ اس طرح کی تعلیم چاہے وہ بچوں کو دی جائے یا بڑوں کو، مردوں کو دی جائے یا عورتوں کو، طلباء کے گھروں کے ماحول اور رہن سہن پر اچھا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی۔

چونکہ اسطرح کی تعلیم حاصل کرنیوالے لاکھوں طلباء خود کو پورے بھارت کا نمائندہ سمجھنے لگیں گے اسلئے انہیں ایک بین صوبائی زبان بھی سیکھنی چاہیے۔ یہ مشترکہ بین صوبائی زبان ناگری یا اردو رسم الخط میں لکھی جانیوالی ہندوستانی ہی

(باقی ص ۲۷۵ پر دیکھئے)

# گاندھی کہاوتیں





# گاندھی جی کے منتخب مقولے

• سچی محبت سمندر کی طرح لامحدود ہے اور یہ تمام حدود اور سرحدوں کو پار کر کے اپنے اندر پوری کائنات کو سمیٹ لیتی ہے۔

• اقتصادی مساوات عدم تشدد پر مبنی آزادی کی کنجی ہے۔ اقتصادی مساوات کے لئے کام کرنے کے معنی سرمایہ اور محنت کے درمیان کشمکش کا خاتمہ کرنا ہے۔

• بھارت کی جدوجہد تشدد پر مبنی نہیں ہے۔ اس کا مقصد تمام مصیبت زدہ نسلوں کو جابر طاقت سے نجات دلا کر آزادی کی نعمتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

• تمہیں دیہی دستکاروں اور ہنروں کو سیکھنا اور انہیں اختیار کرنا چاہیئے، جنہیں ہم دوبارہ فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تمہاری نجات کا راستہ یہی ہے۔

• جو قوم بے شمار قربانیاں پیش کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتی ہے وہ ترقی کی لامحدود بلندیوں پر پہنچنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ جس قدر قربانی حقیقی ہوگی، اسی قدر کامیابی جلد حاصل ہوگی۔

• انسان چاہے جتنے بلند مرتبے پر فائز ہو، لیکن خدا ہی تمام کائنات کی مخلوق کا تنہا سہارا اور مالک ہے۔ خدا انسان کے بگاڑے ہوئے کام سنوار دیتا ہے۔

• جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں، خدا ان کے دلوں سے ہر طرح کا خوف مٹا دیتا ہے۔

• جب تک ایک انسان خود کو دوسرے انسان سے کمتر یا برتر سمجھتا رہے گا، اس وقت تک مساوات ہرگز قائم نہیں ہو سکتی۔ ہم رتبہ لوگوں میں سرپرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔

• ہم اپنے دشمنوں کو محبت سے جیت سکتے ہیں، نفرت سے نہیں! نفرت اور تشدد میں بہت باریک سا فرق ہے۔

• یہ کہنا ایک بُری عادت ہے کہ صرف ہمارے ہی خیالات اچھے ہیں اور دوسروں کے بُرے اور جن لوگوں کے خیالات ہم سے مختلف ہیں وہ ملک کے دشمن ہیں۔

• غصہ ایک طرح کی دیوانگی ہے اور اس عارضی دیوانگی سے اعلیٰ مقاصد کے علم برداروں کو اپنے مقاصد میں ناکامی ہوئی ہے۔

• مختصر عمل، طولانی تبلیغ سے بہتر ہے۔

• سچائی کا ذکر صرف ہماری مذہبی کتابوں ہی میں نہیں ملتا، بلکہ یہ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں میں بھی موجود ہے۔

• جو انسان بے خوف رہنے کا عہد کرتا ہے وہ اپنی اور دوسروں کی حفاظت سچائی اور روح کی طاقت سے کرے گا۔

• چھوت چھات کی برائی کا قلع قمع کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

• روشنی سے روشنی پیدا ہوتی ہے اندھیرا نہیں۔ اِسی طرح اعلیٰ مقصد کے لئے شریفانہ عمل اختیار کرنے کے عوض دوگنا صلہ ملتا ہے۔

• اگر ہم جمہوریت کا صحیح مفہوم پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں قوتِ برداشت اور رواداری پیدا کرنا پڑے گی۔

• جو انسان جذبۂ نفرت سے پاک ہے، اُسے تلوار کی ضرورت نہیں۔

• ایک ایسا انسان جو کسی مقدس عہد یا ضابطۂ اخلاق سے محروم ہے اُس کی زندگی بے پتوار کی کشتی کی مانند ہے۔

• قومیں شدید محنت اور سخت ترین مشکلات کے بطن سے پیدا ہوتی ہیں۔

• بدنظمی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔

• ملکی قانون کی اطاعت کر کے ایک شہری اپنی شخصی آزادی کی قیمت ادا کرتا ہے۔

• کل کی دنیا ایک ایسا سماج ہوگا جو عدم تشدد پر مبنی ہوگا۔ عدم تشدد اس سماج کا بنیادی قانون ہے اس قانون سے دوسری تمام نعمتیں حاصل ہوں گی۔

• بہادری جسمانی وصف نہیں بلکہ ایک روحانی وصف ہے۔

• اگر کوئی شخص دوسروں کے مقابلے میں خود کو افضل اور برتر سمجھتا ہے تو اُس کا یہ جذبہ خدا اور انسان کی نظر میں گناہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

• اگر تم اِس کا احساس نہیں کر سکتے کہ دوسرے کا عقیدہ بھی تمہارے عقیدے ہی کی طرح سچا ہے تو کم از کم تمہیں اتنا تو ماننا چاہیئے کہ دوسرے لوگ اسی قدر سچے ہیں جس قدر کہ تم خود ہو۔

• خدا کا عرفان مذہبی کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ انسان خود اپنی ذات میں اُس کا جلوہ دیکھتا ہے۔

• عوام کی آواز خدا کی آواز ہے۔

• مجھے جو خدا بھگوت گیتا میں نظر آتا ہے وہی انجیل مقدس اور قرآن مجید میں بھی نظر آتا ہے۔

• میں انسانی فطرت کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھنے کا قائل نہیں۔ انسانی فطرت کسی بھی شریفانہ اور دوستانہ عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

• روز افزوں مشکلات کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرنے ہی میں انسان کی آئندہ ترقی کا راز مضمر ہے۔

• مصیبت دوستی کی کسوٹی ہے۔

• بے خوفی روحانیت کی پہلی شرط ہے۔ بزدل آدمی کبھی نیک سیرت نہیں ہو سکتا۔

• اگر آپ کا دل پاک نہیں ہے اور آپ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتے تو آپ تعلیم یافتہ انسان ہرگز نہیں کہے جا سکتے۔

• سچائی کا پرستار رسم و رواج کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتا۔ اُسے اپنی اصلاح کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے اور جس وقت اسے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ غلطی پر ہے تو اُسے ہر قیمت پر اپنی غلطی کو تسلیم کر کے اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔

• لیڈروں سے جن اوصاف کی اُمید کی جاتی ہے وہ ہیں ہمت، تحمل، بے خوفی اور سب سے بڑھ کر ایثار و قربانی۔

• ایک مصلح کا راستہ پھولوں سے نہیں بلکہ کانٹوں سے بھرا ہوتا ہے اور اُسے اِس راستے پر احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ چلنا ہے۔ وہ صرف لنگڑا کر چل سکتا ہے لیکن جست لگانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

• جو قوم بے شمار قربانیاں پیش کر سکتی ہے وہ بے پناہ بلندیوں پر فائز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ قربانی جس قدر مقدس ہوگی، ترقی کی رفتار اتنی ہی زیادہ تیز ہوگی۔

• خدا بزرگ و برتر اور رحیم و کریم ہے۔ وہ اپنے بندوں کی اتنی ہی آزمائش کرتا ہے جتنی ان کے اندر قوتِ برداشت ہوتی ہے۔

• عدم تشدد اور سچائی ایک دوسرے سے مربوط ہیں، انہیں عملی طور پر ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے ایک سکے کے دو رخ۔

• ہمیں اپنے عوام کو عدم تشدد کی تعلیم لازمی طور پر دینی چاہیئے۔ اس کے بعد سچائی کی تعلیم کا عمل فطری طور پر خود بخود شروع ہو جائے گا۔

• اگر ہم تاریخ کے آغاز سے لے کر موجودہ دور تک ایک نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ انسان بتدریج عدم تشدد کی طرف بڑھ رہا ہے۔

• عدم تشدد کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ بدی کے خلاف ہر عملی جدوجہد ترک کر دی جائے۔ اس کے برعکس اس بارے میں میرا تصور یہ ہے کہ انتقام لینے کے بجائے عدم تشدد بدی کے خلاف ایک زیادہ موثر اور حقیقی جدوجہد ہے۔ اس لئے کہ انتقام لینے سے بدی کے شعلے اور بھڑک اٹھتے ہیں۔

• ظلم کا جواب ظلم سے دینا اپنے اخلاقی اور ذہنی دیوالیہ پن کا اعتراف کرنا ہے۔ اس سے محض برائیوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔

• میری رائے میں نجات کا راستہ اپنے ملک کی خدمت اور اس کے ذریعے انسانیت کی خدمت کی مسلسل جدوجہد میں پوشیدہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ دنیا کی ہر موجود شے کے ساتھ مربوط ہو جاؤں۔

• تمام گناہوں کا ارتکاب پردے میں کیا جاتا ہے جس لمحہ ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ خدا سب کچھ دیکھ لیتا ہے اور وہ ہمارے خیالات سے بھی واقف ہے ہم گناہوں سے آزاد ہو جائیں گے۔

• ناجائز ذرائع کا نتیجہ برا ہی نکلتا ہے۔ کوئی شخص جھوٹ کے ذریعے سچائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ سچے کردار کے ذریعے ہی سچائی تک پہنچا جا سکتا ہے۔

• کامیابی یا ناکامی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہمارے بس میں تو اتنا ہی ہے کہ ہم اپنا فرض بخوبی انجام دیتے رہیں۔ ہمارا کام تو صرف کوشش کرنا ہے۔ آخر میں خدا کی جو مرضی ہوگی، وہی ہوگا۔

• ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنی آواز پر ریاض کے ذریعے قابو پا کر بہتر سے بہتر موسیقی پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن پاک اور صاف زندگی کے ساز سے اعلیٰ موسیقی پیش کرنا چند ہی کو نصیب ہوتا ہے۔

• مذہب سے میری مراد رسم و رواج کے پابند مذہب سے نہیں ہے بلکہ ایک ایسے مذہب سے ہے جو دوسرے تمام مذاہب کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہو اور جو ہمارے لئے معرفتِ الٰہی کا ذریعہ بن سکے۔

• ہمیں ایک ہندو کو اچھا ہندو بننے، ایک مسلمان کو اچھا مسلمان بننے اور ایک عیسائی کو اچھا عیسائی بننے میں مدد کرنی چاہیئے۔

• صداقت اور دیانت داری سے اونچا اور کوئی مذہب نہیں۔

• اگر کسی شخص نے اپنے مذہب کی روح کو پہچان لیا تو پھر وہ دوسرے مذاہب کی حقیقت سے بھی واقف ہو جائے گا۔

• مذہب کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ علم دانشمندی یا دولت کی بنا پر کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر برتری ظاہر کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

• بھارت اور تمام دنیا کا اقتصادی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کے تحت کوئی بھی شخص بھوکا اور ننگا نہ رہے۔

• میں علم اقتصادیات اور علم الاخلاق کے درمیان

کوئی حد حاصل قائم نہیں کرتا۔ ایسی حیثیت جو کسی قوم یا انسان کی اخلاقی حالت پر بُرا اثر ڈالے اخلاقیات کے منافی ہے اور اس کی اشتہار سے ایک گناہ بھی!

• میں ہندو ہوں، تم مسلمان ہو، میں گجراتی ہوں لاڑ تم مدراسی ہو — ہمیں اس طرح کی تنگ نظری کو یکسر فراموش کر دینا چاہیئے۔ ہمیں مشترک بھارتی قومیت میں "میں" اور "میرا" کے احساس کو بالکل مٹا دینا چاہیئے۔ ہم تب ہی آزاد ہو سکیں گے جب ہمارے عوام ایک ساتھ اُبھرنے اور ایک ساتھ ڈوبنے کا عزم رکھتے ہوں۔

• ہم خود کو عیسائی، ہندو، یا مسلمان کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ بہرحال ہم کوئی بھی ہوں لیکن دراصل اس گوناں گونی میں جو یک رنگی پنہاں ہے وہ اپنی جگہ مسلّمہ حقیقت ہے۔ جہاں تک میرے تجربے کا تعلق ہے ہم مسلمانوں عیسائیوں اور ہندوؤں کو وقتاً فوقتاً اس بات کا احساس ہوتا رہتا ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان اختلافات کی بہ نسبت میل ملاپ اور یک جہتی کے مواقع بہت زیادہ ہیں۔

• ایسی اقتصادیات جو اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر دے وہ حقیقی اقتصادیات نہیں ہوتی۔

• جمہوری نظامِ حکومت کو کسی ایک شخص کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا، چاہے وہ شخص کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہوں۔

• فرقہ وارانہ نفرت، شاید بدترین قسم کا کوڑھ ہے۔

• تمام مذاہب کی رُوح ایک ہے لیکن اُس کے قالب مختلف ہیں۔ رُوح تا بہ ابد زندہ رہے گی، دانشمند ظاہری خول کو نظر انداز کر کے مختلف شکلوں میں پائی جانے والی اس ایک رُوح کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

• انسان کو اپنے فرض کی ادائیگی رائے عامّہ کے خوف سے بالاتر ہو کر کرنی چاہیئے۔

• اگر ہمیں ترقی کرنا ہے تو ہمیں تاریخ کو دُہرانا نہیں چاہیئے بلکہ ایک نئی تاریخ کو جنم دینا چاہیئے۔

• غلطی کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا اور پھر اس سے احتراز کرنا ہی مردانگی ہے۔

• ضبط ہمارے وجود کے لئے قانونِ فطری ہے۔ ضبط کے اعلیٰ ترین مظاہرے کے بغیر شخصیت کی انتہائی تکمیل ممکن نہیں ہے۔

• ہر اچھی تحریک کو پانچ مراحل پیش آتے ہیں۔ بے اعتنائی، تمسخر و استہزا، سب و شتم، جبر و استبداد اور احترام۔

• اہنسا میرے لئے ایک پالیسی نہیں بلکہ میرا عقیدہ اور میرا مذہب ہے۔

• عدم تشدد انسان کے اختیار میں ایک سب سے بڑی طاقت ہے۔

• آج کی فکر تم خود کرو، کل کی فکر خدا کرے گا۔

• ضمیر کی آواز خدا کی آواز ہے اور یہی آواز ہر عمل اور ہر خیال کی صداقت کا آخری فیصلہ کرتی ہے۔

• عفو و در گذر طاقت ور ہی کا وصف ہوتا ہے۔

• معرفتِ الٰہی کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی اسے معرفتِ ذات ہی سے پایا جا سکتا ہے۔

• تعمیری، عملی اور متوازن تنقید عوامی زندگی میں ایک اہم معاون عنصر ہے۔

• قوم پرستی کوئی برائی نہیں، برائی تو وہ تنگ نظری خودغرضی اور علیحدگی پسندی ہے جس کا زہر آج کل کی قوموں میں پھیل رہا ہے۔

• خواہشاتِ نفسانی پر فتح پا لینا کسی مرد یا عورت کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

• حقوق حاصل کرنے کا صحیح وسیلہ اپنے فرض کی ادائیگی ہے۔

• روزی کمانے کے قانون کے احترام کی بدولت

سماج کے ڈھانچے میں ایک خاموش انقلاب رونما ہوگا۔

• جب تک ایک بھی تندرست مرد یا عورت ایسی ہو جسے روٹی اور روزگار میسّر نہ ہو اُس وقت تک ہمارے لئے آرام یا دو وقت کا کھانا حرام ہے۔

• عدم تشدّد سے پیدا ہونے والی طاقت انسان کے ایجاد کردہ تمام ہتھیاروں سے بدرجہا برتر ہے۔

• میرے خوابوں کے سوراج میں نسلی یا مذہبی بھید بھاؤ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

• بھارت کے تمام مذاہب اور نسلوں کے افراد کو ایک ہی جھنڈے کے نیچے لاکر جمع کر دو اور ان میں اتحاد اور یکجہتی کا جذبہ اس شدّت کے ساتھ پیدا کر دو کہ ان کے ذہنوں سے فرقہ واریت اور تنگ نظری کا نام و نشان تک مٹ جائے

• گیدڑ بھبکی دکھاوے کی بہادری یا جھوٹی شان و شوکت کو جواں مردی ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ جواں مردی دراصل سماجی، سیاسی اور دیگر شعبوں میں صحیح کام کرنے کی ہمت اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا بہادری سے مقابلہ کرنے میں مضمر ہے۔ اس کا تعلق اعمال سے ہے باتوں سے نہیں۔

• اچھی زمین رزق مہیّا کرنے کے لئے انسان سے سخت محنت و مشقّت چاہتی ہے۔

• مزاحمت چاہے وہ متشدّدانہ ہو یا غیر متشدّدانہ خوب سوچ سمجھ کر کی جانی چاہیئے۔

• طوائف الملوکی ہمارے شاستروں کے خلاف ہے اسلئے بھارت میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

• ہر فرد کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہیئے۔ غیر ملکی زبان کو صرف اختیاری مضمون کا درجہ دینا چاہیئے۔

• خدا یا انسان کسی شخص کو کمتر نہیں تصوّر کر سکتا۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ ہر آدمی کو اپنے برادرِ حقیقی کا درجہ دے۔ یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کی ہر مذہب تعلیم دیتا ہے۔

• نجات اور کردار کی پاکیزگی کا انحصار پاکیزگیٔ نفس پر ہے۔

• تہذیب کا انحصار ضرورتوں کو بڑھانے پر نہیں، بلکہ بالارادہ اُن کے کم کرنے پر ہے۔ تبھی حقیقی مسرت اور قناعت میں اضافہ ہوگا اور خدمت کرنے کی صلاحیت بڑھے گی۔

• دنیاوی عدالتوں سے بھی اونچی ایک عدالت ہے اور وہ ہے ضمیر کی عدالت۔ تمام عدالتوں کے فیصلے اُس کے آگے ہیچ ہیں۔

• کسی ملک کی ثقافت وہاں کے عوام کی روح اور اُن کے دلوں میں پنہاں رہتی ہے۔

• عوام کے مختلف طبقات کے تمام مادی، اقتصادی اور روحانی وسائل کو سب کی بھلائی کے لئے حرکت میں لایا جائے۔ یہی حقیقی جمہوریت ہے۔

جناب منجو قمر نے بیدون افسانہ اردو ادب میں صنفِ "عکسانہ" کا اضافہ کر کے ایک نئی طرزِ تحریر کو جنم دیا ہے آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی کے انعام یافتہ ڈرامہ نگار جناب منجو قمر کے مندرجہ ذیل ڈرامے اور عکسانے ضرور ملاحظہ فرمائیے اور سینما بینی کا لطف اُٹھائیے۔

| ڈرامے | عکسانے |
|---|---|
| (۱) آفتابِ دمشق | (۱) نیل کی ناگن |
| (۲) پینے کے بعد | (۲) جلتی جوانی |
| (۳) شبنم | (۳) سستا جوبن مہنگا ساز |
| (۴) ہٹلر کی تمنّا | (۴) ایک دھماکہ میٹھی آگ |
| (۵) جھانسی کی رانی | (۵) بجھی کلی تیز کرن |
| (۶) بہادر شاہ ظفر | (۶) ڈھلتا سورج بڑھتا سایہ |
| (۷) مرزا غالب | (۷) امیر علی ٹھگ |
| (۸) وطن کی لاج | (۸) بیگم سمرو |
| (۹) انوکھی دُلہن | (۹) غریب کی جورو سب کی بھابی |

ناشر و طابع: نگاہ پبلیکیشنز، ملّے پلی، بیگم بازار، حیدرآباد ۱۲ (اے۔ پی)

بقیہ صفحہ ۲۶۸ — "طلباء کو بلند کردار اور حلیم ہونا چاہیے"

ہونی چاہیے، اسلئے طلباء کو چاہیے کہ وہ دونوں رسم الخط پر عبور حاصل کریں۔

**یونیورسٹی کی تعلیم** :- یونیورسٹیوں میں دی جانیوالی تعلیم کا مقصد عوام کے سچے خادموں کی تخلیق ہونا چاہیے جن کا مقصدِ حیات ملک کی آزادی کے حصول کیلئے جینا اور مرنا ہو اسلئے میری رائے میں یونیورسٹی کی تعلیم انتہائی جامع اور مربوط ہونی چاہیے اور یہ بنیادی تعلیم کے طریقے پر دی جانی چاہیے۔

جہاں تک عورتوں کی تعلیم کا سوال ہے میں یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مردوں کی تعلیم سے مختلف ہونی چاہیے اور کب شروع ہونی چاہیے لیکن یہ میری پختہ رائے ہے کہ عورتوں کو وہ تمام سہولتیں حاصل ہونی چاہئیں جو مردوں کو حاصل ہیں اور جہاں ضروری ہو وہاں انہیں خصوصی سہولیات مہیا ہونی چاہئیں۔

تحریک صرف انہیں لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ حصولِ تعلیم کے دوران میں طلباء کا واحد مقصد اور مشغلہ اپنے علم اور معلومات میں اضافہ کرنا ہونا چاہیے۔ کسی ملک کی تمام تر تعلیم کو اس ملک کی خوشحالی اور ترقی کے فروغ میں معاون ثابت ہونا چاہیے۔

طلباء کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ بلند کردار اور منکسر المزاج ہوں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کردار کی آزمائش کے موقع پر وہ عظیم ترین اخلاق کے مالک ثابت ہوں اور جب خاکساری کی پرکھ کا موقع آئے تو وہ انتہائی منکسر المزاجی کا ثبوت دیں۔

# گاندھی نمبر کے قلم کار

**ڈاکٹر ظ۔ انصاری** مشہور و ممتاز ادیب۔ پُر زور و پُر شور مقرر۔ بمبئی یونیورسٹی میں رُوسی زبان کے پروفیسر ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں تحقیق و جستجو اور فکر کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اِس نمبر میں شامل شدہ اُن کا مضمون بحث و نظر کا مرکز بنے۔

**ڈاکٹر شروت کمار جین** بیر جگہ کالج (بہار) میں معاشیات کے پروفیسر ہیں۔ اُردو میں کم لکھتے ہیں مگر خوب لکھتے ہیں۔ اُردو سے گہرا لگاؤ ہے۔

**ڈاکٹر گیان چند** اُردو زبان کے مشہور محقق ادیب ہیں۔ اِدھر غالبؔ پر کافی کام کیا ہے۔ جموّں یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو ہیں۔

**مبارز الدین رفعت** متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُردو کے مشہور ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ فارسی زبان سے گہرا شغف ہے۔ گورنمنٹ کالج بنگلور میں اُردو کے ریڈر رہے ہیں۔

**خواجہ عبدالغفور** (آئی۔ اے۔ ایس) بمبئی میں ایڈیشنل سیلز ٹیکس کمشنر ہیں۔ یہاں کی علمی، ادبی، شعری اور سماجی زندگی میں خواجہ صاحب کا خاص حصّہ ہے۔ "قہقہہ زار" کے نام سے اُن کی لطائف پر کتاب شائع ہو کر مقبول ہوئی ہے۔

**ڈاکٹر عبدالستار دلوی** پہلے بمبئی یونیورسٹی کے تحت محمد حسین آزاد پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا۔ پھر دوبارہ اسی یونیورسٹی سے لسانیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ کچھ دن لندن یونیورسٹی میں بھی لسانیات کی تربیت حاصل کی۔ آپ کی ایک تصنیف "من سمجھاون" شائع ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی میں سینئر ریسرچ آفیسر ہیں۔ حال ہی میں "ہندوستانی زبان" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا ہے۔

**یونس اگاسکر** اُردو اور سماجیات میں ایم۔ اے کیا ہے۔ بہت اچھا علمی و تحقیقی ذوق رکھتے ہیں۔ مراٹھی زبان اور اس کے ادب و شعر سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ رئیس ہائی اسکول بھیونڈی (تھانہ) میں استاد ہیں۔

**ڈاکٹر نورالسعید اختر** "تاج الحقائق" پر تحقیقی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ "ہندوستانی پرچار سبھا بمبئی" میں ملازم ہیں۔ اِدھر اُن کے کئی علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

**حامد اللہ ندوی** بمبئی یونیورسٹی سے لسانیات میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ فارسی عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ تاریخ سے خاص دلچسپی ہے۔ علم و ادب اور تحقیق کا گہرا شعور ہے۔ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی میں رفیقِ ادارہ ہیں۔

**گوری شنکر گپت** — — — — — — — — — — — — — — — —

**خوش سرحدی** پنڈت گووند داس خوش سرحدی نہایت پختہ مشق شاعر، صاحبِ نظر ادیب اور ایک سرگرم سیاسی و سماجی کارکن ہیں۔ کئی زبانوں سے واقف ہیں۔ فرید آباد (ہریانہ) میں مستقل قیام ہے۔

**محمد ایوب واقف** دارالمصنفین اعظم گڑھ سے قربت رکھتے ہیں۔ اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ سے شغف ہے۔ اسماعیل یوسف کالج بمبئی میں پنڈت سُدرشن پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ مرتب کر رہے ہیں۔

**یوسف ناظم** اُردو کے مشہور طنز و مزاح نگار۔ مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا بھی عنقریب جنم لیے گا۔

ہے۔ سوچنے اور لکھنے کا ڈھنگ دوسرے مزاح نگاروں سے بالکل الگ ہے۔ اچھے شاعر بھی ہیں۔ بمبئی میں اسسٹنٹ لیبر کمشنر ہیں۔

**نوشیر پیسر ساد** مراٹھی ادب کو اردو میں ڈھالنے کی بھرپور اوّلین کوششوں کا سہرا ان کے سر ہے۔ طبعزاد افسانے بھی لکھے ہیں افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ فارسی زبان میں ایم اے کر چکے ہیں۔ اسٹیٹ بینک بمبئی میں ملازم ہیں۔

**آرنلڈ جوزف ٹوئن بی** بین الاقوامی شہرت کے عالم اور مورخ۔

**نادرہ یوسف دہلوی** فارسی اور اردو کی ذہین طالبہ ہیں۔ ایم اے کر رہی ہیں۔ فارسی میں غالب پر مضمون نویسی کے آل انڈیا مقابلہ میں دوسرا انعام حاصل کر چکی ہیں۔

**آغا رشید مرزا** اردو کے دیرمشق ادیب ہیں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں رنگوں میں خوب لکھتے ہیں مگر کم لکھتے ہیں۔ مدتوں سے کلکتہ میں قیام ہے۔ دہلی کے شرفا اور ڈپٹی نذیر احمد کے اقربا میں سے ہیں۔

**پروفیسر مسز میمونہ دلوی** ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی بیگم ہیں۔ اسمٰعیل یوسف کالج میں پروفیسر ہیں۔ علمی، فنی اور ادبی سنجیدہ مضامین لکھتی ہیں

**اوم پرکاش منتری** — — — — — — — — — — — — — — —

**ل۔م۔ شاھد** مختلف زبانوں کے افسانوں اور مضامین کے تراجم کرتے رہتے ہیں۔ جمشید پور میں قیام ہے۔ ایک ہفت روزہ اخبار "بزم" بھی جاری کیا ہے۔

**مس زھرا اکڈالکو** اردو میں ایم اے کر چکی ہیں۔ سدنہم کالج آف کامرس بمبئی میں اردو کی لکچرر ہیں۔ "دلی کی زبان" پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔

**مناظر عاشق ہرگانوی** اردو کے جانے پہچانے قلم کار ہیں۔ بہت کافی لکھتے رہتے ہیں۔ ترجمے بھی بہت اچھے کرتے ہیں۔

**وارثی بریلوی** نوجوان لکھنے والے ہیں۔ ایم اے کیا ہے۔ بریلی میں تعلیمی شغل ہے۔

**اسرار اکبرابادی** ایک اچھے نوجوان شاعر ہیں۔ بی اے بی ایڈ ہیں۔ آگرہ کے ایک ہائی اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ نثر بہت کم لکھتے ہیں۔

**محمد کمال الدین** نئے نوجوان لکھنے والے ہیں۔ ایم اے ہیں اور یو جی سی ریسرچ فیلو شعبۂ اردو (دہلی یونیورسٹی) ہیں۔

**علی جواد زیدی** اردو کے کہنہ مشق اور مشہور ادیب و شاعر۔ اسسٹنٹ پرنسپل انفارمیشن گورنمنٹ آف انڈیا ہیں۔ دہلی میں قیام ہے۔ علمی، ادبی اور تحقیقی موضوعات پر ان کے مضامین وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف۔

**ساغر نظامی** صفِ اوّل کے مشہور و ممتاز شاعر، قومی شاعری میں جن کا خاص درجہ ہے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں چیف اردو پروڈیوسر ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف۔ بادۂ مشرق، انارکلی اور نہرونامہ خصوصی تصانیف ہیں۔

**رفعت سروش** مشہور شاعر۔ دہلی ریڈیو میں اردو کے پروڈیوسر۔ نظموں اور غزلوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

**شمیم کرھانی** اردو کے صفِ اوّل کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ نظم و غزل کا خاص رنگ و آہنگ ہے۔ دلی کالج میں استاد ہیں۔

**سلام مچھلی شہری** رومان اور انقلاب کے ملے جلے پختہ مشق اور مشہور و مقبول شاعر۔ اردو شاعری کو تجربات سے مالامال کیا۔ دلی ریڈیو میں اردو پروڈیوسر ہیں۔

**محمود سعیدی** خوش فکر نوجوان شاعر ہیں۔ نظم و غزل دونوں میں حسنِ بیان اور فن کا خیال رکھتے ہیں۔ ماہ نامہ "تحریک" دہلی کے ادارے میں شامل ہیں۔

**حرمت الاکرام** اردو کے مشہور پختہ مشق شاعر۔ فن پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ صحافتی تجربہ بھی ہے۔ نظم و غزل کے علاوہ نثر بھی لکھتے ہیں۔ مرزاپور میں قیام ہے۔

**نشاط اٹاوی** اسلامیہ کالج اٹاوہ میں پروفیسر ہیں۔ بہت اچھے دیرمشق شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر عبور ہے۔

**ضیا فتح آبادی** اُردو کے مشاق اور مشہور شاعر۔ اپنی نظموں اور غزلوں اور رباعیوں سے ہر دور کو متاثر کیا ہے۔ ریزرو بینک دہلی میں افسر ہیں۔ کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

**کرشن موہن** خوبصورت شعری مجموعوں اور تجربوں کے مشہور شاعر ہر رنگ کی شراب اپنے شعری پیمانوں میں رکھتے ہیں۔ دہلی میں انکم ٹیکس کے بڑے افسر ہیں۔

**ریاض پٹیالوی** بہت اچھے شاعر بہت اچھے انسان۔ پنجاب میں ادبی و شعری تحریکوں اور اُردو زبان کے لئے بہت کام کر رہے ہیں۔

**صغیر احمد صوفی** مشہور شاعر ہیں۔ حال ہی میں انکا شعری مجموعہ "گرمئ اندیشہ" شائع ہوا ہے۔ ریلوے میں اچھی پوسٹ پر ہیں۔ دہلی میں قیام ہے۔

**مہدی پرتاپگڈھی** نوجوان شاعر ہیں۔ اچھا کہتے ہیں۔ پرتاپگڈھ میں قیام ہے۔

**یعقوب راہی** نئی نسل کے ذہین شاعر ہیں۔ بی ایڈ کے بعد اُردو میں ایم اے کیا۔ محمدیہ ہائی اسکول بمبئی میں اُستاد ہیں۔

**حفیظ بنارسی** ایم اے ہیں۔ پختہ مشق شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ حال ہی میں

**منجو قمر** فطری ذوقِ شعری رکھتے ہیں۔ اسٹیج ڈرامے سے خاص لگاؤ ہے۔ متعدد ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر اور مرزا غالب دو ڈرامے شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ آجکل "عکسانے" لکھ رہے ہیں۔ حیدرآباد میں قیام ہے۔

**عبدالرب صدا** سیونی (چھندواڑہ) کے رہنے والے ہیں۔ کافی اچھا شعر کہتے ہیں۔ رسائل میں اکثر کلام چھپتا رہتا ہے۔

**حبیب الرحمان راہی** بالاگھاٹ (مدھیہ پردیش) کے رہنے والے ہیں۔ سنبھلی ہوئی شاعری کرتے ہیں۔ ان دنوں مظفرپور میں ٹیچر ہیں۔

**وقار خلیل** حیدرآباد کے نوجوان شاعر۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے رکن۔ ماہنامہ سب رس کے ادارے سے بھی تعلق ہے۔

**اختر بستوی** نوجوان قلم کار ہیں۔ نظم و نثر دونوں لکھتے ہیں۔ ایم اے ہیں اور "بستی" کے ایک کالج میں اُستاد۔

**رونق دکنی ہیابی** پختہ گو اور ایک خاص فکری رنگ کے شاعر ہیں۔ شاعری کے علاوہ طنز اور افسانے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ترجمہ بھی خوب کرتے ہیں۔ جمشید پور میں قیام ہے۔

**اظہر افسر** اُردو کے مشہور ڈرامہ نگار۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد میں ملازم ہیں۔ بیشمار ریڈیائی اور ایک بابی کھیل لکھ چکے ہیں۔

**ابراہیم یوسف** اُردو ڈرامہ نگاری میں انکا خاص حصّہ ہے۔ مدتِ مدید سے صرف ڈرامے ہی لکھ رہے ہیں۔ گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول بیگم گنج کے پرنسپل ہیں۔

**ڈاکٹر ایچ این کنزرو** لسانی کمشنر اور حکومت کے مختلف کمیشنوں میں رہ چکے ہیں۔ انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کے صدر ہیں۔

**ڈاکٹر جاجانی بھٹاچاریہ:** ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

**آر آر دواکر** ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

**ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی** داستان امیر حمزہ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اُردو کے مشاق ادیب و صحافی [illegible] پروفیسر ہیں۔

**آصف فیضی** اسلامی تاریخ اور قانون پر دنیا کی مانی ہوئی شخصیت ہیں۔ انکی کتابیں کئی مغربی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔

**خواجہ غلام السیدین** مشہور دانشور ادیب اور ماہرِ تعلیم ہیں۔ کشمیر گورنمنٹ کے ڈائرکٹر تعلیمات۔ حکومت بمبئی اور ہند کے تعلیمی [illegible]

**گوپی ناتھ امن لکھنوی** اُردو کے بزرگ ادیب و شاعر ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر مختلف اداروں سے منسلک رہ کر [illegible]

**معین انصاری** عرصہ دراز تک جامعہ ملیہ دہلی سے منسلک رہے۔ ٹیچرس ٹریننگ کالج کے پرنسپل اور [illegible]

پرنٹر پبلشر [illegible] اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ پریس ۲۳ نوروزجی اسٹریٹ [illegible] سے چھپوا کر [illegible] شائع کیا۔


Vasmol plays up
YOUR PERSONALITY
By restoring grey hair to your natural glossy black - VASMOL makes you look young, feel young and more attractive. A genuine hair darkener (not a dye) a hair tonic and a perfect hair dressing, VASMOL is complete hair hygiene in one formula. Yet VASMOL costs no more than a good hair oil
Available in Emulsified oil and Pomade form in pilferproof bottles. At all Chemists and Stores
Vasmol
The HAIR DARKENER that keeps its promise

Whatever difficulties we encounter whatever apparent reverses we sustain we may not give up the quest for Truth which alone is, being God Himself.

*Mahatma Gandhi.*